اسلامی ہند

نیاز فتحپوری

تمہید

تہذیب ہند کی قدامت

اگر تہذیب و مدنیت کی دنیا میں، افریقہ اپنے دریائے نیل کی وادیوں پر، اور مشرقِ ادنیٰ دجلہ و فرات سے سیراب ہونے والی زمین پر فخر کرنے کا اہل ہے، تو مشرقِ بعید بھی، مصر و بابل کے دوش بدوش، ہندوستان کے اُن میدانوں اور کوہستانوں کو پیش کر سکتا ہے، جہاں آریہ قوم، عہد قدیم کے اُس دور میں، جب یونان و روما کی تہذیب، مستقبلِ بعید کی تاریکی میں معدوم تھی، جب طرائی اور مستا کی بنیاد کو بھی زمین نے قبول نہ کیا تھا، جب داؤد کے نغموں سے دنیا ناآشنا تھی، جب ہومر کے گیتوں سے زمانہ آگاہ نہ تھا، جب کہ مسیح کے پیدا ہونے کو پورے چار ہزار برس باقی تھے، جبکہ ابراہیم خلیل اللہ کسی بتکدہ کو توڑ کر دینِ حنیف کی بنیاد ڈالنے کے لئے دنیا میں نہ آئے تھے، ہاں اُس نہایت قدیم عہد میں بھی، اگر آریہ قوم کے مرد ایک طرف لوائے فتح و نصرت بلند کئے ہوئے رہتے تھے تو دوسری طرف ان کی عورتیں اپنے بچوں کو وہ لوریاں سنایا کرتی تھیں، جو بعد کو روما و یونان کے عہد زریں میں اُن کے علم الاصنام کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئیں۔

تاریخ ہند کے ساتھ اہلِ مغرب کا سلوک

پھر ظاہر ہے کہ جو ملک اپنی تاریخی حیثیت سے اس قدر قدیم ہو گا جس کی آبادی اپنی تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اس درجہ بیش رو ہوگی، اس کی تاریخ کا سراغ آج جبکہ تقریباً چھ ہزار برس کا زمانہ گزر گیا ہے، کیا کچھ دلچسپ نہ ہو گا اور اُس کی داستان اپنے اندر کیا کیا عجائب و غرائب نہ رکھتی ہوگی۔ لیکن دنیا کا کیسا افسوسناک واقعہ ہے کہ مغرب جسے عہدِ حاضر میں اپنی ترقی علم و حکمت پر ہزاروں ناز ہیں اور جو اپنی تحقیق و تنقید کے زعم پر ہر غیر معلوم سے کو احاطۂ علم میں لے آنے کا مدعی ہے اس وقت تک ہندوستان کو اس سے زیادہ نہ سمجھ سکا کہ وہ "ایک معمہ ہے ناقابلِ فہم" اور "ایک راز ہے سربستہ"

حقیقت یہ ہے کہ ــــ مسائل شرقیہ میں مغرب کی تحقیق جستجو ہے، مادہ کی روحانیت کی دُنیا میں، اور اسلیئے اس دورِ مادہ پرستی میں یورپ شاید وہ نگاہِ حقیقت شناس جس سے دنیا کے صحیح اخلاق دیکھے جا سکتے ہیں، پیدا نہیں کرسکتا۔ مغرب کے نزدیک نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرق جہل و تاریکی کی دنیا ہے، اور اُسے یہاں سوائے اعجوبہ پرستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا

یورپ کے اکثر نفوس نے، اپنے ملک کے معمولی ناول نویس اور فسانہ نگار حضرات کی وساطت سے جو حالت و صورت مشرق اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی اپنے ذہن میں مرتسم کی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک خونخوار ہستی جس کا دل جذبات سفاکی و بیرحمی سے لبریز ہے، سریر آرائے سلطنت ہے چاروں طرف تملق و خوشامد کرنے والے اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، رعایا کو تباہ کر کرکے خزانہ بھر اجا رہا ہے، لہو و لعب، سیر و تفریح، یا حرم کی اندرونی زندگی پر بے دریغ دولت صرف کی جا رہی ہے، درباریوں نے اپنی زمیں بوسی اور جبہ سائیوں سے اس کے آستانہ کو بارگاہ خداوندی سے ملا دیا ہے، اور وہ اگر کبھی شراب کے نشہ سے چونک پڑتا ہے تو سوائے جور و ظلم کے اُس سے اور کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی، نہ اس کے پاس دماغ ہے نہ دل، نہ وہ سوچ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے روحانیت سے اسے سروکار نہیں، ارتقار ذہنی سے اُسے واسطہ نہیں، نہ اُسے علوم و فنون کی ترقی کی طرف توجہ ہے نہ ملک کی فلاح و بہبودی کا خیال۔ الغرض وہ جہل و غرور، بیدردی و بیرحمی، خونخواری و سفاکی کا ایسا زبردست مجسمہ ہے، جسکی نظیر دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا وہ شخص جس نے مشرق کی تاریخ کا غائر مطالعہ کیا ہے اس خاکہ میں کسی جگہ اصلی خط و خال کی جھلک پا سکتا ہے؟ اور کیا یورپ کا عدم علم یا اس کا تعصب ایک حقیقت اور صداقت کو نیست و نابود کر دے سکتا ہے؟

تاریخ ہندوستان کے تین دور

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ بہ لحاظِ تاریخ اس وقت تک ہندوستان پر تین دور گزر چکے ہیں۔ پہلا دور وہ جس میں دو قومیں بحیثیت قوم ہونے کے باہم متصادم ہوئیں۔ دوسرا دور وہ جب دو مذہب ایک دوسرے سے ٹکرائے اور تیسرا دور وہ جب ہندوستان نے قومیت و مذہب کے مسئلہ کو بالائے طاق رکھ کر ایک اجنبی قوم کی تجارتی و اقتصادی اغراض پورے کرنے کے لئے تمام ذرایع پیش کر دئے اور اپنی بہترین نعمتیں اپنے اوپر حرام کر لیں اور یقیناً ان تینوں زمانوں کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

دورِ اول، جب آریہ قوم نے ہندوستان کی قدیم آبادی کو مفتوح کیا اور دورِ ثالث، جب سے مغرب نے اپنا اقتدار قایم کرنا شروع کیا، ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ دورِ ثانی، جب مسلمانوں نے یہاں آکر سلسلۂ فتوحات قایم کیا اس تالیف کا موضوع صحیح ہے اور اسی عہد کی تاریخ میں پیش کر رہا ہوں۔

ترتیب کی موجودہ صورت ممکن تھا کہ میں ۱۵ھ سے (جب خلیفۂ ثانی کے عہد میں حکم بن العاص نے اول مرتبہ ساحلِ ہند پر قبضہ کرکے تانہ (تھانہ[1]) کو فتح کیا) یا ۹۲ھ سے (جب محمد ابن قاسم نے اولین مرتبہ سندھ پر حملہ کرکے ہندوستان میں حکومت اسلام کی بنیاد قائم کی) اس تالیف کو شروع کرکے زوالِ سلطنت تیموریہ تک فتوحات اسلامی و دیگر واقعاتِ تاریخی کو یکجا کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاتا، لیکن میرے نزدیک اس نوع کی ترتیب سے اصل مقصود حاصل نہ ہوسکتا اور میں اُس حصۂ تاریخ کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں نہ کرسکتا، جس کا نمایاں کرنا مقصود ہے۔ اس لئے میں نے جو صورتِ ترتیب رکھی ہے وہ اس سے مختلف ہے جس کے حسن و قبح کا آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں کا حملہ اور فضاءِ ہند میں اک نیا انقلاب یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ نے نہ صرف یہاں کی معاشرتی و سیاسی فضاء کو بدلدیا، بلکہ ذوقِ علم و تہذیب میں بھی ایسا زبردست انقلاب پیدا کردیا کہ آج تک اس کے نشانات سرزمینِ ہند پر ہر جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان کی اس زمین نے، جہاں وید کے بھجنوں اور مواعظِ بودھ کے سوا اور کوئی اخلاقی یا مذہبی آواز پیدا نہ ہوئی تھی، مسلمانوں کے حملہ کے ساتھ ایک تیسری آواز کو بھی اپنی فضا میں جگہ دی اور یہ آواز اُس کلمۂ توحید کی تھی جو اس سے قبل نہ صرف ریگ زارِ عرب بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی فلسفیانہ صداقت تسلیم کراچکا تھا

مسلمان فرمانرواؤں کا طرزِ حکومت ہم نہیں کہتے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اسلام کی تعلیمات سے سرمو انحراف نہیں کیا، ہم اس کے بھی قائل نہیں کہ یہاں کا ہر مسلمان فرمانروا اپنے عہد کا جنید و شبلی تھا، اور اس نے کبھی کوئی ظلم و ستم نہیں کیا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ جو کچھ مسلمان فرمانرواؤں نے ہند اور اہلِ ہند کے ساتھ کیا، جس حد تک انھوں نے ہندوستان کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیا اور جسقدر اسباب ترقی باشندگانِ ہند کے لئے انھوں نے فراہم کئے، وہ اگر مسلمانوں کی طرف سے بصورتِ افتخار پیش نہیں کئے جاسکتے تو دوسری حکمران قوموں کے لئے کم از کم قابلِ تقلید ضرور ہیں

تسلط سے قبل مسلمانوں کی سختی ضروری تھی یقیناً جب ہمالیہ کی طرف سے مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے تو ہندوستان کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا اور اہلِ ہند کے جذبات کو بھی شدید صدمہ پہونچا۔ ان کے قدیم مدارس و معابد تباہ ہوئے، ان کے اسلاف کی بہت سی یادگار چیزیں فنا ہوئیں، ان کے امن و سکون میں اک ہیبت ناک زلزلہ پڑگیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اُس وقت تک مسلمانوں کی

[1] مضافات بمبئی کا مشہور مقام

مستقل حکومت ہندوستان میں قائم نہ ہوئی تھی اور وہ زمانہ جو حملہ اور قیام سلطنت کے درمیان بسر ہوتا ہے، ہمیشہ اسی نوع کی تکالیف و مصائب کا ہوا کرتا ہے۔

مسلمان ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اہلِ ہند مقابلہ کر رہے تھے۔ مسلمان جو ہندوں کے مذہب سے بالکل مختلف مذہب رکھتے تھے بالکل جدید خیالات و اعتقادات کو روشناس کرنا چاہتے تھے اور ہندو ان سے سخت متنفر تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ دو مختلف عناصر کے تصادم میں ہمیشہ شور و ہنگامہ ہی ہوا کرتا ہے اور اس کا علاج مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا۔ اگر کبھی ہندو بھارت ماتا کی آغوش چھوڑ کر باہر نکلتے، اگر ان کا فاتحانہ عزم انھیں بھی دیگر ممالک کی طرف لے جاتا تو غالبًا وہ بھی وہی کرتے جو اول اول مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوا۔

مرہٹے سرزمین مہاراشٹر سے خروج کر کے صرف دکن تک پہونچتے ہیں اور وہ سب کچھ کر دکھاتے ہیں جو دنیا میں ایک ظالم ترین قوم کی طرف سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ لیکن محمود کی بُت شکنی آج یورپ کی بدولت ہر بچہ کی زبان پر ہے اور مسلمان عورتوں کی وہ آبرو ریزیاں جن کی یاد تقریبًا دکن کی ہر مقدس مسجد کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے کسی کو نہیں معلوم

قیامِ سلطنت کے بعد مسلمانوں کی رواداری

وہ شخص جس نے تاریخِ ہند کا مطالعہ کیا ہے سمجھ سکتا ہے کہ جب ڈیڑھ دو صدی کے بعد مسلمانوں کا تسلط اچھی طرح قایم ہو گیا، جب حقیقی معنی میں اسلامی سلطنۃ کی بنیاد ہندوستان میں مستحکم ہو گئی تو پھر وہی امن و سکون عود کر آیا جو کبھی پایا جاتا تھا اور ہندوں کو تمام وہ مراعات دی گئیں جو ایک غیر متعصب اور انسان فرمانروا کی طرف سے روا رکھی جاتی ہیں۔ انکے معابد محفوظ رکھے گئے۔ ان کی جاگیریں بحال کی گئیں، اِن کے مدارس کو سرکاری امداد دی گئی، نظام حکومت میں انھیں نمایاں حصہ دیا گیا، ان کے جذبات مذہبی کا خاص لحاظ رکھا گیا اور میدانِ ترقی میں فاتح و مفتوح، حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں پیدا کیا گیا۔ پھر کیا عہد حاضر کی مہذب سے مہذب قوم، شایستہ سے شایستہ حکومت اپنی تاریخ کا کوئی واقعہ ایسا پیش کر سکتی ہے جس میں غیر اقوام کے ساتھ وہی رواداری جائز رکھی گئی ہو جو بعض مسلمان فرمانرواؤں کی طرف سے ہندوستان میں ظاہر ہوئی؟ سیاست حاضرہ کے جاننے والے اور موجودہ انقلابات کے فلسفۂ تاریخ کو سمجھنے والے اس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں، اور شاید وہ وقت بھی دور نہیں جب ایک عالم اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔

مقدمہ

ہندوستان پر حملہ کی ابتدار

قبل اس کے کہ میں تفصیل کے ساتھ بحث کروں اجمالاً یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں کس وقت سے مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی اور کیونکر یکے بعد دیگرے ایک خاندان مٹ کر سلطنت دوسرے خاندان میں منتقل ہوئی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان کا کوئی قابل ذکر حصہ براہ راست خلافۂ عرب سے متعلق نہیں رہا۔ ہرآت فتح ہونے کے بعد ہی اہل عرب کابل کی طرف بڑھے (۴۴ھ ، ۶۶۴ء) اور وہاں سے ملتان تک آ گئے، لیکن اس فوج کشی کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی کوئی مستقل سلطنت یہاں قایم ہو جاتی۔

محمد قاسم سندھ میں

آغاز عہد اسلام میں بحری تاخت دریائے سندھ (Sindh) کے دہانہ پر کئی بار ہوئی یہاں تک کہ ۹۲ھ ، ۷۱۱ء میں محمد قاسم (حجاج ابن یوسف گورنر بصرہ کے بھتیجے) نے سندھ کو ساحلِ بحرِ ہند سے لے کر ملتان تک فتح کیا اور ہر چند اس حصۂ ملک کو زیادہ وسیع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تاہم اس صوبہ پر عرب گورنروں کی حکومت دو صدی تک قایم رہی لیکن ہندوستان کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے فتح ہونا حقیقتاً سندھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ فخر صرف افغانستان کو حاصل ہے۔

فتح ہندوستان عربوں کا کارنامہ نہیں

کوہ ہندوکش کے جنوب میں جو سنگستانی علاقہ ہے، اس پر جب اول اول مسلمانوں نے قبضہ کیا ہے تو وہ قبضہ عارضی تھا۔ البتہ سب سے پہلے یعقوب بن لیث صفاری (سجستان) نے کابل میں اسلامی سلطنت مستقل طور سے قایم کی۔ اس کے بعد جب یعقوب صفاری کا خاندان ختم ہوا، تو پھر سامانی گورنروں نے اس ملک پر قبضہ حاصل کر لیا اور اس طرح سب سے

پہلے الپتگین نے جو آلِ سامان کا گورنر تھا غزنی میں ایک مستقل اسلامی حکومت قائم کی

حکومت غزنی کا قیام

اس کے بعد غزنی دو صدی تک اُس خاندان کا دار السلطنۃ قایم رہا جسے غزنوی خاندان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی خاندان کے بعض حکمراں افراد نے لاہور میں مستقل قیام کیا اور حقیقی معنی میں یہی ابتدا ہے اسلامی حکومت ہند کی۔

پنجاب میں قیام سلطنت

اس کے بعد خاندانِ غور نے حکومت کی اور پھر غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی وغیرہ کا زمانہ آیا یہاں تک کہ مغل بابر نے حملہ کیا اور ہندوستان میں جو طوائف الملوکی پھیل رہی تھی وہ مٹ گئی اور مختلف چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں سلطنتِ مغلیہ میں شامل ہو گئیں۔

ان ترکی غلاموں میں[1] سے جنھیں سامانی فرمانرواؤں نے اپنے ملک میں گورنری کے عہدوں پر ممتاز کیا تھا، ایک شخص الپتگین بھی تھا۔ عبد الملک اس سے بہت مانوس تھا اور اس کی بڑی عزت کرتا تھا، یہاں تک کہ یہ رفتہ رفتہ افواجِ خراسان کا سر عسکر بنا دیا گیا۔ لیکن جب عبد الملک کا انتقال ہوا تو یہ اس عہدے سے معزول کر دیا گیا اور الپتگین برہم ہو کر ۳۵۱ھ ۹۶۲ء میں غزنی چلا آیا جو کوہِ سلیمان کے قلب میں واقع تھا، اور جہاں الپتگین کا باپ

فہرست[1] فرمانروایان خاندان غزنوی

نمبر شمار	نام سلاطین	سن ہجری وعیسوی	نمبر شمار	نام سلاطین	سن ہجری وعیسوی
۱	الپتگین	۳۵۱ھ / ۹۶۲ء	۱۰	مودود شہاب الدولہ	۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء
۲	اسحاق	۳۵۲ھ / ۹۶۳ء	۱۱	مسعود ثانی	۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء
۳	بلکاتگین	۳۵۵ھ / ۹۶۶ء	۱۲	علی ابوالحسن بہاء الدولہ	۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء
۴	پیری	۳۶۲ھ / ۹۷۲ء	۱۳	عبدالرشید عز الدولہ	۴۴۰ھ / ۱۰۴۹ء
۵	سبکتگین	۳۶۶ھ / ۹۷۶ء	۱۴	طغرل (غاصب)	۴۴۴ھ / ۱۰۵۲ء
۶	اسماعیل	۳۸۷ھ / ۹۹۷ء	۱۵	فرخ زاد جمال الدولہ	۴۴۴ھ / ۱۰۵۲ء
۷	محمود یمین الدولہ	۳۸۸ھ / ۹۹۸ء	۱۶	ابراہیم ظہیر الدولہ	۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء
۸	محمد جلال الدولہ	۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء	۱۷	مسعود ثالث علاء الدولہ	۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء
۹	مسعود اول ناصر دین اللہ	۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء	۱۸	شیرزاد کمال الدولہ	۵۰۸ھ / ۱۱۱۴ء

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸ پر ملاحظہ ہو)

اس سے قبل گورنر رہ چکا تھا۔ الپ تگین یہاں ایک سال تک سامانی حکومت کی برہمی کا مقابلہ کرتا رہا لیکن اپنی حدودِ حکومت کو وسیع نہ کر سکا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسحٰق اور اس کا غلام بلکاتگین بھی کوئی زیادہ قوۃ حاصل نہ کر سکا یہاں تک کہ الپتگین کے ایک اور غلام سبکتگین نے جو الپ تگین کا داماد بھی تھا زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸)

نمبر شمار	نام سلاطین	سن ہجری و عیسوی	نمبر شمار	نام سلاطین	سن ہجری و عیسوی
۱۹	ارسلان، سلطان الدولہ	۵۰۹ھ / ۱۱۱۵ء	۲۱	خسرو شاہ معز الدولہ	۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء
۲۰	بہرام شاہ یمین الدولہ	۵۱۲ھ / ۱۱۱۸ء	۲۲	خسرو ملک تاج الدولہ	۵۵۵ھ - ۵۸۲ھ / ۱۱۶۰ء - ۱۱۸۶ء

شجرۂ نسب فرمانروایانِ غزنی

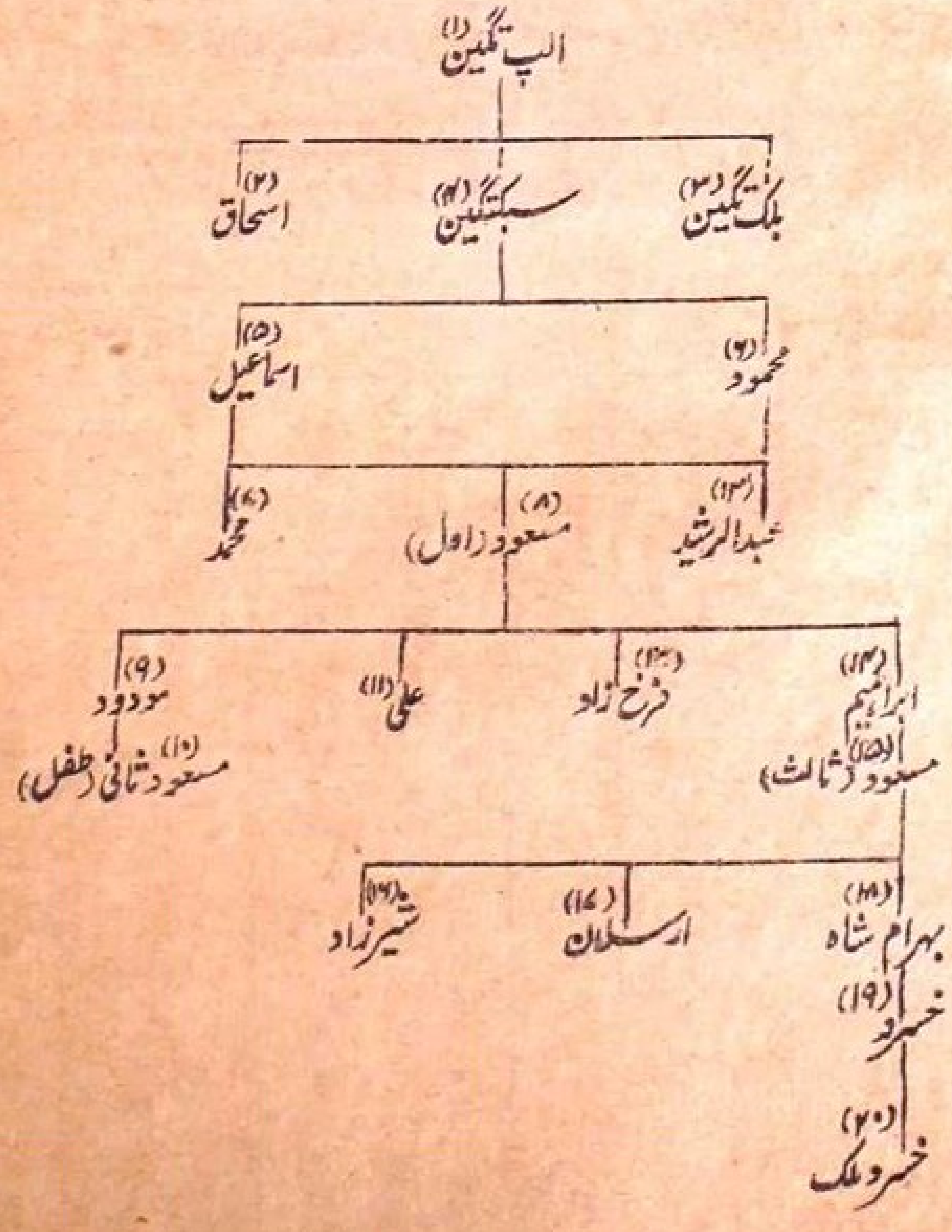

سبکتگین کا حملہ ہندوستان کی طرف

اس نے سب سے پہلے غزنوی خاندان کی حکومت کو وسیع و مستحکم بنایا اور پھر نہ صرف ہندوستان میں راجپوتوں کو شکست دے کر پشاور میں حکومت قائم کی بلکہ خراسان کو بھی مسخر کر لیا۔

ہر چند خراسان پر خود مختارانہ قبضہ کر لینے کے بعد بھی یہ از راہ اطاعت و وفا شعاری ہمیشہ اپنے کو سامانی حکومت ہی کا ماتحت کہتا تھا، لیکن یہ ماتحتی بالکل برائے نام تھی اور اس کی سلطنت خود سامانی حکومت سے زیادہ قوی ہو گئی تھی۔ ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمود غزنوی کی حکومت

سبکتگین کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے اسمٰعیل نے اپنی حکومت قائم کرنا چاہی لیکن محمود غزنوی نے جو تاریخ اسلام کی نہایت مشہور ہستی ہے اپنے چھوٹے بھائی اسماعیل کو شکست دی اور سامانی حکومت کے ضعیف فرمانرواؤں کے اثر سے بالکل آزاد ہو کر خراسان اور غزنی پر حکومت کرنے کے حقوق براہ راست خلیفۂ بغداد (القادر باللہ) سے حاصل کر لئے[1]۔

یہ وقت وہ تھا جب سامانی حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا اور ایلک خاں[2] کی اولاد اس سلطنت پر قابض ہو جانا چاہتی تھی لیکن محمود نے ان کو شکست دیکر اور اس طرف سے مطمئن ہو کر ہندوستان کا عزم کیا اور ۳۹۲ھ / ۱۰۰۱ء سے

[1] عام طور سے بیان کیا جاتا ہے کہ محمود نے اس کے بعد سلطان کا لقب اختیار کر لیا، جو اس سے قبل کسی نے اختیار نہیں کیا تھا لیکن اسکا ثبوت اس کے سکوں سے نہیں ملتا کیونکہ ان میں وہ اپنے کو صرف امیر، سید، (اور بہت کم ملک) ظاہر کرتا ہے سلطان کا لفظ کسی سکہ میں نہیں ہے۔ ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب تحقیق الہند میں جہاں محمود کا ذکر کیا ہے وہاں صرف لفظ امیر لکھا ہے۔ سلطان کا لفظ کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔ غزنوی خاندان میں سب سے پہلا شخص جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا ابراہیم تھا، اس نے اس مسئلہ میں سلاجقہ کا تتبع کیا کیونکہ سب سے پہلے سلجوقیوں ہی نے اپنے آپ کو سلطان لکھا جس کا ثبوت ان کے سکوں سے ملتا ہے۔

[2] اس خاندان کے تاریخی حالات بہت کم دستیاب ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مشرقی فرغانہ میں ترکی آبادی کو چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں مغلوب کر لیا اور یہی زمانہ ان کے مسلمان ہونے کا تھا۔ پہلے ان کی حکومت کاشغر تک محدود تھی لیکن جب ۳۸۹ھ / ۹۹۹ء میں سامانی حکومت سے ماوراءالنہر لے لیا تو ایلک نصر نے باقاعدہ اپنی قوم پر حکمرانی شروع کی۔ یہ لوگ بحر جرجان یا بحر خزر (Caspian sea) کے ساحل سے لیکر حدود چین تک پھرا کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ ماوراءالنہر کے جنوب میں جو علاقہ ہے اُسے بھی سامانی حکومت سے چھین لیں۔ لیکن محمود غزنوی نے ۳۹۸ھ / ۱۰۰۸ء میں ان کو سخت شکست دی اور اس طرح ایلک خانی جماعت کی حکومت صرف ماوراءالنہر، کاشغر، اور مشرقی تاتار میں محدود ہو گئی ـــ اس خاندان کے عہد حکومت میں کئی قوموں نے ماوراءالنہر میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی جو بعد کو فارس کی طرف ہٹا دی گئیں۔ انھیں قوموں میں ایک قوم سلاجقہ کی بھی تھی، جنھوں نے دنیا میں کافی شہرت حاصل کی۔

۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء تک مسلسل سترہ حملے کئے۔

محمود کے سترہ حملے

محمود، کوہستان سے نیچے اُتر کر پہلے کشمیر اور پنجاب تک آیا اور پھر ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں متھرا اور قنوج پر حملہ کیا۔ اس کے بعد ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء میں سومناتھ اور انہلواڑہ پر، جو گجرات کا پایہ تخت تھا، قابض ہو گیا۔

ہر چند یہ حملے کسی مستقل حکومت کے قیام کی غرض سے نہ تھے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس طرح ہندوستان کا راستہ صاف ہو گیا اور پنجاب، غزنوی حکومت کا ایک جزو ہو گیا۔

محمود کی کامیابی وسطِ ایشیا میں

ہندوستان پر حملہ کرنے کے علاوہ، محمود نے ایلک خاں کو پسپا کیا اور غور کو ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں مسخر کر کے ماوراء النہر کے مشہور مقامات سمرقند و بخارا پر بھی ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں قابض ہو گیا۔

محمود کو اپنے عہدِ آخر میں، سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی قوۃ کی طرف سے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا اور ہر چند اس نے طغرل و چغر بیگ کو ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں بظاہر مغلوب بھی کر لیا، لیکن وہ ان کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ الغرض وہ اسی غیر مطمئن حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا کہ ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء کے موسم بہار میں (جب وہ اصفہان فتح کر کے واپس آیا) بمقام غزنی اس کا انتقال ہو گیا۔

عہدِ غزنوی میں علوم و فنون کی ترقی

علم و ادب، فنون و حکمت کو جس قدر ترقی اس کے عہد میں ہوئی اسے تمام مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ اس نے غزنی میں ایک دار العلوم قائم کیا اور ملک کے تمام اہل کمال اس کے دربار میں کھنچ کھنچ کر جمع ہونے لگے۔ غزنی کو جو ترقی اس کے عہد میں ہوئی وہ اس وقت کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہوئی اس نے یہاں مسجدیں، سڑکیں، پل، مکانات، محلات وغیرہ کثرت سے تعمیر کرائے اور بہت سے اُمورِ عامہ جن کا تعلق صرف رعایا کے فلاح و آسائش سے تھا انجام کو پہونچے۔

محمود غزنوی کے سلطنت کی وسعت

ہر چند محمود نے اپنی سلطنت کو لاہور سے اصفہان و سمرقند تک وسیع کر لیا تھا، لیکن اُس کے بعد یہ وسعت تنگ ہوتی گئی۔ کیونکہ اسکے چند سال بعد ہی (۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء – ۴۳۷ھ/۱۰۴۵ء) سلاجقہ نے محمود کے بیٹے مسعود کو مرو کے قریب شکست دے کر تمام مغربی صوبے بلخ اور خوارزم سے لے کر اصفہان و رَے تک فتح کر لئے۔

غوریوں کا خروج

اب چونکہ غزنوی حکومت وسطِ ایشیا سے تقریباً معدوم ہو چکی تھی، اس لئے شاہانِ غزنی نے اپنی امیدوں کو مشرق کے ساتھ وابستہ کیا اور آخر کار، رجب ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء میں غزنی کو غوریوں نے فتح کر لیا تو شاہانِ غزنی نے لاہور کو اپنا پایہ تخت قرار دیا اور کوشش کی کہ جو نقصانات مغرب میں ہوئے ہیں

اُن کی تلافی قبضۂ ہندوستان سے ہوجائے لیکن افسوس ہے کہ اُن کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی اور غوریوں نے بہت جلد آلِ سبکتگین کا استیصال کرکے خود اپنی حکومت قایم کرلی اور اس طرح تقریباً ڈھائی صدی تک سلطنت کرنے کے بعد غزنوی خاندان صفحۂ تاریخ سے محو ہوگیا۔

قدیم زمانہ سے غور کا کوہستانی علاقہ، ہرات و غزنی کے درمیان ایک مختصر سی خود مختار جماعت کے قبضہ میں چلا آرہا تھا اور فیروز کوہ کا قلعہ اس کی جائے پناہ تھا۔

محمود غزنوی کی فتوحات غورستان میں

ظاہر ہے کہ محمود غزنوی جس کے کشور کشائیاں اسقدر عام تھیں علاقۂ غور کو جو بالکل قریب تھا آزاد و خود مختار نہ دیکھ سکتا تھا، اسلئے اس نے ۴۰۱ھ ۱۰۱۰ء میں جب کہ محمد سوری اس جماعت کا سردار تھا اسکو بھی مغلوب کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اس کے بعد سے محمد بن سوری کی اولاد فرمانروایان غزنی کے ماتحت فیروز کوہ اور بامیان میں حکومت کرتی رہی اور غزنی و غور خاندانوں میں باہم ازدواجی تعلقات قایم ہوگئے۔

قطب الدین کا قتل

جب قطب الدین محمد کو اس کے خسر بہرام شاہ غزنوی نے قتل کردیا تو مقتول کے بھائی سیف الدین سوری نے جو اس وقت غور کا حکمراں تھا ۵۴۳ھ ۱۱۴۸ء میں غزنی پر قبضہ کرلیا لیکن دوسرے سال بہرام شاہ پھر غزنی میں داخل ہوا اور سیف الدین کو ایذائیں دے دے کر مار ڈالا۔ جب اس کی خبر تیسرے بھائی علاؤ الدین کو معلوم ہوئی تو اس نے پھر غزنی پر حملہ کیا اور قتل عام کرکے سارے شہر میں آگ لگادی۔ اس کے بعد علاؤ الدین نے ہرات، و بلخ، پر بھی قبضہ کرلیا، لیکن چند دن گزرے تھے کہ سلطان سنجر (خراسان کے سلجوقی بادشاہ) نے اُسے مقید کرلیا۔ ہرچند کچھ زمانہ گزرنے کے بعد سلطان سنجر نے اسے آزاد کردیا اور سلطنتِ غور اُس کے سپرد کردی[2] لیکن پھر اس کی طرف سے کوئی کارنامہ ایسا ظاہر نہیں ہوا جو تاریخی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہو

فہرست سلاطین غور

۱- قطب الدین محمد (ملک الجبال)

۲- سیف الدین سوری ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء

۳- علاء الدین حسین (جہانسوز) ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء

۴- سیف الدین محمد ۵۵۶ھ / ۱۱۶۱ء

۵- غیاث الدین ابن سام ۵۵۸ھ / ۱۱۶۳ء

۶- شہاب الدین معز الدین محمد غوری ۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء

فتح ہندوستان ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء

[1] (غیاث الدین کے بعد شہاب الدین، غور میں ۵۹۹ھ ۱۲۰۱ء سے ۶۰۲ھ ۱۲۰۶ء تک حکمراں رہا)

[2] (بعض انگریزی مورخین کا بیان ہے کہ وہ بحالت قید ۵۵۶ھ ۱۱۶۱ء میں مرگیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے)

اتراکِ غز کا قبضہ افغانستان پر

یہ وہ زمانہ تھا جب اتراکِ غز تمام افغانستان پر پھیل گئے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے غزنوی اور غوری دونوں خاندانوں کو ضعیف و باطل کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ اتراکِ غز کا سیلاب چند دن بعد ہی فارس کی طرف بڑھ گیا، اس لئے علاؤالدین غوری کے دو بھتیجے اپنے خاندان کے سردار ہو گئے جن میں بڑا غیاث الدین بن سام تھا۔

غیاث الدین کا قبضہ غزنی پر

اس نے ۵۶۹ھ (۱۱۷۳ء) میں غزنی کو لے لیا اور دو سال بعد ہرات کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر کے ۵۹۹ھ (۱۱۷۴ء) تک بظاہر اپنے خاندان کا حکمراں تسلیم کیا گیا۔ کیونکہ حقیقی حکومت تو اس کا چھوٹا بھائی شہاب الدین محمد غوری کر رہا تھا، جس نے نہ صرف سلاجقہ سے خراسان کا ایک حصہ لے لیا بلکہ ہندوستان پر بھی مسلسل حملے کر کے ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) میں سندھ اور ملتان پر قابض ہو گیا۔

شہاب الدین غوری کا حملہ ہند

اس نے ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں غزنوی خاندان کو پھر مغلوب کیا اور فرمانروائے اجمیر پرتھی راج کے مقابلہ کیلئے بڑھا۔ ہرچند اس کا پہلا حملہ ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں سخت ناکامیاب رہا لیکن دوسرے سال تھانیسر کے میدان میں اس نے راجپوتوں کو شکست دی اور پرتھی راج قتل ہوا۔ اس کے بعد قنوج، گوالیار، بندیلکھنڈ، بہار، بنگال، یکے بعد دیگرے محمد غوری کے سرداروں نے فتح کر لئے اور اس طرح اول مرتبہ ہندوستان کا بڑا حصہ باقاعدہ حکومت اسلام کے تحت میں آ گیا۔

ہندوستان میں حکومتِ اسلام کی ابتدا

جب تک اس کا بھائی غیاث الدین زندہ رہا محمد غوری نے ہمیشہ ایک وفاشعار نائب کی طرح خدمت انجام دی۔ جب اسکی موت پر ۵۹۹ھ (۱۲۰۲ء) میں وہ حکمراں ہوا تو ملک کی حالت یہ تھی کہ خوارزم والوں نے سارے فارس کو پائمال کر رکھا تھا۔ اور افغانستان کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ محمد غوری اسی انتظام میں مصروف تھا کہ گکھڑوں کی ایک جماعت نے ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں اُسے قتل کر دیا۔

محمد غوری کے بعد اس کا خاندان زیادہ عرصہ تک حکمراں نہیں رہا۔ اس کا بھتیجا محمود اگرچہ تمام مفتوحہ ملک میں عام طور پر خود مختار بادشاہ تسلیم کیا گیا لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ شیرازہ جو محمد غوری کے عہد میں قائم تھا منتشر ہو گیا اور رفتہ رفتہ ترکی غلاموں نے جو محمد غوری کی ماتحتی میں فوجی جنرل تھے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس طرح قطب الدین ایبک دہلی میں، ناصر الدین قباچہ سندھ میں اور یلدوز، غزنی میں حکمراں بن بیٹھے۔

غوری خاندان کا اصل حکمراں اسوقت اپنے پایۂ تخت فیروزکوہ میں بیٹھا ہوا صرف مغربی افغانستان (غور و ہرات) اور خراسان کے ایک حصہ پر قابض تھا، لیکن خوارزم شاہی فوجوں نے ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) میں اُسے یہاں سے بھی نکال دیا۔ اسکے بعد غوری خاندان کے چند افراد نے ہرات میں اک مختصر سی ریاست قائم کر لی اور اسی پر عرصہ تک قانع زندگی بسر کرتے رہے۔

سلاطین دہلی

قطب الدین ایبک کی حکومت

جب محمد غوری، شمالی ہند کو دہانۂ گنگ تک فتح کرچکا، تو اس نے اپنے غلام قطب الدین ایبک[1] کو دہلی کا وایسرائے مقرر کیا لیکن جب محمد غوری کا انتقال ہوا تو سنہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں قطب الدین نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور اس طرح سب سے پہلے ہندوستان کے اندر ایک مسلمان حکمران خاندان کی ابتدا ہوئی۔ اسوقت تک ہندوستان، حکومت غزنی کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا اور یہاں جداگانہ حکومت قایم نہ تھی۔

---

[1] فہرست فرمانروایان خاندان غلام

قطب الدین ایبک	سنہ ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء
آرام شاہ	سنہ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء
شمس الدین التمش	سنہ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء
رکن الدین فیروز شاہ	سنہ ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء
سلطان رضیہ	سنہ ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء
معز الدین بہرام شاہ	سنہ ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء
علاء الدین مسعود شاہ	سنہ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء
ناصر الدین محمود شاہ	سنہ ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء
غیاث الدین بلبن	سنہ ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء
معز الدین کیقباد	سنہ ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء

شجرۂ خاندان غلام

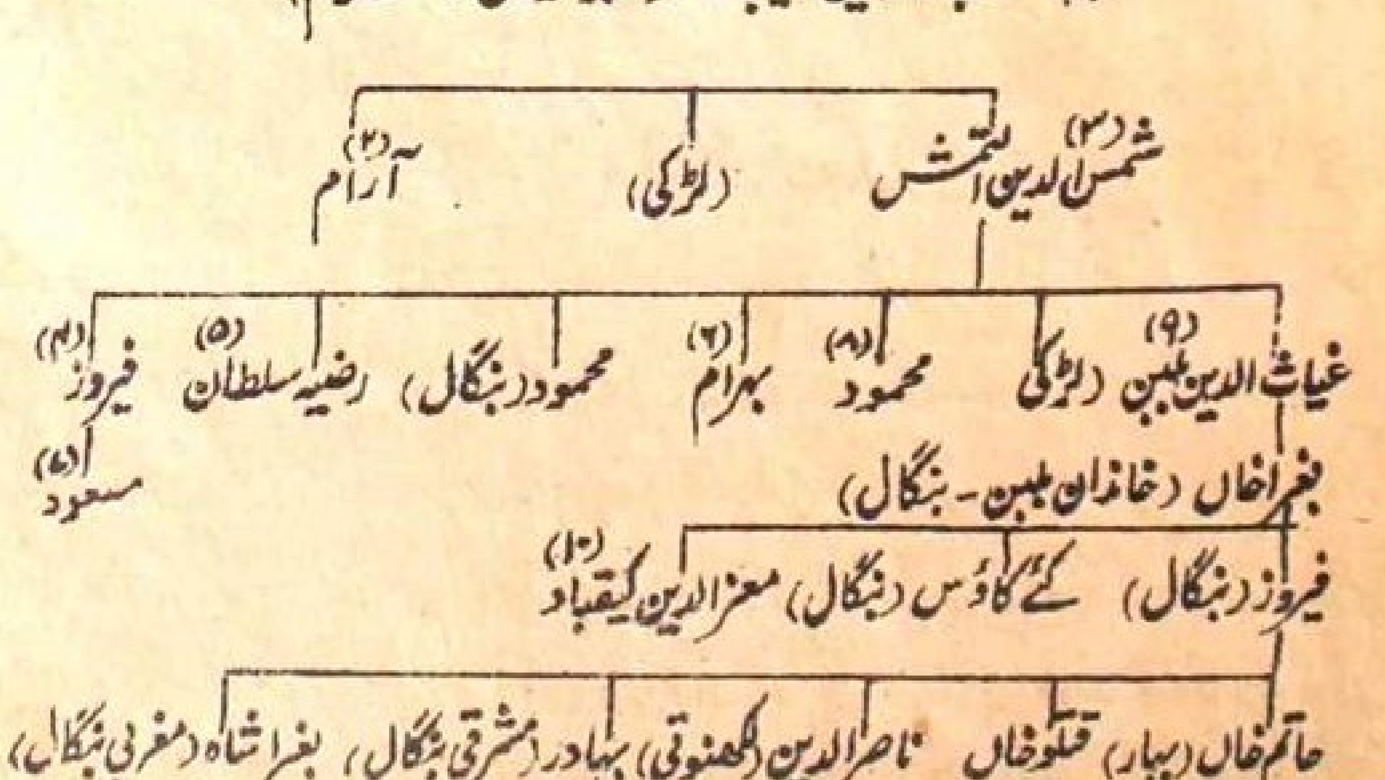

التمش کی حکومت

غلام خاندان میں التمش خاص شہرت رکھتا ہے اس نے سندھ کے گورنر ناصر الدین قباچہ کو بھی مغلوب کیا اور بنگال کے والیسرائے سے بھی سلطنت دہلی کی سیادت کو تسلیم کرایا۔ اس کے زمانہ میں یلدوز نے کوشش کی کہ اپنی حکومت کو ہندوستان تک وسیع کرے، لیکن التمش نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور کوہستان وندھیا کے شمال میں اپنی سلطنت کو نہایت کامیابی کے ساتھ قائم رکھا۔ سب سے پہلی مرتبہ التمش ہی کو خلیفۂ بغداد کی طرف سے سندِ اعزاز و خود مختاری عطا ہوئے۔

رضیہ کا عہدِ حکومت

التمش کے بعد اس کی بیٹی رضیہ تخت نشین ہوئی اور ہندوستان کی تاریخ میں یہی ایک عورت ایسی گزری ہے جو تخت دہلی پر متمکن ہوئی۔ رضیہ کے بعد جو بادشاہ اس خاندان میں ہوئے ان کا عہد شورش اور ہنگامہ کا تھا۔ کیونکہ ہندوؤں کی جو جرأت و بسالت محمد غوری اور التمش کے عہد میں نابود ہو گئی تھی اُس میں پھر آثار حیات پیدا ہوئے اور چونکہ بلبن نے غلاموں کو عہدۂ گورنری دینا ترک کر دیا تھا اس لئے بغاوتیں شروع ہو گئیں، جنھیں بلبن نے نہایت دقت سے فرو کیا۔

خلجیوں کا عہدِ حکومت

غلام خاندان کے بعد خلجی[1] ترکوں کا عہد شروع ہوا اور اُنھوں نے کوہستان وندھیا سے لے کر دکن تک سلطنت کو وسیع کر لیا۔ علاؤ الدین محمد نے ۶۹۷ھ / ۱۲۹۷ء میں گجرات کو فتح کیا اور ۷۰۲ھ / ۱۳۰۲ء میں چتور پر قبضہ کر کے راجپوتوں کو بھی مغلوب کر لیا۔ اس کا ایک سردار ملک کافور (خواجہ سرا) تھا اُس نے

فہرست[1] فرمانروایان خاندان خلجی

جلال الدین فیروز شاہ	۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء	شہاب الدین عمر شاہ	۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء
رکن الدین ابراہیم شاہ	۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء	قطب الدین مبارک شاہ	۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء
علاء الدین محمد شاہ	۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء	ناصر الدین خسرو شاہ	۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء

شجرۂ خاندان خلجی

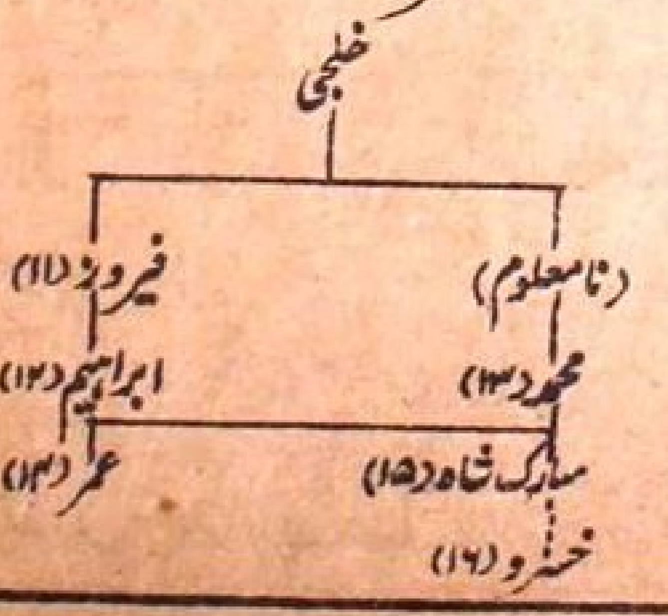

دیوگر، اور ورنگل کو فتح کیا۔ اور صوبۂ دکن کو سلطنت دہلی سے ملحق کر دیا۔ چونکہ اب سلطنۃ بہت وسیع ہو گئی تھی اس لئے تفریق کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔

تغلق خاندان کی ابتداء

اسی زمانہ میں حکومت تغلق [له] خاندان میں منتقل ہوئی اور غیاث الدین پہلا بادشاہ اس خاندان کا ہوا۔ اس کے بعد جب محمد تغلق کا دور شروع ہوا تو اُس نے یہ دیکھ کر کہ دہلی میں بیٹھ کر دکن پر حکومت نہیں کی جا سکتی، کوشش کی کہ دیوگر میں (جس کا نام اس نے دولت آباد رکھا تھا) پایۂ تخت کو منتقل کر دے لیکن وہ اس سے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا اور جو طوائف الملوکی ملک میں پھیل رہی تھی اس کا انسداد نہ ہو سکا۔ تمام صوبوں میں بغاوت برپا تھی اور وہ کسی جگہ چین سے نہ بیٹھ سکتا تھا آخر کار محمد تغلق کے

له فہرست فرمانروایان خاندان تغلق

غیاث الدین تغلق شاہ	۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء	سکندر شاہ	۷۹۵ھ / ۱۳۹۲ء
محمد بن تغلق	۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء	محمود شاہ	۷۹۵ھ / ۱۳۹۲ء
فیروز شاہ	۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء	نصرت شاہ	۷۹۷ھ / ۱۳۹۴ء
تغلق شاہ	۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء	(تخت سلطنۃ خالی رہا)	
ابوبکر شاہ	۷۹۱ھ / ۱۳۸۸ء	محمود شاہ (بار دگر)	۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ء
محمد شاہ	۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء	دولت خاں لودی	۸۱۵ھ / ۱۴۱۲ء

شجرۂ خاندان تغلق

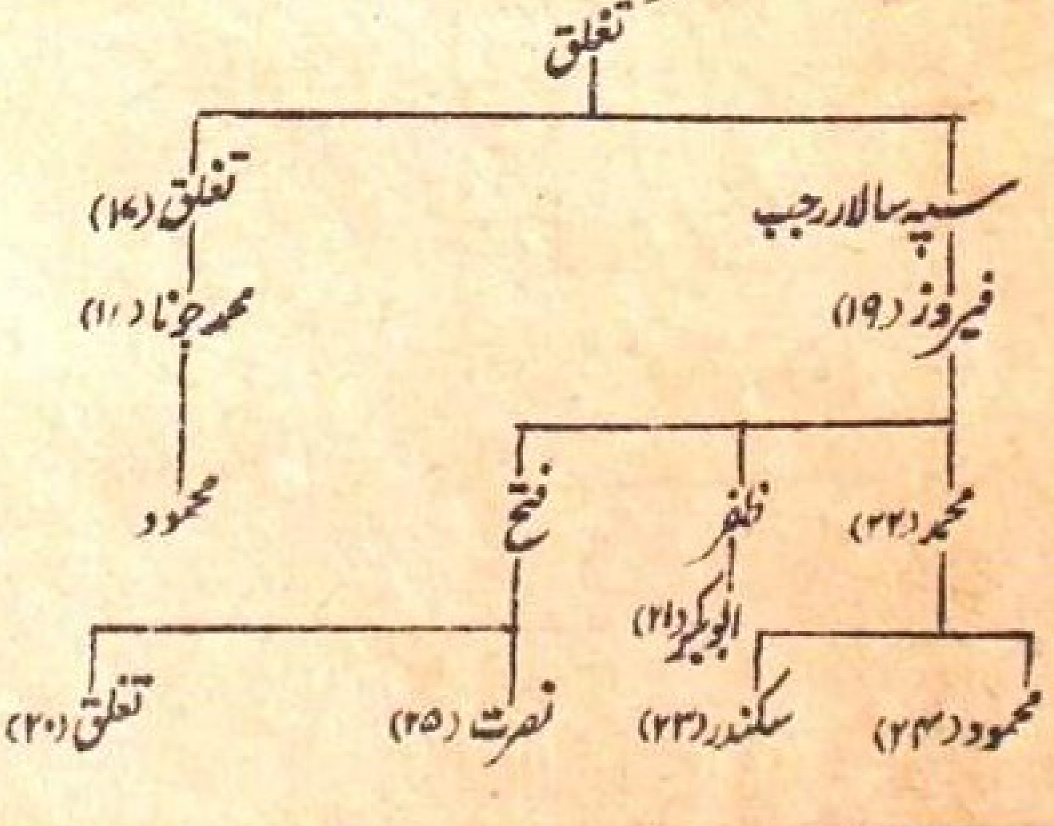

بعد جو حکمراں ہوئے ان کے عہد میں صوبے یکے بعد دیگرے علحدہ ہونے لگے اور ساری سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا

تیمور کا حملہ اسی زمانہ میں تیمور نے حملہ کیا اور ۸۰۰-۸۰۱ھ / ۹۹-۱۳۹۸ء میں تمام شمالی ہندوستان کے اندر قتل عام کر کے زوالِ سلطنۃ دہلی کو انجام تک پہونچایا۔

سیدوں اور لودیوں کی حکومت تغلق خاندان کے بعد سیدوں[1] اور لودیوں[2] کا زمانہ آیا لیکن ان کی حکومت سارے ہندوستان پر نہیں ہوئی بلکہ ایک مختصر حصہ ان کے قبضہ میں رہا۔ بنگال، جونپور، مالوہ، اور گجرات میں خود مختار مسلم حکومتیں قایم تھیں اور راجپوتوں اور دکن کے ہندوؤں نے

---

[1] فہرست فرمانروایان خاندان سیّد

خضر خاں	۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء	محمد شاہ	۸۳۷ھ / ۱۴۳۴ء
معزالدین مبارک شاہ	۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء	عالم شاہ	۸۴۷ھ / ۱۴۴۳ء

شجرۂ خاندان سیّد

خضر (۲۷)
- فرید
  - محمد (۲۹)
    - عالم (۳۰)
- مبارک (۲۸)

[2] فہرست فرمانروایان خاندانِ لودی

بہلول لودی	۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء	ابراہیم بن سکندر	۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء
سکندر بن بہلول	۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ء	(بابر کا حملہ اور ابراہیم کا قتل)	۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء

شجرۂ خاندان لودی

بہلول
- سکندر (۳۲)
  - ابراہیم (۳۳)

بہت کچھ اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات واپس لے لئے تھے۔

بابر کا حملہ ہند

ہر چند اس کے بعد بابر کی سرکردگی میں مغلوں نے حملہ کر کے تمام شمالی ہند پر اپنا تسلط پانچ سال کے اندر (۹۳۲-۹۳۷ھ / ۱۵۲۶-۱۵۳۰ء) قایم کر لیا، لیکن سلطنت علاؤ الدین خلجی کے منتشر اجزاء کو باہم ملا دینے کے لئے اس کا زمانہ بہت قلیل ثابت ہوا۔

شیر شاہ اور بنگال کے افغانوں کا عروج

بابر کے بعد شیر شاہ اور بنگال کے پٹھانوں نے ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء میں مغلوں کو ہندوستان سے باہر کر دیا اور افغان فاتحوں نے کوشش کی کہ پھر وہی گزشتہ عظمت قایم ہو جائے لیکن صوبہ کی حکومتوں نے انحراف ترک نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء میں بابر کا بیٹا ہمایوں پھر واپس آیا اور اس کے بیٹے شہنشاہ اکبر کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد قائم ہو گئی۔

سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد

بابر کا سلسلہ نسب، جو مغلوں میں اولین فاتحِ ہندوستان تھا، پانچ واسطوں سے تیمور سے ملتا ہے۔ اس کی ولادت ۸۸۸ھ / ۱۴۸۲ء میں بمقام فرغانہ ہوئی جہاں اسکا باپ گورنر تھا۔

فہرست خاندان افاغنۂ بنگال

شیر شاہ	۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء	ابراہیم سور	۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء
اسلام شاہ	۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء	سکندر شاہ	۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء
محمد عادل شاہ	۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء	—	—

شاہان مغلیہ

ظہیر الدین بابر	۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء	اعظم شاہ	۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء
نصیر الدین ہمایوں	۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء	کام بخش	۱۱۱۹-۲۰ھ / ۱۷۰۸ء
جلال الدین اکبر	۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء	قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ اول	۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء
نور الدین جہانگیر	۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء	معز الدین جہاندار	۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء
داور بخش	۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷-۲۸ء (غاصب باغی)	فرخ سیر	۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء
شہاب الدین شاہجہاں	۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء	شمس الدین رفیع الدرجات	۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء
مراد بخش (گجرات)	۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء (غاصب باغی)	رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی	۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء
شجاع (بنگال)	۱۰۶۸-۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۸-۶۰ء (غاصب باغی)	نیکو سیر	۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء (غاصب)
اورنگ زیب محی الدین عالمگیر	۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء	ابراہیم	۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۰ء (غاصب)

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۸ پر ملاحظہ ہو)

بابر کی غریب الوطنی اور ترقی

بابر کو شیبانی کے ازبکوں نے چونکہ کو وطن سے نکالدیا تھا اسلئے اسکا انتقام بابر نے افغانستان کو مغلوب کرکے لیا۔ اس نے ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء میں بدخشاں کو فتح کیا، دوسرے سال کابل پر قبضہ کیا، اور ۹۱۳ھ / ۱۵۰۷ء میں قندھار بھی لے لیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷)

محمد ناصر الدین	۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء	جلال الدین شاہ عالم	۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء
احمد	۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء	بیدار بخت	۱۲۰۲-۳ھ / ۱۷۸۸-۸۹ء (غاصب)
عزیز الدین عالمگیر ثانی	۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء	محمد اکبر ثانی	۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء
شاہجہان ثالث	۱۱۷۳-۱۱۷۴ھ / ۱۷۵۹-۱۷۶۰ء (غاصب)	بہادر شاہ ثانی	۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء — ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۷ء

شجرہ خاندان مغلیہ

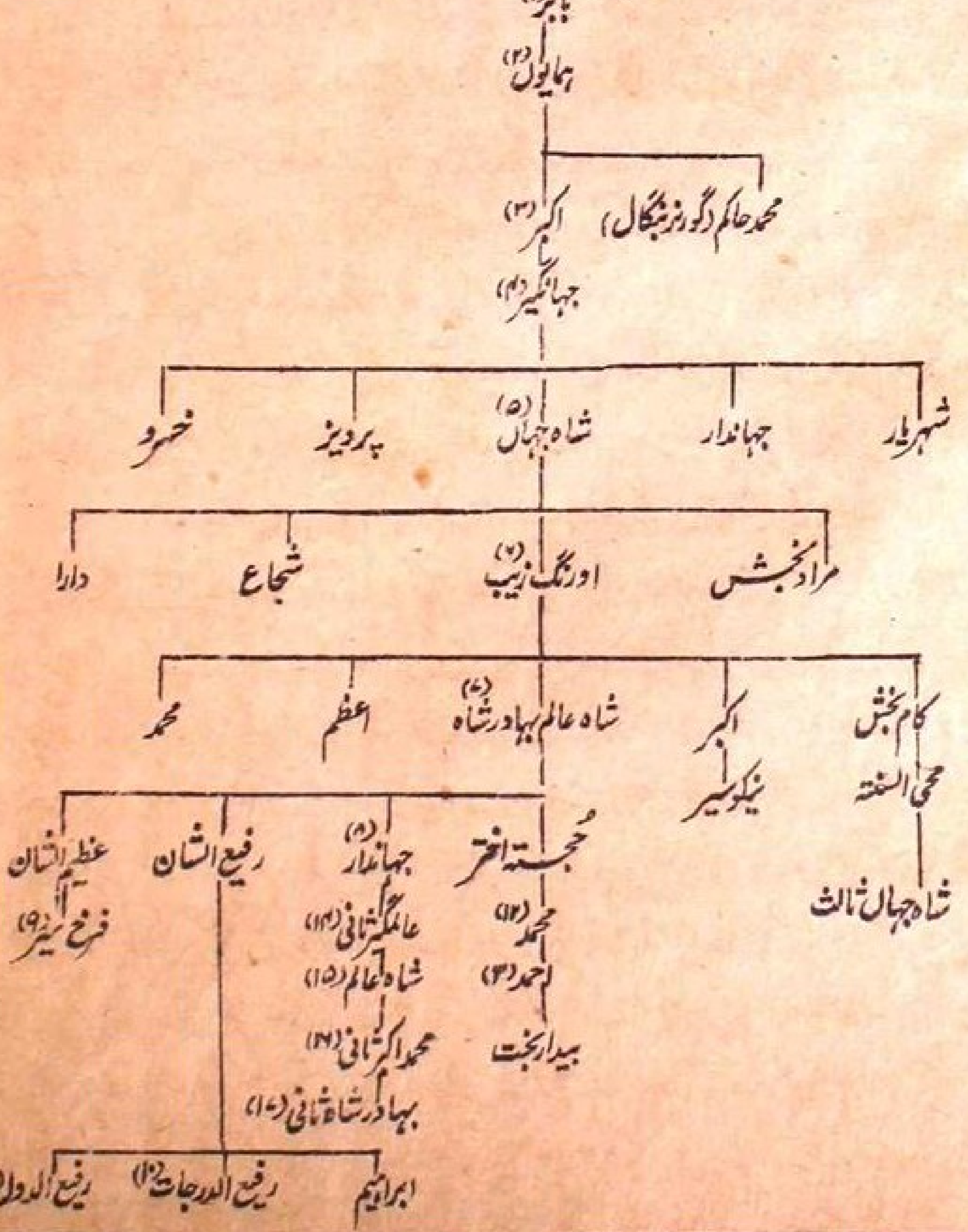

حملۂ ہندوستان

اس کے بعد وہ کئی سال تک حملۂ ہندوستان کا قصد کرتا رہا حتیٰ کہ ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء میں اس نے پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور پر قابض ہوگیا۔

۸ رجب ۹۳۲ھ (۱۹ اپریل ۱۵۲۶ء) کو اس نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی (سلطان دہلی) کی فوج کو شکست دی اور دہلی و آگرہ پر قبضہ کرکے ہندوستان کا تمام شمالی حصہ دریائے سندھ سے لیکر حدودِ بنگال تک اس کے قبضہ میں آگیا۔

بابر کی وفات

بابر ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں مرگیا اور بنگال، گجرات، مالوہ، اور دکن فتح کرنے کی حسرت اپنے ساتھ لے گیا۔

ہمایوں کا عہدِ حکومت

اس کا بیٹا ہمایوں اسوقت صرف ۱۹ سال کا تھا لیکن اس نے کوشش کی کہ اپنے باپ کی تمناؤں کو پورا کرے، جس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ گجرات و مالوہ پر مہمیں روانہ کی گئیں لیکن بیکار ثابت ہوئیں اور آخر کار بنگال کے افغانوں نے شیر شاہ کی سیادت میں جو بہار کا حکمراں تھا غریب ہمایوں کو ہندوستان سے نکل جانے پر مجبور کردیا۔

ہمایوں کی فراری

قنوج میں جو جنگ شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان واقع ہوئی، اس نے ہمایوں کو مجبور کردیا کہ وہ پہلے سندھ اور پھر فارس کی طرف جاکر پناہ لے۔ اس واقعہ سے شیر شاہ کی حکومت تمام ہندوستان میں قایم ہوگئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مکمل انتظام کرچکتا اس کی عمر ختم ہوگئی۔ اور پندرہ سال بعد پھر ہمایوں نے ہندوستان پر حملہ کرکے ۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا اور ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں مرگیا۔

اکبر کا عہدِ حکومت

اس کا بیٹا اکبر اس وقت صرف ۱۳ سال کا بچہ تھا لیکن اس کے محافظ و نگراں بیرم خاں نے ہندوستان کی فوجوں کو جو ہیمو کی سیادت میں مقابلہ کو آئی تھیں پانی پت کے میدان میں (اُسی جگہ جہاں اکبر کے دادا نے فتح حاصل کی تھی) شکست دی۔ اور اس طرح اکبر ہندوستان کے بڑے حصہ کا مالک ہوگیا۔ ہرچند اکبر ابھی کمسن تھا لیکن عنانِ حکومت اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دہلی اور آگرہ پر تو جنگِ پانی پت کے بعد ہی قبضہ ہوگیا تھا، لیکن ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں گوالیار پر اور ۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء میں جونپور پر بھی تسلط قایم ہوگیا۔

سلطنت اکبر کی وسعت

اسی کے ساتھ مالوہ اور خاندیس پر بھی تاخت عمل میں آئی، اور ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء میں چتور کے فتح ہونے سے سارا راجپوتانہ مغلوب ہوگیا اور ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں گجرات بھی زیر نگیں آگیا۔

بنگال، جس نے اس وقت تک مغل حکومت کو برائے نام تسلیم کیا تھا، باغی ہوگیا لیکن ۹۸۳-۹۸۴ھ/۱۵۷۵-۱۵۷۶ء میں یہ بھی مسخر ہوگیا۔ ۹۹۵ھ/۱۵۸۶ء میں کشمیر بھی لے لیا اور اس کے چھ سال بعد قندھار بھی سلطنۃ مغلیہ میں شامل ہوگیا۔

اکبر کی فتوحات دکن کی طرف

اکبر، دکن کی طرف متوجہ نہیں ہوا اس نے صرف اس امر کی کوشش کی

کہ جنوب کی طرف سے اس کی سلطنۃ پر حملہ نہ ہو سکے۔ اس غرض سے اس نے خاندیس کو اپنی حکومت میں شامل کرکے برہانپور کو اس صوبہ کا صدر مقام بنایا اور احمد نگر و برار کو بھی لے لیا۔ علاوہ اس کے شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ نے بھی خراج پیش کیا۔ اس سے زیادہ دکن کی طرف اکبر نے بڑھنا پسند نہیں کیا۔ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہو گیا۔

اورنگزیب دکن میں

دکن کا خواب دیکھنے میں محمد بن تغلق کا صحیح جانشین، اورنگ زیب تھا جب شاہجہاں کے زمانہ میں اورنگ زیب صرف گورنر کی حیثیت رکھتا تھا اسی وقت اس نے صوبۂ دکن پر اقتدار قایم کرکے اُسے (دولت آباد، خاندیس، تلنگانہ، برار) کو چار حصوں میں منقسم کر دیا تھا اور گولکنڈہ کے حکمراں کو بھی اس نے ۱۰۶۶ھ میں اپنا مطیع کر لیا تھا

اورنگزیب کی حکومت

جب ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب کو حصول سلطنۃ و تاج و تخت کے لئے خود اپنے بھائیوں سے مقابلہ کرنا پڑا تو چند سال تک وہ دکن کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا تو ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں دکن کی طرف مہمیں روانہ کیں اور یہ سلسلہ برابر ۲۶ سال تک جاری رہا حتے کہ وہ مر گیا۔ اس نے ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر قبضہ کرکے عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا

مرہٹوں کا خروج

اسی اثناء میں دکن کے مرہٹوں نے سر اُٹھایا اور باوجود اس کے کہ کثرت سے فوجیں روانہ کی گئیں اور بہت سے قلعے فتح کر لئے گئے لیکن یہ فتنہ فرو نہ ہو سکا اور اس صحرائی جنگ جو جماعت کا استیصال دشوار ہو گیا۔ جس وقت اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس کی سلطنۃ کابل سے دہانۂ ہگلی تک اور سورت سے مدراس تک وسیع تھی اور سارا ہندوستان اس کے قبضہ میں تھا۔

سلطنتِ مغلیہ کا زوال

اورنگ زیب کی وفات پر سلطنۃ مغلیہ میں ضعف پیدا ہونے لگا کیونکہ اس کے جانشین کمزور تھے اور سکھوں، جاٹوں، اور مرہٹوں کی قوتیں شباب پر تھیں، چنانچہ نادر شاہ اور احمد شاہ دُرّانی کے حملے اسی ضعفِ سلطنت کی وجہ سے عمل میں آئے۔

مرہٹوں کا نشوونما

وفاتِ اورنگ زیب کے ۵۰ سال بعد مرہٹوں کی قوۃ جنوب میں بہت بڑھ گئی اور تمام دکن پر سوائے اس حصہ کے جہاں نظام کا خاندان حکمراں تھا اُن کا اقتدار قایم ہو گیا۔ علاوہ انکے راجپوتوں نے بھی انحراف اختیار کر لیا۔ سکھ بھی پنجاب پر قابض ہونے لگے، اور آگرہ کے قریب جاٹ بھی خودمختار ہو گئے اور پہلے ہی سے گویا ایک جدا ملک ہو گیا تھا اور یہی حال بنگال کا تھا

جنگ پلاسی و بکسر

پلاسی کی لڑائی نے ۱۷۵۷ء میں اور بکسر کی جنگ نے ۱۷۶۴ء میں مغل سلطنۃ کو حقیقی معنی میں ختم کر دیا گو برائے نام اس کا وجود ۱۸۵۷ء تک رہا۔

سلطنتِ مغلیہ کا اختتام

آخری تین تاجدار مغلیہ خاندان کے برطانیہ کے پنشن خوار تھے اور بہادر شاہ آخری تاجدار رنگون کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں مر گیا۔

ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں

عہدِ تغلق میں انتشارِ حکومت محمد بن تغلق کے سلطنۃ میں نہ صرف سارا ہندوستان بلکہ تلنگانہ اور دکن کے اضلاع بھی شامل تھے، لیکن اس کی موت سے قبل ہی دور دراز کے صوبے خود مختار ہونے لگے اور دسویں صدی ہجری شروع ہونے سے پہلے اس کے ملک کا بہت بڑا حصہ متعدد خود مختار خاندانوں کی حکومتہ میں منتقل ہوگیا، جن کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) گورنران و شاہان بنگال — ۵۹۹-۹۸۴ھ / ۱۲۰۲-۱۵۷۶ء
(۲) مشرقی شاہان جونپور — ۷۹۶-۹۰۵ھ / ۱۳۹۴-۱۵۰۰ء
(۳) شاہان مالوہ — ۸۰۴-۹۳۷ھ / ۱۴۰۱-۱۵۳۰ء
(۴) شاہان گجرات — ۷۹۹-۹۸۰ھ / ۱۳۹۶-۱۵۷۲ء
(۵) شاہان کشمیر — ۷۳۵-۹۹۵ھ / ۱۳۳۴-۱۵۸۷ء
(۶) فاروقی شاہان خاندیس — ۸۰۱-۱۰۰۸ھ / ۱۳۹۹-۱۵۹۹ء
(۷) بہمنی شاہان گلبرگہ — ۷۴۸-۹۳۳ھ / ۱۳۴۷-۱۵۲۶ء

جب بہمنی خاندان کو زوال ہوا تو حسب ذیل پانچ خاندانوں میں حکومت تقسیم ہوگئی :-

(۱) عماد شاہی (برار) — ۸۹۰-۹۸۰ھ / ۱۴۸۴-۱۵۷۲ء
(۲) نظام شاہی (احمد نگر) — ۸۹۶-۱۰۴۷ھ / ۱۴۹۰-۱۵۹۵ء
(۳) برید شاہی (بدر) — ۸۹۷-۱۰۱۸ھ / ۱۴۹۲-۱۶۰۹ء
(۴) عادل شاہی (بیجاپور) — ۸۹۵-۱۰۹۷ھ / ۱۴۸۹-۱۶۸۶ء
(۵) قطب شاہی (گولکنڈہ) — ۹۱۸-۱۰۹۸ھ / ۱۵۱۲-۱۶۸۷ء

بعد کو جب مغلوں کا عہد شروع ہوا تو ہندوستان کی حکومتیں عہدِ اکبر میں اور دکن کی ریاستیں عہدِ اورنگ زیب میں سلطنتِ مغلیہ کا جزو بن گئیں۔

گورنران[1] و شاہان بنگال

بنگال کا اولین مسلمان گورنر محمد بختیار فاتح بنگال نے (موجودہ صوبۂ بنگال کے لحاظ سے) صرف ایک مختصر سا حصہ اس کا فتح کیا تھا جس کا دارالحکومۃ لکھنوتی تھا، چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کی ابتدا میں سونار گاؤں اور ساتا گاؤں میں گورنروں کا قیام رہتا تھا اور بنگالہ سے یہی دونوں

---

[1] گورنران بنگال

محمد بختیار خلجی	۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء	علاؤالدین مردان	۶۰۵ھ / ۱۲۰۸ء
عزالدین محمد شیران	۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء	غیاث الدین عوض	۶۰۸ھ / ۱۲۱۱ء

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ ہو)

مقام بشمول لکھنوتی مراد لئے جاتے تھے۔

بنگال کا دار الحکومت ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء تک فیروز آباد (پانڈوا) اس صوبہ کا پایۂ حکومت رہا اس کے بعد پھر لکھنوتی دار الحکومت ہوگیا، جسے اس سے قبل گوڑ کہتے تھے۔ اس کے بعد یہ فخر ٹانڈا کو حاصل ہوا۔ بعض گورنران بنگال نے بہار، چٹگام، اور اڑیسہ پر بھی اپنا قبضہ کرلیا تھا۔

گورنران بنگال کی خود مختاری جب شاہانِ دہلی کمزور ہوگئے تو گورنران بنگال خود مختار ہوگئے اور کئی خاندان ان میں سے ایسے ہوئے جنھوں نے شاہانہ اختیارات حاصل کرلئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱)

ناصر الدین محمود	۶۲۴ھ / ۱۲۲۶ء	شہاب الدین بغرا خاں	۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء (مغربی بنگال)
علاؤ الدین جانی	۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ء	غیاث الدین بہادر شاہ	۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء (مشرقی بنگال)
سیف الدین ایبک	۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ء	ایضاً	۷۱۹ھ / ۱۳۱۹ء (تمام بنگال)
عز الدین طغرل طوغان خاں	۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء	ناصر الدین	۷۲۳-۷۲۶ھ / ۱۳۲۳-۱۳۲۵ء (لکھنوتی)
قمر الدین تمر خاں قیران	۶۴۲ھ / ۱۲۴۴ء	بہادر شاہ و بہرام	۷۲۵-۷۳۱ھ / ۱۳۲۴-۱۳۳۰ء (مشرقی بنگال)
اختیار الدین (مغیث الدین) یوزبک	۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء	بہرام شاہ	۷۳۱-۷۳۹ھ / ۱۳۳۰-۱۳۳۸ء
جلال الدین مسعود ملک جانی	۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء	قدر خاں	۷۲۶-۷۴۰ھ / ۱۳۲۵-۱۳۳۹ء (لکھنوتی)
عز الدین بلبن	۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء	عز الدین اعظم الملک	۷۲۳-۷۴۰ھ / ۱۳۲۳-۱۳۳۹ء (ساتگاؤں)
محمد ارسلان تاتار خاں	۶۵۹ھ / ۱۲۶۰ء ؟	(شاہان بنگال)	
شیر خاں		فخر الدین مبارک شاہ	۷۳۹-۷۵۰ھ / ۱۳۳۸-۱۳۴۹ء (مشرقی بنگال)
امین خاں		اختیار الدین غازی خاں	۷۵۰-۷۵۳ھ / ۱۳۴۹-۱۳۵۲ء (مشرقی بنگال)
مغیث الدین طغرل	۶۷۷ھ / ۱۲۷۸ء	علاء الدین علی شاہ	۷۴۰-۷۴۶ھ / ۱۳۳۹-۱۳۴۵ء (مغربی بنگال)
ناصر الدین بغرا خاں	۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء	(خاندان الیاس)	
رکن الدین کیکاؤس	۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء	شمس الدین الیاس شاہ	۷۴۰-۷۴۶ھ / ۱۳۳۹-۱۳۴۵ء مغربی بنگال میں مصروف پیکار رہا۔
شمس الدین فیروز شاہ	۷۰۲ھ / ۱۳۰۲ء		

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳ پر دیکھئے)

مغلوں کا اثر بنگال میں

ہمایوں، بنگال پر ۹۴۴ھ سے ۹۴۶ھ تک قابض رہا لیکن جب ۹۴۶ھ میں شیر شاہ نے مغلوں کو شکست دی تو پھر یہاں خود مختار حکومتیں قایم ہوگئیں اور یہ حالت اسوقت تک قایم رہی جب تک ۹۸۲ھ میں بہار کو اکبر نے فتح نہیں کرلیا اور ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء میں مغلوں کا اثر بنگال میں عام نہیں ہوگیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲)

شمس الدین الیاس شاہ	۷۴۶ھ / ۱۳۴۵ء (مغربی بنگال)
ایضاً	۷۵۳–۷۵۹ھ / ۱۳۵۲–۱۳۵۸ء (تمام بنگال)
سکندر شاہ بن الیاس	۷۵۹–۷۹۲ھ / ۱۳۵۸–۱۳۸۹ء
غیاث الدین اعظم شاہ بن سکندر شاہ	۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء (۱۳۶۷ء میں بغاوت کی اور ۱۳۸۹ء سے حکومت پر قابض ہوگیا)
سیف الدین حمزہ شاہ بن اعظم شاہ	۷۹۹ھ / ۱۳۹۶ء
شمس الدین بن حمزہ	۸۰۹ھ / ۱۴۰۶ء
(خاندان راجہ کنس)	
شہاب الدین بایزید شاہ (بمعیت راجہ کنس)	۸۱۲ھ / ۱۴۰۹ء
جلال الدین محمد شاہ بن راجہ کنس	۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء
شمس الدین احمد شاہ بن محمد	۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء
(خاندان الیاس باردگر)	
ناصر الدین محمود شاہ اول	۸۴۶ھ / ۱۴۴۲ء
رکن الدین باربک شاہ بن محمود شاہ	۸۶۴ھ / ۱۴۵۹ء
شمس الدین یوسف شاہ بن باربک شاہ	۸۷۹ھ / ۱۴۷۴ء
سکندر شاہ بن یوسف شاہ	۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء
جلال الدین فتح شاہ بن محمود شاہ اول	۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء
(حبشی النسل)	
سلطان شاہزادہ باربک	۸۹۲ھ / ۱۴۸۶ء

سیف الدین فیروز شاہ اول	۸۹۲ھ / ۱۴۸۶ء
ناصر الدین محمود شاہ ثانی بن فتح شاہ (خاندان الیاس)	۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء
شمس الدین ابو النصر مظفر شاہ	۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء
(خاندان حسین شاہ)	
علاء الدین حسین شاہ	۸۹۹ھ / ۱۴۹۳ء
ناصر الدین نصرت شاہ بن حسین شاہ	۹۲۵ھ / ۱۵۱۸ء
علاء الدین فیروز شاہ بن نصرت شاہ	۹۳۹ھ / ۱۵۳۲ء
غیاث الدین محمود شاہ ثالث بن حسین	۹۳۹ھ / ۱۵۳۲ء
فتوحات ہمایوں	۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء
(خاندان محمد سور)	
شمس الدین محمد سور غازی شاہ	۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء
بہادر شاہ (خضر) بن محمد سور	۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء
غیاث الدین جلال شاہ بن محمد سور	۹۶۸ھ / ۱۵۶۰ء — ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء
(خاندان سلیمان کرارانی)	
سلیمان خاں کرارانی (بہار و بنگال)	۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء
بایزید شاہ بن سلیمان	۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء
داؤد شاہ بن سلیمان	۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء
شاہان مغلیہ	۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء

شرقی شاہان جونپور[1]

سلطنتِ جونپور کی ابتداء خواجہ جہان، محمد تغلق کا وزیر تھا لیکن اپنے نوجوان وکمسن آقا کو چھوڑ کر اس نے ایک خود مختار حکومت جونپور میں قایم کی اور یہیں سے اس نے اور اس کے جانشینوں نے کچھ زمانہ تک بہار، اودھ، قنوج، بہرائچ پر بھی اپنا اثر قایم کرلیا۔ انھوں نے دو مرتبہ دہلی کا محاصرہ بھی کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شاہان مالوہ سے بھی بارہا ان کا مقابلہ ہوا۔

شرقی سلطنت کا محو ہوجانا ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء، یا (بعض مورخین کے بیان کے مطابق) ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء میں سکندر بن بہلول لودی نے جونپور کو فتح کیا اور پھر سلطنت دہلی سے ملالیا۔

شاہان مالوہ[2]

سلطنت مالوہ کی ابتداء مالوہ قدیم راجپوت سلطنت میں شامل تھا اور وہ عرصہ تک مسلمانوں کے حملہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ جب یہ صوبہ سلطان بلبن کے عہد میں مفتوح ہوا تو اس کے حدود یہ تھے دریائے نربدا جنوب میں۔ دریائے چمبل شمال میں۔ گجرات و بندیلکھنڈ مغرب و مشرق میں۔

[1] فہرست شاہان شرقی

خواجہ جہان	۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء	محمد شاہ بہ شرکت محمود شاہ	۸۶۱ھ/۱۴۵۶ء
مبارک شاہ	۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء	حسین شاہ بن محمود	۸۶۳ھ/۱۴۵۸ء
شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی بن مبارک	۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء	(۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء میں بنگال بھاگ گیا اور ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء میں مرگیا)	
محمود شاہ بن ابراہیم	۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء		

[2] شاہان مالوہ

(خاندان غور)		محمود شاہ اول (خلجی)	۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء
دلاور خاں	۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء	غیاث شاہ بن محمود	۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء
ہوشنگ (الپ خاں) بن دلاور خاں	۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء	ناصر شاہ بن غیاث	۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء
محمد غزنی خاں بن ہوشنگ	۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء	محمود ثانی بن ناصر	۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء
(خاندان خلجی)		شاہان گجرات	۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء

شاہانِ خلجی کے زمانہ میں ہوشنگ آباد، اجمیر، ایلچ پور، اسی صوبہ میں شامل تھے اور کبھی کبھی چتوڑ سے بھی خراج وصول کیا جاتا تھا۔

اس صوبہ کا اسلامی پایہ تخت شہر مانڈو تھا جسے ہوشنگ غوری نے بنایا تھا۔ ایک وسیع مرتفع میدان میں یہ شہر تعمیر کیا گیا۔ اس کے چاروں طرف بڑی بڑی چٹانیں تھیں اور یہ شہر اپنی مساجد اور اپنی محلات کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں

مالوہ میں غوری اور خلجی خاندانوں کی حکومت

مالوہ میں دو مسلمان خاندان نے حکومت کی پہلا خاندان دلاور خاں غوری کا تھا جو سلطنتِ دہلی کی طرف سے یہاں کا گورنر تھا۔ اس خاندان کے صرف تین افراد (دلاور خاں اس کے بیٹے اور پوتے) نے مالوہ میں حکومت کی۔ دوسرا خاندان محمد خلجی کا تھا جو دلاور خاں کے پوتے کا وزیر تھا۔ جب سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲ء میں شاہان گجرات نے سلطنتِ مالوہ کو بھی لے لیا تو اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

چونکہ خلجی ایک جنگ جو قوم تھی اس لئے مالوہ کی فوجیں شمال میں دہلی تک اور جنوب میں بدر تک پہونچ گئیں اور چتوڑ کے راجپوتوں اور چندیریوں کے ساتھ بھی انھوں نے برابر لڑائیاں قایم رکھیں۔

شاہانِ گجرات[1]

گجرات میں اسلامی حکومت کی ابتداء

گجرات، عرصہ تک ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے قبضہ میں نہیں آیا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ صوبہ گجرات پہاڑوں اور وسیع ریگستانوں کے حائل ہو جانے سے ناقابل تسخیر تھا اور صرف سمندر کی طرف سے اس پر حملہ ہو سکتا تھا۔

---

[1] فہرست شاہان گجرات

مظفر شاہ اول ظفر خاں	سنہ ۷۹۹ھ / ۱۳۹۶ء	داؤد شاہ	سنہ ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء
احمد شاہ اول	سنہ ۸۱۴ھ / ۱۴۱۱ء	محمود شاہ اول بیقراہ	سنہ ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء
محمد کریم شاہ	سنہ ۸۴۶ھ / ۱۴۴۳ء	مظفر شاہ ثانی	سنہ ۹۱۷ھ / ۱۵۱۱ء
قطب الدین	سنہ ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء	سکندر شاہ	سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ ہو)

ساتویں صدی کے آخر میں علاء الدین خلجی نے اس کو سلطنتِ دہلی کا ایک صوبہ بنایا لیکن آٹھویں صدی کے اختتام پر وہ پھر خود مختار ہو گیا مگر فرق یہ تھا کہ اب اس کے حکمران مسلمان تھے۔

گجرات کی خود مختار حکومت کی بنیاد

ظفر خاں ایک مسلمان راجپوت کا لڑکا سنہ ۷۹۴ھ / ۱۳۹۲ء میں گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا اور سنہ ۷۹۹ھ / ۱۳۹۶ء میں اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

اسوقت دشمن چاروں طرف سے اس کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ ایک طرف راجپوت اور دوسری طرف بھیل کی وحشی قوم پہاڑوں اور سمندر کے درمیان صرف ایک پتلا سا ٹکڑا صوبۂ گجرات کا اس کے قبضہ میں تھا لیکن ساحلی حصہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵)

ناصر خاں محمود ثانی — سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء
بہادر شاہ — سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء
میران شاہ فاروقی (خاندیسی) — سنہ ۹۴۳ھ / ۱۵۳۶ء
محمود شاہ ثالث — سنہ ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء

احمد شاہ ثانی — سنہ ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء
مظفر شاہ ثالث حبیب — سنہ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۱ء
شاہانِ مغل — سنہ ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء

شجرہ شاہانِ گجرات

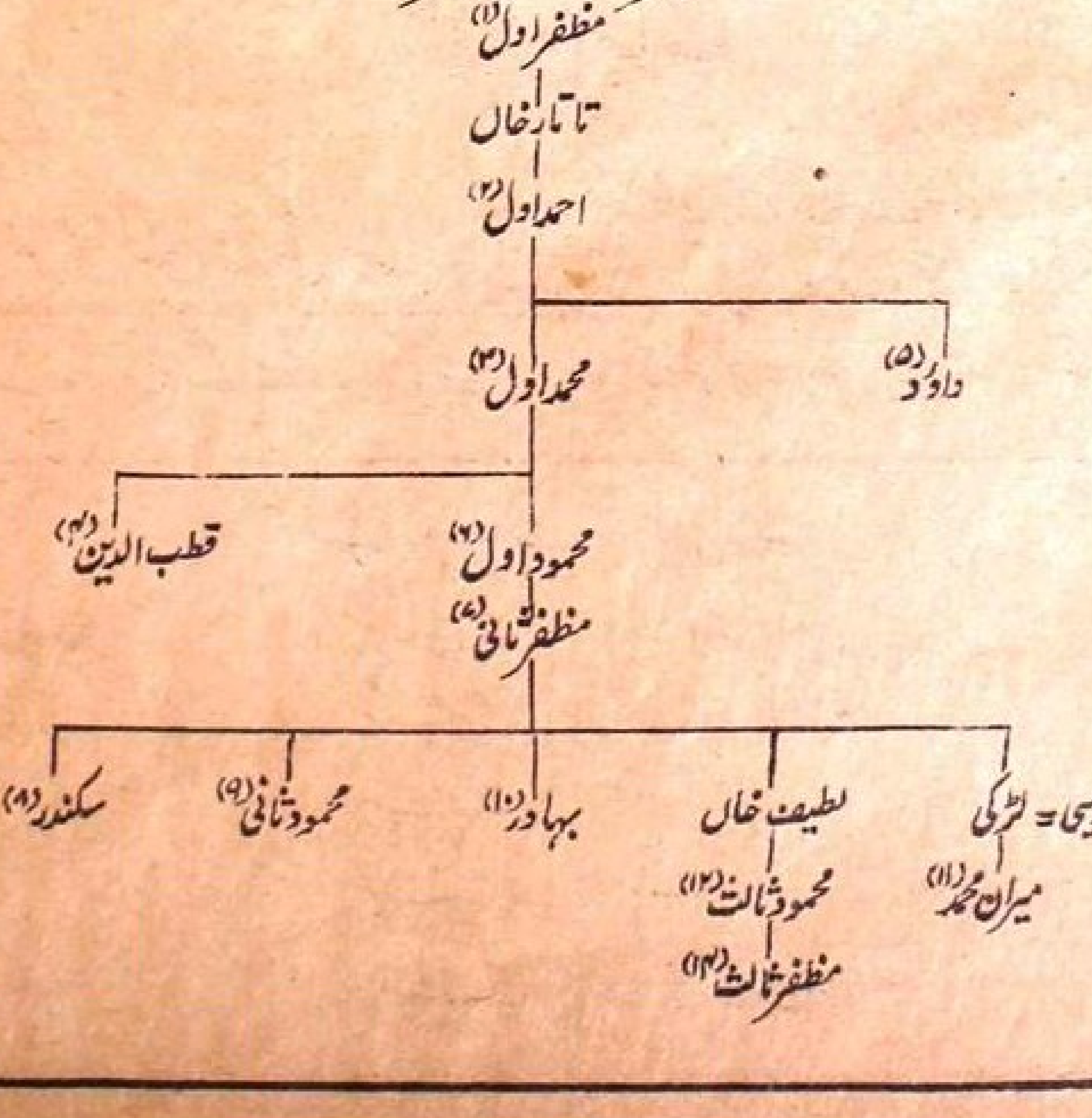

ضرور سورت تک اس میں شامل تھا اس لئے اس نے ایدر اور ڈیو فتح کرکے اپنی مملکت کو وسیع کیا اور ۸۱۰ھ ۱۴۰۷ء میں مالوہ کو بھی لے لیا۔

شہر احمد آباد کی تعمیر احمد شاہ اول اس کے بیٹے نے احمد آباد بنایا جو اس خاندان کا پایۂ حکومت رہا اور مغلوں کے زمانہ میں ایک صوبہ ہو گیا۔ اب بھی احمد آباد ہندوستان کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

فتوحات شاہانِ گجرات محمود شاہ نے نہ صرف مالوہ اور خاندیس سے جنگ جاری رکھی بلکہ قلعۂ جوناگڈھ (کاٹھیاواڑ) اور چمپانیر کو بھی لے لیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک بڑا بیڑہ جہازوں کا بحری ڈاکوؤں کو مغلوب کرنے اور پرتگالیوں پر حملہ کے لئے قائم کیا، جنھیں بہادر شاہ فاتح مالوہ نے ڈیو میں ایک کارخانہ بنانے کے حقوق دیدئے تھے، اور جن کے ہاتھ سے وہ مارا گیا۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ مفسد و خود غرض امراء کی وجہ سے بالکل بے دست و پا ہو گئے تھے یہاں تک کہ ۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے اس صوبہ کو بھی فتح کر لیا۔

شاہانِ خاندیس[۱]

خاندیس کا اولین مسلمان فرمانروا ناصر خاں، خاندیس کا پہلا مسلمان فرمانروا تھا جو سلطنت دہلی سے آزاد ہو کر خود مختار ہوا۔ یہ اپنے کو خلیفۂ ثانی کی نسل سے ظاہر کرتا تھا اور ازدواجی سلسلہ سے شاہانِ گجرات کا رشتہ دار تھا، اس کا دار الحکومت برہان پور

---

[۱] فہرست فرمانروایانِ خاندیس

ملک راجہ	۷۷۲ھ / ۱۳۷۰ء
ناصر خاں	۸۰۱ھ / ۱۳۹۹ء
میران عادل خاں اول	۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء
میران مبارک اول	۸۴۴ھ / ۱۴۴۱ء
عادل خاں ثانی	۸۶۱ھ / ۱۴۵۷ء
داؤد خاں	۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء
عادل خاں ثالث	۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء
میران محمد شاہ اول	۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء
میران مبارک ثانی	۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء
میران محمد ثانی	۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء
علی خاں	۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء
بہادر شاہ	۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء = ۱۰۰۸ھ / ۱۵۹۹ء
شاہان مغلیہ	

قلعۂ اسیر گڈھ کے پاس تھا۔ اکبر نے ۹۶۹ھ/ ۱۵۶۲ء میں برہان پور کو لے لیا اور وہاں کے فرمانروا نے اطاعت اختیار کرلی۔

حکومتِ خاندیس کا شمول سلطنتِ مغلیہ میں لیکن حقیقتاً صوبۂ خاندیس اسوقت تک سلطنتِ مغلیہ میں شامل نہیں ہوا، جب تک ۱۰۰۹ھ/ ۱۵۹۹ء میں چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد اسیر گڑھ فتح نہیں ہوگیا۔

۱؎ بہمنی خاندان دکن

دکن میں اسلامی فتوحات دکن کا ایک حصہ سب سے پہلے علاء الدین محمد خلجی نے فتح کیا تھا اس نے ۶۹۳ھ/ ۱۲۹۴ء میں "دیوگر" اور "اچل پور" پر قبضہ کرکے ایک نیا صوبہ کوہستان "ست پڑا" کے جنوب میں قائم کیا۔ محمد بن تغلق نے ۷۲۱ھ/ ۱۳۲۱ء میں تلنگانہ پر حملہ کرکے صوبۂ دکن کو وسیع کرلیا اور کچھ زمانہ تک دیوگر کو (جس کا دوسرا نام دولت آباد تھا) دارالحکومۃ قرار دیا۔ اس کے دورِ حکومت میں متعدد بغاوتیں ہوئیں اور سب سے پہلے جس صوبہ نے خود مختاری اختیار کی وہ صوبۂ دکن ہی تھا، جہاں ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء سے تقریباً دو صدی بعد تک گلبرگہ، ورنگل اور بدر کے بہمنی فرمانروا دکن کے شمالی نصف حصہ پر حکمراں رہے۔

بہمنی خاندان کا مورثِ اعلیٰ ان کا مورثِ اعلیٰ حسن کانگو ایک افغان تھا، جس کا مورثِ اعلیٰ فارس کا مشہور بادشاہ بہمن تھا۔[۲] تغلق سلاطین کے زمانہ میں اس نے ترقی کرکے ظفر خاں کا خطاب حاصل کیا۔ جب دکن میں محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت شروع ہوئی تو حسن نے شاہی فوجوں کو ملک سے

۱؎ فہرست فرمانروایان بہمنی خاندان

حسن کانگو علاء الدین ظفر خاں	۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء	شمس الدین	۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء
محمد شاہ اول	۷۵۹ھ/ ۱۳۵۸ء	تاج الدین فیروز شاہ	۸۰۰ھ/ ۱۳۹۷ء
مجاہد شاہ	۷۷۶ھ/ ۱۳۷۵ء	احمد شاہ	۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ء
داؤد شاہ	۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء	علاء الدین احمد شاہ ثانی	۸۳۸ھ/ ۱۴۳۵ء
محمود شاہ اول	۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء	علاء الدین ہمایوں شاہ	۸۶۲ھ/ ۱۴۵۷ء
غیاث الدین	۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء	نظام شاہ	۸۶۵ھ/ ۱۴۶۱ء

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

۲؎ فرشتہ نے غلط لکھا ہے کہ وہ کانگو نامی برہمن کے یہاں ملازم تھا۔ محلہ گلبرگہ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں اس کا نام حسن کانگو شاہ بہمن لکھا ہے

نکال دیا اور علاء الدین حسن کانگو بہمن شاہ کے نام سے گلبرگہ کے تخت پر قابض ہوگیا۔ اس کا ملک شمال میں برار تک، مشرق میں تلنگانہ تک، جنوب و مغرب میں دریائے کرشنا اور سمندر تک وسیع تھا۔ علاوہ اس کے اس نے تلنگانہ اور وجیانگر کے راجاؤں کو بھی بارہا خراج دینے پر مجبور کیا۔

بہمنی حکومت کی وسعت علاء الدین احمد ثانی کے زمانہ میں خاندیس اور گجرات کے فرمانرواؤں کو بھی شکست ہوئی۔ ۸۶۷ھ/۱۴۶۳ء میں محمد شاہ ثانی، اوڑیسہ تک بڑھتا ہوا چلا گیا، کانجی ورم پر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸)

محمد شاہ ثانی	۸۶۷ھ/۱۴۶۳ء	علاء الدین شاہ	۹۲۷ھ/۱۵۲۰ء
محمود شاہ ثانی	۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء	ولی اللہ شاہ	۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء
احمد شاہ ثالث	۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء	کلیم اللہ شاہ	۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء = ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء

شجرہ شاہان بہمنی

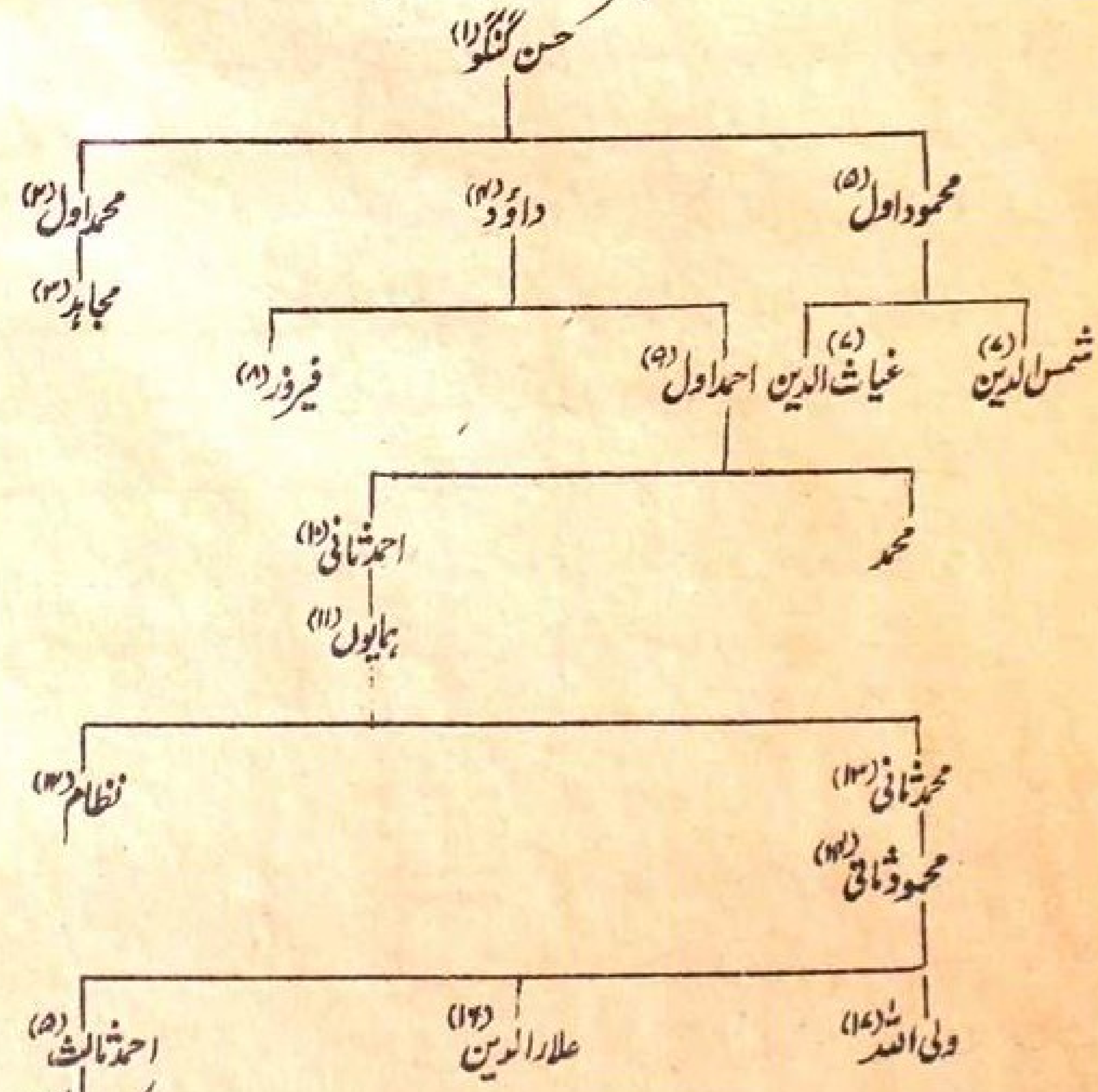

قبضہ کرلیا اور جنوب میں راجہ بلگاؤں سے جنگ کی، یہاں تک کہ بہمنی فرمانرواؤں کا اثر میسور کے شمال تک تقریباً تمام دکن میں پھیل گیا چونکہ ملک بہت وسیع ہوگیا تھا اس لئے اس کے مختلف صوبے قرار دئے گئے اور آخرکار صوبوں کے گورنر بعد کو مطلق العنان ہوگئے۔

بہمنی حکومت کا تجزیہ

یوسف عادل شاہ، محمد شاہ ثانی کے جنرل نے بیجاپور میں خود مختاری کا اعلان کردیا، نظام الملک نے اپنے مقبوضہ کو علحدہ کرلینے کی تیاریاں شروع کیں۔ عماد الملک برار کا بادشاہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ برار میں عماد شاہیوں کی احمد نگر میں نظام شاہیوں کی بدر میں بریدشاہیوں کی بیجاپور میں

۱۔ عماد شاہی (برار)

فتح اللہ	۸۹۰ھ / ۱۴۸۴ء	برہان	۹۶۸ھ / ۱۵۶۰ء
علاء الدین	۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء	طفیل (غاصب)	۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء = ۹۷۶ھ / ۱۵۶۸ء
دریا	۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء	—	

۲۔ نظام شاہی (احمد نگر)

احمد اول بن نظام شاہ	۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء	اسماعیل	۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء
برہان اول	۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء	برہان ثانی	۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء
حسین	۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء	ابراہیم	۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء
مرتضےٰ	۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء	احمد ثانی	۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۴ء
میران حسین	۹۹۶ھ / ۱۵۸۸ء	بہادر	۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء ۔ شاہان مغلیہ

۳۔ بریدشاہی (بدر)

قاسم اول	۸۹۷ھ / ۱۴۹۲ء	قاسم ثانی	۹۹۷ھ / ۱۵۶۹ء
امیر اول	۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء	مرزا علی	۱۰۰۰ھ / ۱۵۷۲ء
علی	۹۴۵ھ / ۱۵۴۹ء	امیر ثانی	۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء
ابراہیم	۹۹۰ھ / ۱۵۴۲ء	—	

عادل شاہیوں[1] کی اور گولکنڈہ میں قطب شاہیوں[2] کی حکومت قائم ہوگئی اور بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

---

[1] عادل شاہی (بیجاپور)

یوسف عادل شاہ	۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء
اسمٰعیل	۹۱۶ھ / ۱۵۱۱ء
مُلّو	۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء
ابراہیم اول	۹۴۱ھ / ۱۵۳۵ء
علی اول	۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء
ابراہیم ثانی	۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء
محمد	۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء
علی ثانی	۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء = ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء

[2] قطب شاہی (گولکنڈہ)

سلطان قُلی	۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء
جمشید	۹۴۰ھ / ۱۵۴۳ء
سبحان قُلی	۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء
ابراہیم	۹۵۷ھ / ۵۴۳ء
محمد قلی	۹۸۶ھ / ۱۵۸۱ء
عبداللہ	۱۰۳۰ھ / ۱۶۱۱ء
ابوالحسن	۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء = ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۶ء

باب اول

سندھ میں مسلمانوں کی حکومت

بعد رحلت رسالتمآب اہلِ عرب نے جس تیزی کے ساتھ، صرف بیس سال کے اندر شام و فلسطین، مصر و ایران کو مغلوب کرکے اپنی حکومت وہاں قایم کردی، وہ تاریخ کا خواہ کتنا ہی حیرت ناک واقعہ کیوں نہ ہو لیکن اسمیں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ ایسا ہوا اور سب کو اس کا اعتراف ہے

ہمارے موضوع سے یہ بحث بالکل جدا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے عرب کے وحشیوں میں یہ شاہانہ عزم پیدا کر دیا اور وہ کیا انقلاب تھا، جس نے ایک سوئی ہوئی بستی، اک پست و ذلیل قوم کو دفعۃً بیدار کرکے نکبت و غلامی کی ادنیٰ سطح سے اُٹھاکر حکومت و فرمانروائی کی بلند سطح تک پہونچا دیا، تاہم یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس جماعت نے ایشیار میں اکاسرۂ عجم کے طنطنۂ ملوکانہ کو یوں دفعۃً مٹاکر رکھدیا، اس کے عزائم کا تقاضا یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنی فاتحانہ پیشقدمی کو جاری رکھے۔ چنانچہ ہندوستان بھی اس سے محروم نہیں رہا اور اُسی وقت جبکہ اسلام کے سلاب فتوحات سے دنیا کے اور بہت سے ممالک سیراب ہو رہے تھے، سرزمین ہند بھی یہ شرف حاصل کرنے میں پیچھے نہیں رہی۔

جب پہلی صدی ہجری میں اہل عرب چارعن طرف منتشر ہوگئے، تو اُنھوں نے اپنے مقبوضات وسیع کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا اور اُس وقت تک وہ اپنے فاتحانہ اقدام سے باز نہیں آئے جب تک خود فطرت نے ان کے سامنے ناقابل تسخیر حجابات پیدا نہیں کر دئے۔ وہ شمالی افریقہ میں پھیل گئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کہاں جاکر ٹھہرتے اگر خشک و گرم ریگستان مانع نہ آجاتا۔ اسی طرح جب انھوں نے ہسپانیہ کو زیرنگیں کیا تو اپنی حدود سلطنت کو وسیع کرنے کے لئے وہ اس وقت تک مضطرب رہے، جب تک ان کے سامنے

بحرِ اطلانٹک (Atlantic Ocean) کی موجوں نے ایک خطِ فاصل نہیں کھینچ دیا۔ یہی صورت بالکل مشرق میں بھی پیش آئی کہ وہ فارس کو فتح کرکے آگے بڑھے لیکن ہندوکش کے برف پوش سنگین دیواروں نے انھیں ہندوستان آنے سے روک دیا۔ اور اس لئے تسخیرِ ہندوستان کا فخر حقیقی معنی میں مشرق ہی کے مسلمانوں کو حاصل ہوا جن کے اندر عربوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ اپنا سارا فاتحانہ جوش بھی منتقل کردیا تھا

ہر چند اہلِ عرب اُن دولتوں سے پوری طرح آگاہ نہ تھے جن سے سمندر کی گہرائیاں مالامال ہیں، تاہم وہ مغربی ہند کے سواحل سے بے خبر نہ تھے جہاں زمانۂ قدیم سے عرب کے تاجروں کی آمد و رفت پائی جاتی تھی یہ لوگ خلیج فارس کو عبور کرکے دریائے سندھ کے دہانہ تک اور وہاں سے سیرا اور کمبایت (Cambay) اور کبھی کبھی کالی کٹ (Calicut) و ساحلِ مالابار کی دیگر بندرگاہوں تک پہونچ گئے

انھوں نے اپنے وطن واپس جاکر ہندوستان کی دولت، ہندوستان کی پیداوار، اور یہاں کی بت پرستی وغیرہ کا حال، بیان کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ خلیفۂ ثانی کے عہد میں ایک فوجی مہم ۱۵ھ میں ساحلِ ہند پر روانہ کی گئی جو (بمبئی کے قریب) تھانہ پر قابض ہوکر بھروچ تک پہونچ گئی۔ اس کے بعد بھی خلیج فارس کے عربوں نے جو بڑے ذی حوصلہ اور دلیر لوگ تھے، متعدد بار ساحلِ ہند پر اپنی فوجیں پھیلا دیں، لیکن ان سب کا شمار "فوجی تاخت" میں تھا۔ باقاعدہ جنگ سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اور مقصود بھی صرف اشاعتِ اسلام تھا نہ کہ کسی سلطنت کی بنیاد ڈالنا

عربوں کا سب سے پہلا باقاعدہ حملہ ہندوستان پر مکران کی طرف سے ہوا جو انتہائے مشرق میں خلافت کا ایک دور دراز صوبہ تھا اور چونکہ سرحدِ ہند پر کوئی قدرتی مانع موجود نہ تھا، اسلئے مکران کے گورنروں نے متعدد بار حملے کئے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان حملوں نے بھی ہندوستان میں کسی سلطنت کی بنیاد نہیں ڈالی اور نہ عرب سپاہ اندرونِ ملک میں اقتدار حاصل کرسکی

آخر کار خلافتِ بنی امیہ میں وہ زمانہ آیا جب حجاج نے اس جانب توجہ کی اور اس نے ایک طرف حدودِ تاتار میں اشاعتِ اسلام کے لئے قتیبہ کو نامزد کیا اور دوسری طرف محمد قاسم کو ہندوستان کی طرف روانہ کیا

محمد قاسم کے حملۂ سندھ کا افسانہ حقیقتاً ایک تاریخی رُومان (Romance) ہے۔ ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ اسوقت تک عربوں کا یہاں کہیں گزر نہیں ہوا تھا، آبادی سخت جنگجو تھی اور اس کے اخلاق و اطوار مذہبی عقاید اور معاشرتی خصایل عربوں کے عادات و معتقدات سے مختلف تھے۔ مرکزِ خلافت اور اُس کے درمیان کوہستانوں، دریاؤں، اور صحراؤں کا غیر متناہی سلسلہ حایل تھا، لیکن اس کی کچھ پرواہ نہیں کی گئی اور ایک نوجوان عرب جس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی، جس کو نبرد آزمائی کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا، اس اہم خدمت پر

پر مامور کر دیا گیا اور اس کے پُر شباب حوصلوں اور مذہبی ولولوں نے مطلقاً ان موانع کی پرواہ نہیں کی اور وہ صرف چند ہزار سواروں[1] کے ساتھ لوائے اسلام لئے ہوئے ہندوستان کی اس زمین میں داخل ہو گیا جہاں اس سے قبل کسی عرب جماعۃ نے مستقل قبضہ کرنے کا خیال پیدا نہیں کیا تھا

جس وقت محمد قاسم مکران ہوتا ہوا ساحلِ فارس پر پہونچا تو وہاں کا گورنر بھی اپنی سپاہ لے کر شریک ہو گیا اور منجنیقیں بھی محاصرہ کے لئے دریا کے راستہ سے دیبل[2] پہونچ گئیں

سنہ ۹۳ھ (۷۱۲ء) کے موسم بہار میں محمد قاسم نے خندقیں کھود کر منجنیقیں نصب کیں اور محاصرہ شروع کر دیا۔ بلاذری نے اس محاصرہ کا مفصل حال لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب نیزہ بازوں کے مختلف دستے اپنے اپنے جھنڈوں کے نیچے خندقوں کے کنارے قائم کر دئے گئے تھے، اور سب سے بڑی منجنیق سر کرنے کے لئے جس کا نام عروس تھا۔ ۵۰۰ آدمی متعین کئے گئے۔ شہر دیبل کے اندر ایک بہت بڑا مندر تھا اور اس پر سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا

۱؎ اس کے ساتھ ۶ ہزار سوار تھے اور اتنی ہی جماعۃ شتر سواروں کی تھی علاوہ ان کے تین ہزار اونٹ اور تھے جن پر فوج کا سامان رکھا جاتا تھا۔

۲؎ دیبل، کراچی، ٹھٹہ، لاہوری بندر۔ میر معصوم نے دیبل، ٹھٹہ، اور لاہوری بندر، کو ایک ہی مقام قرار دیا ہے، اسی طرح فرشتہ نے بھی لکھا ہے کہ قدیم دیبل موجودہ ٹھٹہ ہے۔ موجودہ عہد کے مورخین بھی اسی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ ایرانی بھی ٹھٹہ کے شمال کو "شمالِ دیبل" کہتے ہیں، لیکن کیا یہ خیال صحیح ہے؟ یہ امر ذرا بحث طلب ہے

دیبل یا دیول کے معنی ہیں مندر یا پرستش گاہ کے اور اس سے ظاہر ہے کہ یہاں کوئی مندر رہا ہو گا۔ پھر چونکہ مندر کے لئے ہمیشہ کوئی نمایاں اور مرتفع مقام اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ کسی ساحل پر منتخب کیا جاتا تھا (جیسے دوارکا و سومنات) اس لئے ظاہر ہے کہ وہ بھی ساحل پر واقع ہو گا۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب سراندیپ سے جہاز حجاج کے پاس تحائف لئے جا رہے تھے تو وہ مخالف ہوا کی وجہ سے ساحل دیبل پر پہونچ گئے تھے۔ پھر ٹھٹہ جو ساحل سے پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے کیونکر دیبل قرار دیا جا سکتا ہے

بلاذری نے بھی خلیج دیبل کا ذکر کرتے ہوئے ان جہازوں کا یہاں آنا بیان کیا ہے جو سپاہیوں اور منجنیقوں کو لیکر خلیج فارس سے سندھ پہونچے تھے۔ اسی طرح ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ دیبل سمندر کے ساحل پر ایک بڑا بندر ہے۔ صاحب مراصد الاطلاع نے بھی تحریر کیا ہے کہ دیبل ساحلِ بحرِ ہند کا مشہور بندر اور بڑی تجارت گاہ ہے۔ یہ اس جگہ واقع ہے جہاں لاہور اور ملتان کے دریا سمندر میں گرتے ہیں

اس سے یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ دیبل ساحل پر واقع تھا اور چونکہ ٹھٹہ ساحل سے بہت دور واقع ہے اس لئے دیبل اور ٹھٹہ دو جُدا مقامات قرار دئے جائیں گے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۵ پر دیکھئے)

انتظام یہ تھا کہ اس حملہ کے متعلق تمام خبریں روزانہ حجاج کے پاس بھیجی جاتی تھیں اور وہاں سے ہدایات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ جب محاصرہ کی یہ صورت قایم ہوگئی تو حجاج نے حکم بھیجا کہ منجنیق کی بلندی کو ذرا کم کر دیا جائے اور مندر کے اوپر جو جھنڈا ہے اُسے سب سے پہلے اُڑا دیا جائے۔ اس کی تعمیل کی گئی اور مندر کا جھنڈا منجنیق سے گرا دیا گیا چونکہ یہ جھنڈا بہت متبرک خیال کیا جاتا تھا اس لئے ہندوؤں میں اس کے گر جانے سے بددلی پیدا ہوگئی مسلمان زینہ لگا کر قلعہ پر چڑھ گئے اور شہر کے اندر پہونچکر قبضہ کر لیا۔ یہاں کا حاکم تو بھاگ گیا لیکن جنگ جو آبادی قتل کی گئی اور اسی وقت ایک مسجد کی طرح بھی وہاں ڈالی گئی

اس کے بعد محمد قاسم نے چار ہزار سپاہی دیبل میں چھوڑے اور خود بقیہ سپاہ کے ساتھ دریائے سندھ کی داہنے ساحل پر دشمن کی مرکزی فوج کی فکر میں روانہ ہوا۔ آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ دشمن کی چوکیاں دوسری طرف ہیں۔ اس لئے اس نے بہت سی کشتیاں ایک دوسرے سے باندھ کر پل سا تیار کرایا اور ان میں تیر اندازوں کو بٹھا کر دوسری طرف پہونچایا۔ دشمن نے کوشش کی کہ اسلامی فوج ساحل پر نہ اُتر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور مجبوراً اور تنگ پسپا ہونا پڑا جہاں سب سے پہلے عربوں نے ہندو سرداروں کی کثیر جماعت (جو آہن پوش ہاتھیوں پر سوار تھی) مقابلہ کے لئے آمادہ دیکھی داہر راجہ ان سب کا سردار تھا۔ محمد قاسم نے حکم دیا کہ تیروں کے ذریعہ سے روغن نفط ہاتھیوں پر پھینکا جائے۔ اس ترکیب سے ہاتھی ڈر کر بھاگے، ہودوں میں آگ لگ گئی اور راجہ داہر مارا گیا۔ داہر کی بہن نے تمام عورتوں کو جمع کیا اور گھروں میں آگ لگا کر سب کی سب وہیں جل کر خاک ہوگئیں۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۴)

اس بناء پر بعض کا خیال ہے کہ دیبل، ٹھٹھہ تو نہیں ہو سکتا لیکن ممکن ہے کہ وہ لاہوری بندر ہو چنانچہ تحفۃ الکرام میں صاف صاف لکھا ہے کہ جسے اب لاہوری بندر کہتے ہیں اُسے پہلے دیبل کہتے تھے، لیکن صاحب تحفۃ الکرام کا بیان تعیین مقامات کے مسئلہ میں کوئی سند نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ ایسے مسائل میں زیادہ تحقیق سے کام لیتا ہے، اس لئے صرف اس کے بیان پر اعتماد نہیں ہو سکتا علی الخصوص اسوقت جبکہ دیگر حالات اس کے منافی ہوں۔ بیرونی نے لکھا ہے کہ خلیج توران تیز اور دیبل کے درمیان واقع ہے اور خلیج توران سے ہٹ کر دریائے سندھ کے دو دہانے ہیں۔ چھوٹا دہانہ شہر لہورانی کے پاس ہے اور بڑا دہانہ کچھ کے قریب۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیبل اور لہورانی (جو بعد کو لاہوری بندر کہلایا جانے لگا) دو جدا مقامات تھے۔

اس لئے جب دیبل، ٹھٹھہ اور لاہوری بندر نہیں ہو سکتا تو حسب تحقیق مسٹر ایلیٹ سوائے موجودہ کراچی کے اور کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو قدیم جغرافیہ دانوں کے بیان کے مطابق دیبل قرار دیا جا سکے۔

برہمن آباد و ملتان کی فتح

اس کے بعد دوسری فتح برہمن آباد[1] میں ہوئی اور اب ملتان کا راستہ صاف ہوگیا، جہاں محاصرہ کرکے اس کو بھی مفتوح کرلیا۔ چونکہ ملتان فتح ہوجانے سے دریائے سندھ کی وادی پر پورا اقتدار مسلمانوں کا قائم ہوچکا تھا اور ہندو فرمانرواؤں نے وہاں کے لوگوں پر بہت مظالم کررکھے تھے اس لئے

---

[1] برہمن آباد، منصورہ، محفوظہ۔ فتوحاتِ عرب سے قبل زیریں حصہ سندھ کا دارالحکومت برہمن آباد تھا۔ اس مقام کا قدیم نام حسب روایت بیرونی، بہمنی یا بہمنوا تھا۔ اشکال البلاد میں "بامی دان" لکھا ہے ابن حوقل "تامی رامان" اور "مامی وان" لکھتا ہے۔ ادریسی نے "میرمان" مصنف چچ نامہ نے "بین واد" اور مصنف تاریخ طاہری نے "بین واہ" تحریر کیا ہے

عہدِ قدیم میں "دیبل" اور "نیرون" بھی حکومت برہمن آباد سے متعلق تھے لیکن اب سوال یہ ہے کہ برہمن آباد کہاں تھا اور اب بھی اس کے آثار کہیں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ برہمن آباد کے قلعہ میں کسی وقت چودہ سو برجیاں تھیں اور اب بھی اس کے کچھ نشانات باقی ہیں۔ لیکن سمت و مقام کا کوئی تعین نہیں کیا ہے

بعض محققین کا خیال ہے کہ برہمن آباد سے مراد کالاکوٹ ہے۔ چچ نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دریائے سندھ کے مشرقی جانب آباد تھا اس لئے حسب تحقیق مسٹر الیٹ کالاکوٹ اور ٹھٹہ کا قیاس غلط ہے بلکہ برہمن آباد وہیں یا اس کے قریب کسی جگہ پر واقع تھا جہاں اب حیدرآباد ہے

بلاذری کا بیان ہے کہ منصورہ، برہمن آباد سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اور محمد قاسم کے عہد میں برہمن آباد مٹ کر جنگل ہوگیا تھا، اس لئے گمان غالب ہے کہ منصورہ میں برہمن آباد کے کھنڈروں کا ایک حصہ ضرور شامل ہوگیا ہوگا چونکہ حیدرآباد ۸۰ فٹ مرتفع سطح کی پہاڑی پر واقع ہے اور اس سے زیادہ نمایاں مقام تعمیرِ دارالحکومۃ کے لئے اور کوئی نہ ہوسکتا تھا، اس لئے یہ ظن یقین میں تبدیل ہوجاتا ہے کہ برہمن آباد، منصورہ اور موجودہ حیدرآباد (سندھ) ایک ہی چیز ہیں۔ یا یہ کہ ایک ہی قطعہ زمین میں یہ تینوں شہر تعمیر ہوئے

حال ہی میں حیدرآباد سے ۴۷ میل شمالِ مشرق کی طرف ایک کھنڈر زمین سے برآمد ہوا ہے جسکی نسبت آثاریین کا خیال ہے کہ یہ برہمن آباد کی مسماریاں ہیں بہت سے سکے بھی منصور، عبدالرحمن، محمد، عبداللہ اور عمر کے عہد کے دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ کوئی ہندوؤں کا سکہ برآمد نہیں ہوا ہے اس لئے اس کو برہمن آباد یقین کرنے میں تامل ہوسکتا ہے

محفوظہ کا صحیح مقام نہیں معلوم ہوسکا سوائے اس کے کہ ابن حوقل اور بیرونی اس کے جائے وقوع کو دریائے سندھ کی مشرقی دلدل سے اور منصورہ کو مغربی دلدل سے متعلق کرتے ہیں۔ سلطان فیروزشاہ کے عہد میں امیر ناصر نے ایک شہر ناصرپور کے نام سے سندھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ ناصرپور یا تو محفوظہ ہی کا دوسرا نام ہے یا اسی جگہ دوسرا شہر تعمیر کراکے اس کا نام ناصرپور رکھدیا گیا۔

جاٹ[1]، مید اور دوسری قومیں اظہار اطاعت میں ڈھول اور گھنٹیاں بجاتی ہوئی حاضر آئیں اور مطیع ہوگئیں، محمد قاسم نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اسلام کا حکم ہے، یعنی ان سے جزیہ وصول کر کے ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی اور ان کے تمام معابد بدستور باقی رکھے گئے علاوہ اس کے برہمنوں کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے اور جزیہ وصول کرنے والے، وہیں کی آبادی سے مقرر کئے گئے

مسلمانوں کی رواداری

محمد قاسم نے اپنے تمام افسران کو نہایت سختی سے حکم دیا کہ راعی و رعایا کے درمیان پوری ایمانداری کا طرز عمل اختیار کیا جائے جو جس کا حصہ ہے دیانت سے دیا جائے، محصول اتنا مقرر نہ کیا جائے جو لوگوں کے لئے بار ہو اور نہ کسی کو کوئی تکلیف پہونچائی جائے۔

محمد قاسم کی واپسی

اسی زمانہ میں حجاج کا انتقال ہوگیا اور خلافت بھی بدل گئی جو حجاج کی مخالف تھی، اس لئے محمد قاسم کو واپس جانا پڑا اور نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اس نے اپنی ہلاکت کے حکم کو منظور کرلیا

اس میں شک نہیں کہ عربوں کا سندھ فتح کر لینا تاریخ ہند کے اہم واقعات میں سے ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ خود مرکز خلافت میں اختلاف باہمی کی وجہ سے ضعف پیدا ہوگیا تھا اور محمد قاسم کے بعد کوئی مہم اس طرف ایسی روانہ نہیں کی گئی، جو فتوحات کے سلسلہ کو سندھ کے ریگستانوں سے آگے بڑھا دیتی۔ بالآخر جو جماعت مسلمانوں کی یہاں رہ گئی تھی اس میں بھی اس قدر ضعف پیدا ہوگیا کہ بیس سال بعد انھیں خود اپنی حفاظت و پناہ کے لئے ایک خاص شہر محفوظہ کے نام سے بنانا پڑا اور خلفاء بغداد نے سندھ کے قبضہ کو غیر مفید سمجھ کر اس طرف توجہ نہ کی

---

[1] جاٹوں اور میدیوں کا حال ۔ جب مسلمان اول اول سندھ میں آئے تو یہاں دو قومیں کثرت سے آباد تھیں جاٹ اور مید اور ان دونوں میں سخت اختلاف تھا۔ میدوں کا اصلی مسکن پنجاب تھا اور جاٹوں کا سندھ (ہر چند اب جاٹ پنجاب کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں اور تقریباً اکثر مسلمان ہیں)

میدوں کا ذکر عرب مورخین نے اکثر جگہ کیا ہے۔ مجمل التواریخ میں جاٹ اور مید قوموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ حام بن نوح کی اولاد میں سے شمار کئے جاتے تھے اور دریائے سندھ کے ساحل پر آباد تھے میدیوں اور جاٹوں میں اکثر لڑائی رہا کرتی تھی مجبوراً رفع فساد کی غرض سے ان دونوں نے اتحاد کر کے دریودھن بادشاہ ہستناپور کے پاس ایک وفد روانہ کیا کہ کوئی حکمران ان کے اوپر مقرر کرے چنانچہ اس نے اپنی بہن دھسلا کو وہاں حکومت کرنے کے لئے متعین کیا، اسی سلسلہ میں تیس ہزار برہمن بھی ہندوستان سے منتقل ہو کر سندھ میں آباد ہوگئے۔

عہدِ عرب میں سندھ کا زوال

بعد کو مستعمرین عرب نے یہاں ملتان اور منصورہ میں علٰحدہ علٰحدہ خود مختار حکومتیں قایم کرلیں۔ اور جب چوتھی صدی ہجری کے ابتدا میں مسعودی[1] یہاں آیا ہے تو قبیلۂ قریش کا ایک خاندان اس جگہ حکمراں تھا۔ اس کے چند دن بعد ایک اور سیاح ابن حوقل[2] سندھ میں آیا اس نے لکھا ہے کہ "اس وقت سندھ میں عربی اور سندھی زبان بولی جاتی تھی اور ہندو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلق پایا جاتا تھا"

اس کے بعد جب مصر میں خلفاء کا عروج ہوا تو قرامطہ وہاں سے بھاگ کر یہاں آئے اور ملتان میں پناہ گزیں ہوئے لیکن محمود غزنوی کے حملہ نے ان کی قوۃ کو بھی گھٹا دیا اور اس طرح سندھ کی تاریخ کو بھی اپنے کارناموں میں شامل کرلیا جو ہندوستان کے اندر عجیب و غریب انقلاب پیدا کرنے والے تھے

یہ تھا اجمالی بیان مسلمانوں کے حملۂ سندھ کا۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ حملہ کی ابتدا سے یہاں کون کون سے گورنر خلافت کی طرف سے متعین کئے گئے یہاں کی حکومتِ اسلام میں کیونکر آہستہ آہستہ زوال شروع ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے۔

---

[1] مروج الذہب (مسعودی)۔ کے مصنف کا نام ابوالحسن ہے اور مسعودی کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ اسکے مورثِ اعلیٰ کا نام مسعود تھا (وہی مسعود جن کے لڑکے عبداللہ نے آنحضرت کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی) مسعودی کی زندگی زیادہ تر سیر و سیاحت میں بسر ہوئی۔ قریب قریب تمام وہ مقامات جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اس نے جاکر دیکھے۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ اس نے مغرب (مراکش و ہسپانیہ) کا سفر اس قدر کیا کہ مشرق کو بھول گیا اور مشرق (چین) میں اتنی سیاحت کی کہ مغرب فراموش ہوگیا۔ یہ فطرتاً نہایت غایر مطالعہ کرنے والا سیاح تھا۔ اسی کی سیاحت کا نتیجہ "مروج الذہب" ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ "مسعودی نے مشرق و مغرب کے ان اقوام و ممالک کے حالات لکھے ہیں جو اس کے زمانہ (یعنی سنہ ۳۳۰ھ میں پائے جاتے تھے) اس نے اقوام کے مراسم، ممالک کا جغرافیہ، وہاں کے پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، سلطنتوں اور مشہور خاندانوں کے حالات لکھے ہیں۔ اور تمام مورخین ابعد اس کا تتبع کرتے ہیں"

[2] اشکال البلاد یا کتاب المسالک والممالک (ابن حوقل)۔ ابن حوقل کا اصلی نام محمد ابوالقاسم تھا۔ یہ بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس کے کم سنی ہی زمانہ میں خلافتِ بغداد ختم ہوکر ترکوں کے قبضہ میں جاچکی تھی۔ جب یہ جوان ہوا تو اس نے معلوم کیا کہ اس کی تمام جائداد ضایع ہوچکی ہے اس لئے اس نے سیاحت و تجارت کو اپنا کسب معاش کا ذریعہ قرار دیا۔ اس نے ۳۳۱ھ / ۹۴۳ء میں بغداد کو خیرباد کہا اور بہت سی مسلمان حکومتوں کی سیاحت کرکے ۳۵۸ھ / ۹۶۸ء میں اپنے وطن واپس گیا۔ اس کے دوسرے سال وہ افریقہ گیا اور ۳۶۶ھ / ۹۷۶ء میں اس نے اپنی تصنیف مکمل کی۔ اس نے بھی اپنی کتاب کا وہی نام رکھا جو اصطخری نے رکھا تھا ابن حوقل لکھتا ہے کہ "اصطخری کی تصنیف ہر جگہ میرے ساتھ رہی ہے"

خلفائے راشدین کے عہد میں عربوں کے حملے سندھ پر

(۲)

جب خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق (۱۳ھ-۲۳ھ / ۶۳۴ء-۶۴۴ء) نے عثمان ابن ابی العاص ثقفی کو بحرین و عمان کا حاکم مقرر کیا تو انھوں نے اپنے بھائی حکم (ثقفی) کو بحرین کی حکومت سپرد کر کے حکم دیا کہ ساحل ہند پر حملہ کریں چنانچہ آپ نے کشتیوں کے ذریعہ سے دریائی سفر کی سخت و صعب منزلیں طے کر کے سب سے پہلے ۱۵ھ/۶۳۶ء میں تھانہ[1] پر حملہ کیا اور اس کے بعد بھروچ[2] پر جو اس زمانہ میں نیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا سب سے پُر رونق بندر تھا۔ تاخت کے علاوہ اس نے اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل کی طرف روانہ کیا جو سندھ کا مشہور مقام تھا یہ تینوں حملے ۱۵ھ اور ۱۶ھ کے درمیان ہوئے

صاحب "فتوح البلدان"[3] کا بیان ہے کہ "ان حملوں میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی"۔

---

[1] فتوح البلدان (بلاذری) میں اس کو تانہ لکھا ہے اب تھانہ مضافات بمبئی کا مشہور مقام ہے لیکن اسوقت بمبئی کا وجود کہیں نہ تھا۔ بلکہ تھانہ (تانہ) ہی با رونق و آباد بندر تھا۔

[2] معجم البلدان (حموی) اور دوسری عربی کتابوں میں بھروچ کو بروج اور بروص لکھا ہے۔

[3] فتوح البلدان کے مصنف کا نام احمد بن یحییٰ بن جابر تھا۔ اس کی عرفیت ابو جعفر اور ابو الحسن تھی لیکن عام طور سے بلاذری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری میں عباسی خلیفہ المتوکل کے دربار سے متعلق تھا اور شاہزادگان کی خدمت اتالیقی اس کے سپرد تھی۔ اس کا انتقال ۲۷۹ھ/۸۹۲ء میں ہوا۔ ابو المحاسن کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد خلیفہ المعتمد میں بھی بغداد میں رہتا تھا۔ اس کتاب میں (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) عربوں کی وہ فتوحات درج ہیں جو شام و عراق، مصر و ایران، آرمینیا و ماوراء النہر، افریقہ و ہسپانیہ و سندھ میں انھیں حاصل ہوئیں۔ یہ کتاب عربی کی قدیم ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔ تاریخ طبری اس کے بعد بغداد ہی میں تحریر ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طبری اس سے واقف نہیں تھا کیونکہ بہت کچھ جو بلاذری میں درج ہے تاریخ طبری میں نظر نہیں آتا۔ علاوہ بلاذری کے واقدی نے بھی ان فتوحات کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جو اب تاریخ واقدی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن واقدی کی فتوح السندھ البتہ کمیاب ہے، بلاذری نے واقدی کا حوالہ کہیں نہیں دیا ہے۔

بلاذری خود سندھ نہیں آیا بلکہ یہاں کے حالات اس نے دیگر معتبر مصنفین کی کتابوں سے حاصل کئے اور کچھ زبانی روایات سے انھیں لوگوں میں سے ایک شخص ابو الحسن علی بن محمد المدائنی تھا جس سے خود بلاذری نے مل کر گفتگو کی تھی۔ بلاذری نے منصور ابن حاتم اور اس کی تاریخ سندھ کا بھی ذکر کیا ہے اور ابن الکلبی کی تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ علاوہ فتوح البلدان کے بلاذری نے کتاب البلدان بھی لکھی اور اقوام عرب کے سلسلۂ نسب پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور علاوہ ان کے متعدد کتابیں فارسی سے بھی ترجمہ کیں۔ بلاذری شاعر بھی تھا۔ ابن حوقل و مسعودی وغیرہ (قدیم ماہرین جغرافیہ عرب) نے بحیثیت شاعر ہونے کے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اُس کی تاریخ کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ البتہ ابن اثیر نے ۲۵۵ھ اور ۲۷۹ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے بلاذری کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ اسکو بلاذری اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بلاذر (ایک منشی چیز) کا عادی تھا۔

چچ نامہ[1] میں لکھا ہے کہ "مغیرہ شہید ہوئے" (یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی دوسری تاریخیں

---

[1] چچ نامہ، عام طور سے اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں چچ برہمن کی حکومت اور عربوں کی فتوحاتِ سندھ کا حال درج ہے۔ اصل کتاب کی ابتدا و اخیر میں اس مجموعہ کو فتح نامہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مسٹر الفنسٹن نے اپنی تاریخ میں اس کا نام تاریخ ہند و سندھ رکھ لیا ہے اور نور الحق مصنف زبدۃ التواریخ اور نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری" اسے منہاج المسالک کہتے ہیں۔

اصل کتاب عربی میں تھی جسے محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ناصر الدین قباچہ کے عہد میں فارسی زبان میں منتقل کیا مترجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصائب زمانہ سے گھبرا کر اپنے وطن چھوڑنے اور اوچ آنے پر مجبور ہوا سنہ ۶۱۲ھ / ۱۲۱۶ء میں اس کی عمر ۵۸ سال کی تھی اور صرف چند کتابیں اس کی انیس تھیں۔ اسی خلوت نشینی کے زمانے میں اُسے محمد قاسم کی فتوحاتِ سندھ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور آلور و بھکر گیا۔ یہاں پہونچ کر یہ اسماعیل بن علی سے ملا جو عثمان ثقفی کی اولاد میں سے تھے یہ اپنے عہد کے بڑے فاضل شخص تھے انھوں نے کہا کہ میرے پاس ایک کتاب فتوحاتِ عرب کے متعلق عربی زبان میں موجود ہے جو میرے کسی بزرگ کی لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ کتاب معلومات سے لبریز تھی اس لئے محمد بن حامد بہت خوش ہوا اور اس کا ترجمہ فارسی میں کر کے قباچہ کے وزیر کے نام منسوب کیا جس کا نام وہ پورے خطابات و مناقب کے ساتھ "صدر جہاں، دستور صاحبقران، عین الملک حسین ابن ابوبکر بن محمد الاشعری" لکھتا ہے چونکہ اسی وزیر کے اجداد میں ابو موسیٰ اشعری فاتح خراسان و عجم بھی تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ عین الملک سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص اس انتساب کے لئے نہ ہو سکتا تھا۔ محمد عوفی نے اپنی مشہور کتاب لباب الالباب کو بھی اسی وزیر (عین الملک) نام سے منسوب کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمہ میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے اُن کی کوئی تشریح نہیں کی جس سے ان کا جائے وقوع معلوم ہو سکے۔ اس نے اوچ، آلور، اور بھکر وغیرہ میں اپنا پایا جانا بیان کیا ہے جو غالباً دریائے سندھ کے زیریں حصہ کے شہر تھے لیکن اب اُن کی جگہ متعین کرنا بہت دشوار ہے۔

اصل عربی کتاب کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس زمانہ میں مرتب کی گئی تھی لیکن تاریخ کے لحاظ سے اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کتاب قاضی اسماعیل کے پاس سے دستیاب ہوئی تھی جن کا سلسلۂ نسب عثمان ثقفی سے ملتا ہے اور فاتح سندھ بھی اسی قبیلہ سے متعلق تھا (قبیلۂ ثقیف، طائف کا نہایت مشہور قبیلہ تھا) چونکہ اس کتاب میں شہر منصورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جو خلیفہ منصور کے عہد میں (سنہ ۱۳۶ھ) میں تعمیر کیا گیا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ تصنیف سنہ ۱۱۳ھ سے قبل ہوئی ہوگی۔

اس کتاب میں فتوحاتِ محمد قاسم کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور کثرت سے اس عہد کے مختلف شہروں کے نام دئے گئے ہیں جو ماہرینِ جغرافیہ کے لئے کافی اسباب جستجو رکھتے ہیں۔

نظام الدین احمد، نور الحق، فرشتہ، میر معصوم وغیرہ نے فتوحاتِ سندھ کے متعلق اس سے بہت مدد لی ہے۔

مثلاً تحفۃ الکرام[1]، تاریخ معصومی[2]، تاریخ طاہری[3]، بیگ لر نامہ[4]، ترخان نامہ[5] (ارغون نامہ) چونکہ اکثر و بیشتر چچ نامہ سے

---

[1] تحفۃ الکرام (مصنفہ علی شیر قانع) کی تین جلدیں ہیں۔ اول جلد کے پہلے حصہ میں انبیاء و ملوک کے علاوہ عہد نبوی کے علماء و حکماء کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں عہد نبوی و خلفائے راشدین کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کا بیان ہے۔ دوسری جلد میں ایک عمومی بحث تمام امراء و ملوک، وزراء و علماء وغیرہ سے کی ہے تیسری جلد میں سندھ کی تاریخ لکھی ہے۔

ہر چند ابتدائی تاریخ سندھ کے متعلق اس میں میر معصوم کی تاریخ سندھ کی طرح مفصل طور سے بحث نہیں کی گئی ہے لیکن پھر بھی بہت سی ایسی باتیں اس میں ملتی ہیں جو تاریخ معصومی میں نہیں ہیں۔

تحفۃ الکرام میں تاریخِ سندھ کی ابتداء اُن برہموں کے حالات سے کی گئی ہے جو قبل فتوحات عرب وہاں پائے جاتے تھے اس کے بعد فتوحات کا ذکر کیا ہے جو بالکل چچ نامہ سے ماخوذ ہے اس کے بعد اُن سمرا اور سما خاندان کے گورنروں کا حال ہے جو فرمانروایان دہلی کی طرف سے یہاں مامور تھے پھر قبایل ترخان اور ارغون کی تاریخ درج کی ہے اور اس کے بعد گورنرانِ تیموریہ و خاندان کلہوارہ کا حال لکھ کر نصف جلد میں تاریخِ سندھ کو ختم کر دیا ہے۔ باقی نصف حصہ میں اس عہد کے مشایخ و سادات، اولیاء و علماء کا ذکر ہے۔

تاریخ اختتام تصنیف ایک جگہ ۱۱۸۱ھ درج کی گئی ہے اور دوسری جگہ ۱۱۸۸ھ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس سنہ کے حالات اس میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف تحفۃ الکرام نے جواہر الاولیاء، حدیقۃ الاولیا، معلومات الآفاق، کا حوالہ دیا ہے، ایک کتاب اسی نام کی جلال الدین سیوطی کی بھی ہے جو اس سے بالکل جدا تصنیف ہے۔

[2] (تاریخ معصومی)۔ سندھ کی تمام تاریخوں میں تاریخ معصومی سب سے زیادہ مفصل تاریخ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں نہ صرف فتوحاتِ اہلِ عرب کا حال درج ہے بلکہ عہد اکبری تک کی تاریخ سندھ اس میں پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے چار طبقے ہیں۔ طبقۂ اول میں راجہ داہر کی وفات تک کا حال درج ہے دوسرے طبقہ میں سندھ کی تاریخ زیر حکومت شاہان دہلی لکھی ہے۔ ہارون الرشید اور محمود غزنوی کے درمیان جو دو صدی کا زمانہ گزرا ہے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ سندھ کا کیا حال تھا۔ اسی طبقہ میں حملۂ تیمور کے بعد سمرا اور سما خاندانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ تیسرے طبقہ میں ارغون خاندان کی تاریخ درج ہے اور ہمایوں جب آگرہ سے بھاگ کر سندھ پہونچا تھا، اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ چوتھے طبقہ میں وہ حالات لکھے ہیں جن کی بناء پر سندھ اکبر کے قبضہ میں آیا۔ اسی طبقہ میں اُس نے اپنی اور اکبر کی ملاقات اور ضلع بھکر میں عطائے جاگیر کا بھی ذکر کیا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۳-۴-۵- صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ ہو)

ماخوذ ہیں اس لئے ان سب کا بیان وہی سمجھنا چاہئے جو چچ نامہ کا ہے۔) یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحۂ ۴۱)

محمد معصوم المتخلص بہ نامی، بھکر میں پیدا ہوا جو سندھ کا ایک شہر تھا۔ اس کا باپ صفائی حسینی باشندۂ کرمان تھا۔ یہ نہایت قابل شخص تھا اور عہد اکبر و جہانگیر میں اس نے کچھ امتیاز بھی حاصل کر لیا تھا یہ اپنے عہد کا اچھا تاریخ داں اور مشہور خوشنویس تھا

محمد معصوم نے تاریخ سندھ سنہ ۱۶۰۰ء میں مرتب کی اور فتوحات اعراب کے متعلق صرف چچ نامہ کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ بعد کو مورخین (مثلاً بدایونی، حیدر رازی، صاحب ماثر الامرا، تحفۃ الکرام، باغ مانی و مراۃ دولت عباسی نے) تاریخ معصومی سے استفادہ کیا ہے۔

۳۔۵ تاریخ طاہری کا مصنف میر طاہر محمد نسیانی ابن سید حسین ساکن ٹھٹھا تھا مصنف کا خاندان ارغون اور ترخان خاندانوں سے سلسلۂ ملازمت رکھتا تھا۔ چنانچہ طاہر محمد نے اپنی کتاب کو شاہ محمد بیگ عادل خاں کے نام سے منسوب کیا ہے جو شاہ بیگ عادل خاں ارغون گورنر قندھار کا بیٹا تھا (صاحب تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ شاہ بیگ ارغون نہیں تھا بلکہ ترخانی تھا اور اُسی کے نام سے تاریخ طاہری منسوب کی گئی تھی)

مصنف نے جو دیباچہ میں اپنے اور اپنے خاندانوں کے حالات لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۵ھ میں جب قندھار پر فارسیوں نے حملہ کیا تو طاہر محمد اپنی تعلیم پوری کرنے کے لئے ٹھٹھا آیا (اسوقت اس کی عمر ۱۵ سال کی تھی) اور مولانا اسحاق کا شاگرد ہوگیا جو اسوقت کے مشہور عالم و صوفی تھے۔

جب ہمایوں، شیر شاہ سے شکست کھا کر بھاگا تو اُس کے نانا عمر شاہ اور ماموں داؤد سہٹا نے جو دوربیلا میں رہتے تھے، ہمایوں کو بہت مدد دی اور ہمایوں نے خوش ہو کر ایک پروانہ لکھا کہ اگر میں کامیاب ہو کر پھر تخت نشین ہوا تو دوربیلا ان کی جاگیر میں دیدیا جائے گا لیکن افسوس ہے کہ محمود خاں گورنر بھکر کے اشارہ سے عمر شاہ ایک کھال کے اندر بند کرکے دریا میں ڈال دیا گیا اور داؤد بھی قتل کیا گیا۔ اس خاندان کے بقیہ افراد ڈر کے مارے احمد آباد بھاگ گئے اور یہ پروانہ ضایع ہوگیا۔

طاہر محمد نے شکایت کی ہے کہ جس عہد کی وہ تاریخ لکھنا چاہتا تھا اس کے ابتدائی حالات کے متعلق اُسے کوئی کتاب باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن بعد کے حالات اُس نے تفصیل سے لکھے ہیں جو اُسے اپنے باپ کے ذریعہ سے معلوم ہوئے۔

تاریخ طاہری سنہ ۱۶۲۱ء ۱۰۳۰ھ میں ختم ہوئی جبکہ مصنف کی عمر چالیس سال کی تھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دس طبقات میں تمام ہوئی ہے لیکن صرف سات طبقات کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ طبقۂ اول جو صرف ۱۶ صفحات کا ہے سمرا خاندان سے متعلق ہے۔ دوسرا دس صفحات کا سما خاندان سے، تیسرا تیس صفحات کا ارغون خاندان سے اور باقی طبقات میں ترخان خاندان کے حالات اسوقت تک کے درج ہیں جب مرزا غازی بیگ کو سنہ ۱۰۲۱ھ میں بمقام قندھار زہر دیکر مار ڈالا گیا اور ترخانیوں کی حیثیت صرف جاگیرداروں کی سی رہ گئی۔ سندھ میں عرب حکومت کا کوئی حال اس کتاب میں درج نہیں ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۴۔ ۵۔ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہوں)

پچ برہمن حکمراں تھا اس کے چند دن بعد ابوموسیٰ اشعری جو صحابۂ رسول میں سے تھے گورنر عراق (بصرہ) مقرر ہوئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۴- ۵ صفحہ ۴۱- ۴۲)

سکھ (بیگ لرنامہ) شاہ قاسم خاں ولد امیر سید قاسم بیگ کے نام سے منسوب ہے اسی لئے اس کو بیگ لرنامہ کہتے ہیں۔ یہ بالکل نہیں معلوم ہوسکا کہ اس کا مصنف کون تھا، سوائے اس کے کہ وہ اپنے مربی، بیگ لر کا ملازم تھا۔ بیگ لر، شاہ قاسم خاں کے خاندان کا موروثی لقب تھا۔ اس لئے ترکی اور فارس کا وہ خاندان بیگ لربیگ جس کے اکثر افراد اسوقت گورنری کے عہدوں پر ممتاز تھے دوسرا تھا۔ خاندان بیگ لر کئی پشتوں تک ترمز میں رہا، وہاں سے سمرقند آیا اور پھر یہاں سے سندھ آگیا۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب حضرت علی مرتضےٰ سے ملتا ہے چونکہ بیگ لر خاندان کے بعض افراد کا قیام اتفاق سے ایک ہی جگہ ہوگیا تھا۔ اس لئے ان دونوں خاندانوں میں ارتباط قایم ہوگیا۔

ایرشید قاسم بیگ، شاہ حسین ارغون کے عہد میں، سمرقند سے سندھ آیا اور رانا امرکوٹ کی بھتیجی سے شادی کرلی۔ اسی مواصلت سے شاہ قاسم پیدا ہوا اور اُسی کے نام یہ کتاب منسوب کی گئی۔

بیگ لرنامہ میں پہلے مختصر بیان عربوں کی فتوحاتِ سندھ کا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ارغون خاندان کے حالات مختصر بیان کئے گئے ہیں اور پھر امیر قاسم بیگ کے مفصل حالات سے بحث کی ہے۔ عہدِ امیر قاسم میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں اور جو جو واقعات پیش آئے اُن کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے، صحیح تاریخ تصنیف کی کوئی معلوم نہیں ہوسکی۔

شہ ترخان نامہ کو ارغون نامہ بھی کہتے ہیں، اس کا مصنف سید جمال ابن میر جلال الدین حسین شیرازی تھا یہ کتاب ۱۰۶۵ھ ۱۶۵۴ء میں لکھی گئی۔ اس تصنیف میں ارغون اور ترخان (مغل خاندانوں) کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور مرزا محمد صالح کے نام سے منسوب ہے جو ترخاں خاندان سے متعلق تھا۔

مرزا محمد صالح چاہتا تھا کہ مغل خاندانوں سے واقف ہوجائے اور خصوصیت کے ساتھ اپنے خاندان کے حالات معلوم کرے اس لئے اس نے سید جمال سے کہا کہ ترخان نامہ مہیا کرنا چاہئے (معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل اس نام کی کوئی کتاب مرتب ہوچکی تھی) لیکن باوجود تلاش کے ایسی کوئی کتاب نہیں ملی اور سید جمال نے یہ کتاب مرتب کی جس میں طبری، روضۃ الصفا، ظفرنامہ، تاریخ ہمایوں، اکبرنامہ، نگارستان، تاریخ طاہری، منتخباتِ بے بدل یوسفی، تاریخ گزیدہ، اور مجمع الانساب، وغیرہ سے مدد لی گئی ہے اور تاریخ معصومی کو خاص طور سے ماخذ بنایا گیا ہے۔

مرزا محمد صالح، مرزا عیسیٰ ترخاں کا بیٹا تھا (مرزا عیسیٰ ترخاں پوتا تھا اس کا جو ترخاں خاندان سندھ کا مورثِ اعلیٰ تھا) مرزا عیسیٰ ۱۰۱۲ھ میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی بہت عزت کی گئی۔ جب شاہجہاں کا عہد آیا تو اس کو ایک لاکھ روپیہ کی رقم معہ نوبت کے جو نشان اعزاز ہے مرحمت ہوئی۔ بعد کو گجرات کا صوبہ دار بنادیا گیا اور ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵ ونمبر ۱ صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

اور خلیفۂ دوم نے ان سے ہندوستان کے حالات دریافت کئے اُنھوں نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا۔ اور

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵ و نمبر ۱ صفحہ ۴۳)

مرزا محمد صالح کو بھی اس کے بعد اپنے باپ کی عزت کا کچھ حصہ ملا اور اس خاندان کے اور لوگوں کی بھی جاگیر مقرر ہوگئی۔

ترخان نامہ میں سب سے پہلے محمد صالح کا شجرۂ نسب درج ہے جو نوح تک پہونچتا ہے اس کے بعد خواتینِ ترکستان اور چنگیز خاں کے مختصر تاریخ درج کر کے ارغون اور ترخان خاندان کے حالات مرزا عیسیٰ ترخاں کی وفات تک درج کئے گئے ہیں۔

۱؎ چچ ایک معمولی برہمن تھا جو ساہسی فرمانروائے سندھ کے دربار میں ملازم ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا اقتدار بڑھتا گیا یہاں تک کہ ساہسی کے مرنے پر اس نے ساہسی کی بیوی سے شادی کرلی اور سندھ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لیلی۔ چونکہ فرمانروائے جے پور (یا چتوڑ) ساہسی کا عزیز تھا اس لئے اس نے چچ کے خلاف لشکر کشی کی۔ مگر چچ نے مکروفریب سے کام لے کر کامیابی حاصل کرلی اور بدستور سندھ کا حکمراں رہا۔

تحقیق طلب یہ ہے کہ چچ کس زمانہ میں تھا۔ ایک جگہ چچ نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۲ھ کے قریب (چچ کی تخت نشینی کے چوتھے سال) چچ نے یہ معلوم کرکے کہ فارس میں ایک عورت حکمراں ہے کرمان کی طرف فوج کشی کی تھی۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب مغیرہ نے سنہ ۱۳ھ اور سنہ ۱۶ھ کے درمیان حملہ کیا تو چچ کی حکومت کو ۳۵ سال ہو چکے تھے اور جب چچ ۴۰ سال تک حکومت کر چکا تو اس کا بھائی چندر حکمراں ہوا جو صرف آٹھ سال کے بعد مرگیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا داہر تخت نشین ہوا جو سنہ ۹۳ھ میں محمد قاسم (مشہور فاتح سندھ) کے مقابلہ میں مارا گیا۔

تحفۃ الکرام لکھتا ہے کہ (۱) چچ راجہ چتوڑ کو قتل کرنے کے بعد سنہ ۱ھ میں تخت نشین ہوا اور کل چالیس سال تک اس نے حکومت کی (۲) اس کے بعد چندر حکمراں ہوا اور اپنی حکومت کے آٹھویں سال مرگیا (۳) اس کے بعد داہر حکمراں ہوا جو ۳۳ سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۹۳ھ میں مارا گیا (۴) اس برہمن خاندان نے سندھ میں ۹۲ سال تک حکومت کی۔ اس بیان کی غلطی ظاہر ہے کیونکہ حساب سے صرف ۸۱ سال ہوتے ہیں۔

اس غلطی کا ازالہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ چچ نامہ میں جو یہ لکھا ہے کہ "مغیرہ کے حملہ کے وقت چچ کی حکومت کو ۳۵ سال ہو چکے تھے" اس میں بجائے ۳۵ کے ۳ یا ۵ پڑھا جائے اور چچ کے حملۂ کرمان کے وقت جو سنہ درج کیا گیا ہے وہ بجائے دو کے دہ (۱۰) قرار دیا جائے۔ اس امر کا ثبوت کہ یہاں سنہ ۲ھ کے بجائے سنہ ۱۰ھ صحیح ہے اس سے بھی ملتا ہے کہ سنہ ۲ھ میں تخت ایران پر کوئی عورت حکمراں نہ تھی۔ خود چچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ ملکہ کسریٰ بن ہرمز (یعنی خسرو پرویز) کی جانشین تھی اور یہ صحیح ہے کہ خسرو کے بعد اسکی دو بیٹیوں (دخت زنان و توران دخت) نے دو تین سال تک حکومت کی۔ لیکن طبری نے دخت زنان کا عہد حکومت سنہ ۱۳ھ اور صاحب روضۃ الصفا نے توران دخت کا زمانۂ حکمرانی سنہ ۱۲ھ لکھا ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ ہو)

حضرت عمرؓ نے نہ صرف ہندوستان کی طرف پیشقدمی کی ممانعت کر دی بلکہ تمام بحری تاختوں کو ممنوع قرار دیا[1]۔

جب حضرت عثمانؓ (سنہ ۲۳-۳۵ھ / ۶۴۴-۶۵۵ء) خلیفہ ہوئے اور بجائے ابوموسیٰ اشعری کے عبداللہ بن عامر گورنر بصرہ مقرر کئے گئے تو انھوں نے خلیفہ سے اجازت لے کر حاکم بن جبلہ کو ملک ہند و سندھ کا حال دریافت کرنے کے لئے مامور کیا لیکن انھوں نے بھی واپسی میں مایوس کن حالات بیان کئے اور اس طرف بڑھنے کا خیال ترک کر دیا گیا[2]۔

خلافت حضرت علیؓ (سنہ ۳۵-۴۰ھ / ۶۵۵-۶۶۰ء) میں البتہ تاغر بن داعر کی سرکردگی میں ایک مہم (آخر سنہ ۳۸ھ میں) روانہ کی گئی[3] جو بہرج اور کوہ پایہ کی طرف سے، راستہ میں فتوحات و مال غنیمت حاصل کرتی ہوئی کوہ قیقان[4] یا قیقانان پہونچی دشمنوں نے بیس ہزار کی جمعیت سے مقابلہ کیا لیکن حارث بن مرہ نے جو لشکر اسلام کا ایک بڑا جوانمرد افسر تھا دشمنوں کو شکست دی[5]۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴)

اس لئے ظاہر ہے کہ جب چچ نے کرمان پر حملہ کیا ہوگا تو ان دونوں عورتوں میں سے کسی کا زمانۂ حکومت رہا ہوگا۔ اس لئے تاریخ وار حسب ذیل نقشہ کو صحیح سمجھنا چاہیے :-

چچ کی تخت نشینی سندھ میں	سنہ ۱ھ	چچ کی وفات (۴۰ سال حکومت کرنے کے بعد)	سنہ ۵۱ھ
کرمان پر حملہ	سنہ ۱۴ھ	چندر کی وفات (تخت نشینی کے آٹھویں سال)	سنہ ۵۹ھ
مغیرہ کا حملہ	سنہ ۱۵ھ	داہر کی وفات (۳۳ سال حکومت کرنے کے بعد)	سنہ ۹۳ھ

[1] چچ نامہ صفحہ ۷ — [2] تحفۃ الکرام صفحہ ۹ و بلاذری ۱-۱۱۶۔

[3] بلاذری نے بھی اسی مہم کا ذکر کیا ہے لیکن افسر فوج حارث بن مرہ کو قرار دیا ہے۔

[4] قیقانان، قیقان، کیکانان چچ نامہ میں درج ہے کہ رائے خاندان کی حکومت چچ برہمن سے پہلے، سندھ میں قروان اور قیقانان کے پہاڑوں تک وسیع تھی۔ اس کے بعد سنہ ۳۸ھ میں بہروج اور کوہ پایہ ہوتے عربوں کا قیقانان تک پہونچنا ظاہر کیا گیا ہے جہاں انھیں شکست دی۔ بلاذری لکھتا ہے کہ قیقان، خراسان کی طرف سندھ کا ایک حصہ ہے دوسری جگہ قیقان کو ترکوں کا مستقر ظاہر کرتے ہوئے ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہونا ظاہر کرتا ہے۔ ابن حوقل وغیرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیقان ضلع توران کا ایک شہر تھا جس میں قصدان کا گورنر رہا کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیقان شہر بھی تھا اور ایک صوبہ کا بھی نام تھا۔ بعض چینی سیاحوں کے بیان سے واضح ہے کہ قیقان کابل کے جنوب میں واقع تھا۔ ان تمام بیانات سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ مشرق میں حدود ملتان تک وسیع تھا اور دوسری طرف اس کا سلسلہ کوہ سلیمان تک پہونچتا تھا۔

[5] بلاذری نے بھی اس فتح کا حال لکھا ہے لیکن آخر میں لکھتا ہے کہ سنہ ۴۲ھ میں تمام مسلح افواج کوہ قیقان کے قریب کام آئی۔

بنی امیہ کے عہد میں عرب و سندھ کے تعلقات (۴۱ - ۱۳۲ھ = ۶۶۱ء - ۷۵۰ء)

اسی وقت حضرت علی کی شہادت وقوع میں آئی اور امیر معاویہ کا دور حکومت شروع ہوا۔[1]

بنو امیہ میں سب سے پہلے حکمراں امیر معاویہ ہوئے ہیں (۴۱-۶۰ھ / ۶۶۱-۶۷۹ء) ان کے زمانہ میں سلطنت اسلام بہت وسیع ہوئی اور سندھ پر زیادہ اثر قایم ہوگیا۔ چنانچہ سب سے پہلے (۴۴ھ / ۶۶۴ء) میں مہلب نے سندھ پر حملہ کیا اور بنّا اور الہوار (لاہور) تک بڑھتے چلے گئے جو ملتان و کابل کے درمیان واقع ہیں۔ لیکن یہ قتل ہوئے[2] اس کے بعد ۴۶ھ میں عبد اللہ بن سوار اور بعض روایت کے مطابق عبد اللہ ابن عامر مامور کئے گئے۔ قیقان میں ان کو فتح حاصل ہوئی اور مالِ غنیمت لے کر خلیفہ کے پاس گئے، لیکن جب پھر واپس آئے تو ترکوں نے ان کو قتل کر دیا اس کے بعد متعدد فوجیں مختلف اوقات میں اس طرف روانہ کی گئیں اور مکران پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

یزید اول (۶۰-۶۴ھ / ۶۷۹-۶۸۳ء) اور معاویہ ثانی (۶۴ھ / ۶۸۳ء) کے عہد میں بھی مسلسل کئی بار حدودِ ہند پر تاخت کی گئی مروان اول کے زمانہ میں (۶۴-۶۵ھ / ۶۸۳-۶۸۴ء) مسلمانوں نے راجپوتانہ پر سندھ کے راستہ سے حملہ کیا اور مانک رائے راجہ اجمیر مع اپنے اکلوتے بیٹے کے مارا گیا[3]۔ جب مروان کے بعد عبد الملک (۶۵-۸۶ھ / ۶۸۴-۷۰۵ء) تخت نشین ہوا تو عراق کی گورنری اس نے حجاج ابن یوسف کے سپرد کی۔ حجاج نے مکران کی حکومت سعید بن اسلم کلبی کو تفویض کی۔ لیکن علافیوں نے اُسے مار ڈالا۔ حجاج نے عبد الرحمٰن بن اشعث کو مامور کیا مگر یہ بھی علافیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بعد مجاع بن سعید مامور ہوا اس نے سرحدی اضلاع پر کامیابی سے تاخت کی۔ لیکن یہ اسی سال مرگیا اور محمد بن ہارون متعین کیا گیا جب ولید اول (۸۶-۹۶ھ / ۷۰۵-۷۱۵ء) میں تخت نشین ہوا تو محمد بن ہارون کو حکم دیا گیا کہ وہ علافیوں کو تلاش کر کے قتل کرے۔ چنانچہ وہ پانچ سال تک مسلسل مختلف شہروں پر تاخت کرتا رہا اور ایک علافی کا سر بھی اس نے حجاج کے پاس بھیجا۔ حجاج بڑے عزم و جرائت کا گورنر تھا وہ چاہتا تھا کہ مشرق میں فتوحات اسلامی کو بہت وسیع کرے، چنانچہ اس نے ایک لشکر قتیبہ کی سرکردگی میں روانہ کر کے خوارزم، بخارا، خجند، سمرقند، فرغانہ کو فتح کیا اور ایک لشکر کابل کے راجہ سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا اتفاق سے اس زمانہ میں راجہ سراندیپ (لنکا) نے حجاج کے پاس آٹھ جہازوں میں بہت سے تحایف روانہ کئے[4] ان میں لونڈی غلام بھی تھے اور کچھ مسلمان ایسے

---

[1] کرنل ٹاڈ نے اپنی کتاب راجستھان میں یہی لکھا ہے کہ خلافت علی میں مسلمانوں کا سلسلہ فتوحات سندھ میں شروع ہوگیا تھا جو وفاتِ حضرت علی کے بعد منقطع ہوگیا۔ [2] بلاذری۔ ۱-۱۱۶ و ۱۱۷۔ تحفۃ الکرام - ۹- چچ نامہ ۷۲-۸۰-

[3] راجستھان کرنل ٹاڈ۔ جلد دوم صفحہ ۴۴۴ — [4] یہ بیان فتوح البلدان، چچ نامہ اور فرشتہ کا ہے لیکن میر معصوم نے اپنی تاریخ سندھ میں اس سے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ عبد الملک نے کچھ لوگ یہاں لونڈیاں و دیگر اشیاء خریدنے کے لئے روانہ کئے تھے یہی لوگ جہازوں میں واپس آ رہے تھے کہ ساحل دیبل پر قزاقوں نے لوٹ لیا۔ ان جہازوں پر چند شامی تجار بھی بیٹھے ہوئے تھے جو لنکا سے اپنے وطن کو واپس جا رہے تھے۔

بھی تھے جو حج کے ارادہ سے سوار ہو گئے تھے۔ راستہ میں باد مخالف نے ان جہازوں کو ساحل دیبل پر پہونچا دیا اور یہاں بحری قزاقوں نے ان کو لوٹ لیا[1]

حجاج نے داہر کو لکھا کہ "وہ گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو فوراً آزاد کر دے"۔ داہر نے جواب دیا کہ "یہ حرکت قزاقوں کی ہے۔ اور مجھ کو ان پر مطلق اقتدار حاصل نہیں"۔

حجاج نے خلیفہ سے بدقت تمام اجازت حاصل کر کے عبید اللہ کو ایک فوج لے کر دیبل روانہ کیا لیکن یہ کامیاب نہیں ہوا اور مارا گیا۔

اس کے بعد حجاج نے حاکم عمان کو ہدایت کی کہ مکران کے راستہ سے سندھ پر حملہ کرے اور عبد اللہ بن قحطان کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی عمان جا کر شامل ہو جائے چنانچہ نیرون کے مقام پر دونوں مل گئے اور راجہ داہر کی فوج سے مقابلہ ہوا، مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے ـــــ تحفتہ الکرام اور فتوح البلدان کا بیان ہے کہ یہ جنگ نیرون[2] میں نہیں بلکہ دیبل میں ہوئی تھی۔ بہر حال جہاں کہیں ہوئی ہو مسلمان ناکامیاب رہے۔ جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو اہل نیرون ڈرے کہ کہیں حجاج ہم سے بدلہ نہ لے، چنانچہ یہاں کے حاکم نے جو بودھ مذہب کا تھا داہر سے چھپا کر اپنے معتمدوں کو حجاج کے پاس روانہ کیا اور اپنی بے قصوری ظاہر کرتے ہوئے آیندہ سے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ حجاج نے نیرون والوں کے لئے نامۂ امان لکھدیا اور اب سندھ پر حملہ کرنے کے لئے محمد قاسم کا انتخاب عمل میں آیا۔ جو حجاج کا بھتیجا تھا۔

تمام فارسی مورخین اسے محمد قاسم لکھتے ہیں "بلاذری" محمد بن قاسم ثقفی"، اور ابوالفداء "محمد بن القاسم" تحریر کرتا ہے۔ اس وقت محمد قاسم کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔ عنفوان شباب کا عالم تھا اس لئے لوگوں کو حیرت تھی کہ کیوں

---

[1] یہ قزاق کس قوم کے تھے اس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے فتوح البلدان میں ان کا نام مید لکھا ہے، چچ نامہ میں تنکامرا تحفتہ الکرام میں کہیں تنکامرا اور کہیں ناگامرا تحریر ہے عبد اللہ ابن عیسیٰ شارح دیوان جریر نے انھیں کرک کے نام سے تعبیر کیا ہے، ابن اثیر نے بھی سنہ ۱۵۱ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے کرک قوم کا ذکر کیا ہے جنکی نسبت خیال کیا ہے کہ شاید وہ کرگ (مشرقی بنگلور) کے رہنے والی ہو۔

[2] نیرون۔ جب رائے خاندان کی حکومت تھی تو یہ مقام سلطنت برہمن آباد میں شامل تھا۔ جب عربوں نے سندھ پر حملہ کیا تو یہاں کے باشندوں نے امن چاہی تھی اور دیبل فتح کرنے کے بعد محمد قاسم نے اپنے حملہ کا رُخ اسی طرف کیا تھا اور دیبل سے چلکر ساتویں دن یہاں پہونچا تھا اصطخری اور ابن حوقل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نیرون مابین دیبل و منصورہ واقع تھا لیکن منصورہ سے قریب تھا اور وہاں تک پہونچنے کے لئے دریائے سندھ کا عبور کرنا ضروری تھا۔ ابوالفداء نے اس کا فاصلہ منصورہ سے ۱۵ فرسنگ قرار دیا ہے اور بیرونی کی مشہور کتاب قانون مسعودی کی سند سے اس کا عرض البلد و طول البلد ۲۶ - اور - ۴۰ - تحریر کیا ہے

حجاج نے ایسا اہم کام اُس کے سپرد کیا، لیکن قسام ازل نے فتح سندھ کی غیر فانی شہرت اسی کے نام لکھدی تھی اور نتیجہ نے ثابت کردیا کہ اس سے زیادہ موزوں شخص اس مہم کے لئے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

محمد قاسم نے جس عزم و حسنِ انتظام کے ساتھ سندھ کی تمام وادی کو فتح کیا، وہ محمد قاسم کی کمسنی کو دیکھتے ہوئے حقیقتاً تاریخ کا عجیب و غریب افسانہ ہے۔ فتوح البلدان، چچ نامہ، اور تحفۃ الکرام وغیرہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس کے جزئیات درج کئے گئے ہیں اور مختصر ابتدائی صفحات میں، ہم نے بھی اس کا حال درج کردیا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد قاسم نے نہایت غیر معمولی طریقہ سے اپنی ہمت و شجاعت اور اپنے عزم و فراست کا سکہ ایک ایک کے دل میں قایم کرادیا اور ساری دنیا نے تسلیم کرلیا کہ حجاج سے زیادہ نبض شناسِ سیاست اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جس نے اس مہم کے لئے محمد قاسم کا انتخاب کیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت محمد قاسم، سندھ کی وادیوں کو اپنی نبرد آزمائیوں اور فتوحات کا مرکز بنائے ہوئے تھا اسی وقت طارق، اسپین فتح کرتا ہوا فرانس کی طرف بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف ایشیا میں خوارزم اسلام کے وسیع و پُر عظمت سلطنت کا ایک حصہ بننے کے لئے آمادہ تھا۔

تمام فارسی مورخین چچ نامہ کا تتبع کرتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ محمد قاسم قنوج تک پہونچ گیا تھا چونکہ اسوقت مملکتِ قنوج اجمیر تک وسیع تھی اس لئے اجمیر تک پہونچ جانا بھی قنوج تک پہونچ جانا کہلایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی شہر قنوج تک پہونچ گیا ہو تو بھی حیرت نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ حجاج نے اُس سے کہدیا تھا کہ "تم اسوقت تک دم نہ لینا جس وقت تک اسلام کا جھنڈا چین کے پہاڑوں پر نہ لہرانے لگے"۔

فرشتہ کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے عام طور سے یہی یقین کیا جاتا ہے کہ صرف چھ ہزار سپاہیوں کی مدد سے سندھ فتح کیا گیا۔ لیکن مورخین عرب کا بیان اس باب میں زیادہ قابل وثوق ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ علاوہ اس فوج کے جو بطور مقدمۃ الجیش کے ابوالاسود کی سرکردگی میں حدود سندھ پر محمد قاسم سے مل گئی تھی ۶ ہزار سوار شام و عراق کے اور ۶ ہزار مسلح شتر سوار بھی تھے علاوہ ان کے تین ہزار اونٹ باربرداری کے تھے جن کے بجائے میر معصوم تین ہزار پیادہ فوج ظاہر کرتا ہے۔

مکران میں محمد ہارون بھی اپنی کل فوج کے ساتھ شریک ہوگیا تھا اور پانچ منجنیق مع دیگر ضروری سامان کے جہازوں کے ذریعہ سے دیبل تک پہونچائی گئی تھیں۔ ایک ایک منجنیق اتنی بڑی تھی کہ اس کے چلانے کے لئے ۵۰۰ آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ کم از کم ڈھائی ہزار سپاہی جہازوں کے ذریعہ سے منجنیقوں کے ہمراہ آئے ہونگے اس طرح کل جمعیۃ تقریباً ۱۵ ہزار تھی جس کی مدد سے محمد قاسم نے سندھ کو فتح کیا۔

جب محمد قاسم کی کامیابی کی خبر دمشق میں پہونچی تو اور تازہ فوج روانہ کی گئی اسلئے جب وہ ملتان سے، دیبل پور کی طرف چلا ہے تو پچاس ہزار سپاہ اس کے پرچم کے ساتھ تھی اور وہ جمعیۃ اسکے علاوہ تھی جو سندھ کے مفتوحہ قلعوں میں چھوڑ دی گئی تھی

ہند فتح کیا۔ ابن قتیبہ ۹۳ھ ظاہر کرتا ہے۔ طبری کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ "سنہ ۹ھ (غالباً کتابت کی غلطی ہے) میں محمد قاسم نے سندھ کے بادشاہ دس ابن سسا کو قتل کیا، ۹۴ھ میں ہند فتح کیا اور ۹۵ھ میں ہندوستان کا اور زیادہ مشرقی حصہ مسخر کر لیا۔"

اگرچہ محمد قاسم نے شیراز ۹۲ھ میں چھوڑ دیا تھا لیکن دیبل پہونچنا ۹۳ھ کی ابتدا میں معلوم ہوتا ہے فتحِ دیبل کی کوئی صحیح تاریخ معین نہیں ہو سکتی، لیکن چونکہ حجاج نے اس فتح کا اعلان ۲۰ رجب ۹۳ھ (یکم مئی ۷۱۲ء) کو کیا تھا۔ اور سندھ سے پایۂ خلافہ تک سات دن میں خبر پہونچتی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ دیبل شروع رجب ۹۳ھ میں فتح ہوا ہوگا۔

اس کے بعد رمضان میں الور فتح ہوا یہاں سے پھر مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ فتوح البلدان کا بیان ہے کہ، محمد قاسم ملتان سے آگے نہ بڑھا تھا کہ حجاج کی موت کی خبر پہونچی اور وہ واپس چلا گیا۔ لیکن چچ نامہ ظاہر کرتا ہے کہ محمد قاسم حدود کشمیر میں اس جگہ تک پہونچ گیا تھا جہاں دریائے جہلم پہاڑوں سے نکل کر زمین کو بہت سے چھوٹے چھوٹے جزائر میں تقسیم کرتا ہوا متعدد چشموں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے[1]۔ چچ نامہ میں اس خطۂ زمین کا نام "پنج مائیات" یعنی (پنجاب) بتایا ہے اور یہی چچ کی سلطنت کی آخری حد تھی۔

حجاج کے چھ ماہ بعد خلیفہ ولید کا بھی انتقال ہو گیا (جمادی الاول ۹۶ھ۔ جنوری ۷۱۵ء) اور محمد قاسم واپس بلا لیا گیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ محمد قاسم سندھ و پنجاب میں سوا تین سال سے زائد نہ رہ سکا۔

محمد قاسم کے اسبابِ قتل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ چچ نامہ اور اسکے تمام تتبع مورخین کا بیان ہے کہ ولید ہی نے اس کو قتل کرایا تھا[2]۔ فتوح البلدان کا بیان ہے کہ خلیفہ سلیمان کے حکم سے محمد قاسم قتل کیا گیا اور اسکی داستان

محمد قاسم کی واپسی اور قتل

[1] "کوئنٹس کرٹیس" نے اس جگہ کا ذکر کرتے ہوئے جہاں سکندر نے راجہ پورس کے مقابلہ میں فتح حاصل کی تھی بالکل یہی نقشا کھینچا ہے۔

[2] اس قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب داہر کی دو لڑکیاں خلیفہ ولید کے پاس پہونچیں اور خلیفہ نے ان کو خلوت میں بلایا تو انھوں نے محمد قاسم کی شکایت کی کہ وہ ان کی عصمت خراب کر چکا ہے۔ خلیفہ بہت برہم ہوا اور حکم دیا کہ محمد قاسم جہاں ہو فوراً ایک گائے کے چمڑے میں بند کر کے سی دیا جائے اور اسی حال میں یہاں لایا جائے۔ چنانچہ اسکی تعمیل ہوئی جب محمد قاسم کی لاش لڑکیوں کے سامنے پہونچی (ان میں سے ایک کا نام سورج دیوی اور دوسری کا پرمل دیوی تھا) تو انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے تو صرف محمد قاسم سے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لئے ایسا کہا تھا"۔ تو یہ سن کر ولید بہت برہم ہوا اور لڑکیوں کو گھوڑے کی دم سے بندھوا کر ہلاک کرا دیا اور لاشیں دجلہ میں پھکوا دیں۔ میر معصوم نے بھی یہی لکھا ہے۔

لیکن چچ نامہ اور میر معصوم کا یہ بیان بالکل غلط معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کھال کے اندر بند کر کے ہلاک کرنے کا طریقہ صرف تاتاریوں میں رائج تھا اور عرب اس سے واقف نہ تھے علاوہ اس کے یوں بھی خلیفہ ولید اپنے اخلاق کے لحاظ سے ایسا نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے جنرل کو ایسی معمولی سی بات پر ایسی سخت سزا دیکر فتوحات اسلام کے سلسلہ کو دفعتاً روک دیتا۔

اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ خلیفۂ ولید کے بعد خلافتِ سلیمانؔ میں تمام پچھلے انتظامات منسوخ کئے جا رہے تھے اور خلیفۂ سلیمان، حجاج کے تمام ساتھیوں کو چن چن کر قتل کر رہا تھا اس لئے اس نے محمد قاسم کو بھی طلب کیا اور ہلاک کر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد قاسم ہندوستان میں ایسا ہر دلعزیز تھا کہ جب وہ واپس بلایا گیا ہے تو یہاں کے لوگ روتے تھے اور یہ محبت و عظمت اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ کیراج میں بُت تیار کر کے لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

خلیفۂ سلیمانؔ کے عہد میں (۹۶-۹۹ھ / ۷۱۵-۷۱۷ء) محمد قاسم کے بعد یزید، حاکم سندھ مقرر کیا گیا۔ لیکن یہاں پہونچنے پر ۱۸ دن کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حبیب ابن مہلب متعین کیا گیا، تاکہ جن راجاؤں نے محمد قاسم کے قتل سے فایدہ اُٹھا کر سرکشی اختیار کی تھی اُن کو زیر کرے[۱]۔ حبیب نے ساحلِ دریائے سندھ پر دشمنوں کی ایک جماعت کو شکست دی اور اَلُور کے باشندوں کو مطیع کر لیا۔ عہد سلیمانؔ میں ایک اور گورنر عامر بن عبد اللہ کا بھی یہاں آنا بیان کیا جاتا ہے[۲]۔ خلیفۂ سلیمان کے بعد عمر بن عبد العزیز کا عہد شروع ہوا (۹۹-۱۰۱ھ / ۷۱۷-۷۲۰ء) انھوں نے ہندوستانؔ کے تمام سلاطین و امراء کو خطوط لکھے "کہ اسلام لے آؤ تاکہ تم کو بھی وہی حقوق ملیں جو اور مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ تم ہمارے ساتھ متحد ہو جاؤ تاکہ ہم بھی تمھاری حفاظت کے ذمہ دار ہو جائیں"۔ چنانچہ داہر کا بیٹا جیسیا مع دیگر امراء کے مسلمان ہو گیا۔ عمرو بن مسلم یہاں کی سرحد پر نائبِ خلیفہ تھا اس نے بھی ہندوؤں کے متعدد صوبوں پر مختلف حملے کئے اور فتح حاصل کی[۳]۔ لیکن خلیفۂ یزید (۱۰۱-۱۰۵ھ / ۷۲۰-۷۲۴ء) کے عہد میں جنید بن عبد الرحمٰن المری سرحدِ ہند کا حاکم مقرر ہوا[۴]۔ اور خلیفہ ہشام بن عبد الملک (۱۰۵-۱۲۵ھ / ۷۲۴-۷۴۳ء) کے عہد میں بھی یہ بحال رہا۔ جنید نے تمام باغی سلاطینِ ہند کے خلاف فوج روانہ کی اور مختلف مقامات فتح کئے (مثلاً کیراج، مرماد، مندل، وریج، بروس (بھڑوچ) اُزین (اُجین) مالبا (مالوہ) وغیرہ) ان فتوحات کا ثبوت ہندو اور چینی تاریخوں سے بھی ملتا ہے[۵]۔

---

[۱] مورخین سندھ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم کے بعد دو سال کے اندر ہندوستان کے راجاؤں نے بغاوت کر کے اپنا ملک بہت کچھ واپس لے لیا چنانچہ جیسیا داہر کے بیٹے نے بھی برہمن آباد پر قبضہ کر لیا تھا۔ [۲] تاریخ سندھ ۳۰۔ تحفۃ الکرام ۱۸۔ [۳] تحفۃ الکرام ۱۸

[۴] "سرحدِ ہند" کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد قاسم کے بعد عربوں کا تسلط اندرون ملک پر قایم نہ ہو سکا تھا۔ وہ امراء جو مسلمان ہو چکے تھے عربوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ جب جنید دیبل کی طرف بڑھا تو داہر کے بیٹے نے جو وہاں حکمران تھا اور مسلمان ہو چکا تھا کہلا بھیجا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے ہمیں یہاں کا فرمانروا تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن جنید نہیں مانا اور جنگ کر کے اس کو قتل کر ڈالا اس کے بعد اس کا بھائی عراق کی طرف چلا کہ اس بے عنوانی کی شکایت وہاں کے حاکم سے کرے لیکن یہ بھی جنید کے اشارہ سے راستہ میں قتل کر دیا گیا۔

[۵] راجستھان (کرنل ٹاڈ) جلد اول صفحہ ۲۳۱، ۲۴۲، ۲۵۰، ۸۱۰۔

سنہ ۱۱۱ھ میں جنید کے بعد تمیم بن زید العتبی یہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ یہ ایک کمزور دل و دماغ کا شخص تھا لیکن بے انتہا سخی تھا۔ اس نے ایک کرور اسی لاکھ تا تاری درہم جو خزانۂ سندھ میں جمع تھے لوگوں کو تقسیم کر دئے۔

تمیم کے بعد خالد، گورنرِ عراق نے سندھ کی حکومت حکم الکلبی کے سپرد کی اب اہل ہند نے پھر بُت پرستی شروع کر دی تھی۔ حکم نے محفوظہ شہر تعمیر کرایا اور عمرو بن محمد بن قاسم کی سرکردگی میں متعدد فتوحات حاصل ہوئیں۔ جب حکم کے بعد عمرو یہاں کا حاکم ہوا تو اس نے منصورہ تعمیر کرایا۔[1]

اس کے بعد اور بھی چند گورنر آئے لیکن بلاذری نے ان کا نام نہیں بتایا لیکن تحفۃ الکرام میں اس آخری عہد کی بابت لکھا ہے کہ "سلیمان ابن خلیفہ ہشام بھی سندھ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا جس نے یہاں نہ صرف بنوامیہ کے آخری خلیفہ مروان (۱۲۷-۱۳۲ھ / ۷۴۴-۷۵۰ء) کے عہد تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی، بلکہ عباسیہ خاندان کے خلیفۂ اول (ابوالعباس سفاح) کے عہد میں بھی کچھ زمانہ تک یہاں کا فرمانروا رہا۔ تحفۃ الکرام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مروان ایک شخص ابوالخطاب[2] کو بھی سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ آخری گورنر (بنوامیہ کی طرف سے) یہاں منصور تھا۔[3]

جب ابوالعباس سفاح خلیفہ مقرر ہوا (۱۳۲-۱۳۶ھ / ۷۵۰-۷۵۴ء) تو ابو مسلم خراسانی نے سندھ کی حکومت پر عبدالرحمن کو مامور کیا عبدالرحمن اور منصور (آخری گورنر عہدِ بنی امیہ) سے لڑائی ہوئی جس میں عبدالرحمن کو شکست ہوئی۔ اسکے بعد ابو مسلم نے موسیٰ بن کعب التیمیمی کو مامور کیا۔ منصور نے اس سے بھی مقابلہ کیا لیکن آخر میں اس کو شکست ہوئی اسکا ایک بھائی مارا گیا اور وہ خود بھی صحرا میں شدت تشنگی سے مر گیا۔

موسیٰ نے فتح حاصل کرنے کے بعد منصورہ کی مرمت کرائی، مسجد کو وسیع کیا۔ اور ہندؤں کے مقابلہ میں کئی بار فتح حاصل کی۔ تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ عہدِ بنی امیہ کے آخری گورنر کو داؤد ابن علی کے لشکر نے شکست دی تھی۔

سفاح کے بعد خلیفۂ منصور کے عہد میں (۱۳۶-۱۵۸ھ / ۷۵۴-۷۷۵ء) ہشام، سندھ کا گورنر مقرر ہوا اور اُس نے تمام ان شہروں کو فتح کیا جو اسوقت تک مسلمانوں کے اقدام میں حائل تھے اس نے عمرو بن جمل کو ایک بیڑہ بوارج[4] (جنگی جہازوں)

---

[1] بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ میں گورنرانِ سندھ کا صدر مقام یہی تھا۔

[2] ممکن ہے یہ وہی ابوالخطاب ہو جو عہدِ مروان میں اسپین کا گورنر تھا۔

[3] ابن خلدون نے لکھا ہے کہ منصور کو سفاح نے مقرر کیا تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے برہمن آباد کے کھنڈر میں سے جو سکّے برآمد ہوئے ہیں ان میں بعض سکّے منصور کے بھی ہیں اور انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنوامیہ کے آخری خلیفہ مروان کی طرف سے وہاں مامور تھا۔

[4] جمع ہے بارجہ کی۔ بلاذری نے اس لفظ کا استعمال جنگی جہازوں کے لئے کیا ہے وہ جہاز جو جزیرہ سراندیپ سے حجاج کے پاس روانہ ہوئے تھے اور ساحل دیبل پر لوٹے گئے تھے ان کو بھی بلاذری نے بوارج لکھا ہے اسکی ایک صدی بعد بیرونی نے بھی کچھ اور سومنات میں بوارج کے لنگر انداز ہونے کا حال بیان کیا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ بارجہ ایک بڑے جنگی جہاز کو کہتے ہیں۔ انگریزی کا لفظ (Barge) اسی سے ماخوذ ہے

کا سپرد کر کے بردہ[۱] روانہ کیا اور ایک فوج مملکت ہند کی طرف روانہ کی جو کشمیر[۲] تک پہونچ گئی اور بہت سے قیدی اس کے ہاتھ آئے اور تمام صوبہ ملتان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور قندابیل سے ایک جماعت کو (جن پر علویین ہونے کا شبہ تھا) باہر نکال دیا[۳]۔ اسی زمانہ میں سندھی اعراب نے قندہار[۴] کو بھی فتح کیا اور بُت خانہ مسمار کر کے ایک مسجد تعمیر کرائی ہشام کے بعد عمرو بن حفص بن عثمان گورنر مقرر ہوا[۵] یہ تقرری ۱۵۱ھ سے پہلے ہوئی۔ کیونکہ ۱۵۱ھ میں عمرو بن حفص حکومت افریقہ پر تبدیل کیا گیا اور ۱۵۴ھ میں وہیں وہ مارا گیا۔

عمرو بن حفص کے بعد افریقہ کا حاکم یزید بن حاتم مقرر ہوا اور سندھ میں یزید کا بھائی روح متعین کیا گیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں (۱۷۰-۱۹۳ھ / ۷۸۶-۸۰۹ء) افریقہ و سندھ کے گورنروں میں بہت تبدیلی وقوع میں آئی اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ وہ ایک جگہ زیادہ دن رہنے سے خود سر ہو جائیں گے اور ملک پر ان کا اقتدار قایم ہو کر خلافت کا اثر ضعیف ہو جائے گا۔ ہارون کے زمانہ میں داؤد بن یزید مہلبی ۱۸۴ھ کے قریب سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن وہ جلد مر گیا۔ سندھ کی مقامی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد سے قبل حاجی ترابی یا ابو تراب گورنر مقرر کیا گیا تھا اس نے ضلع ساکورہ میں قلعہ تہرا اور مغربی سندھ میں بلاد گرا اور بھم پور کو فتح کیا اس کا مقبرہ جس پر ۱۷۱ھ / ۷۸۷ء منقوش ہے ٹھٹھ سے آٹھ میل شمالِ مغرب کی طرف مابین گوجا و کوری زیارت گاہِ عوام ہے[۶]۔ ہارون الرشید کے عہد میں ایک گورنر ابوالعباس بھی ہوا ہے جو عرصہ تک سندھ پر حکومت کرتا رہا۔

مامون الرشید کے زمانہ میں (۱۹۸-۲۱۸ھ / ۸۱۳-۸۳۳ء) بشر بن داؤد سندھ کے حاکم اعلیٰ نے بغاوت اختیار کی اور خراج

---

[۱] بارند، باربد بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ غالباً اس سے مراد جیتوار ہے جو ساحلِ گجرات پر واقع ہے۔ بیرونی نے اس کو بارود یا بارد لکھا ہے ابن اثیر اور طبری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۰ھ میں خلیفہ مہدی نے بھی ایک فوج اس جگہ روانہ کی تھی یہ شہر فتح تو ہوگیا لیکن فوج میں بیماری پھیل جانے سے بہت نقصان ہوا اور جو فوج بچ رہی تھی وہ واپسی میں ساحل فارس کے قریب غرق ہوگئی۔

[۲] اس سے مراد شہر کشمیر نہیں ہے بلکہ پہلے پنجاب بھی سلطنت کشمیر میں شامل تھا اس لئے سلطنت کشمیر کی حدود میں کسی جگہ یہ فتح حاصل ہوئی ہوگی۔

[۳] ابوالفداء۔ ۲ ۔ ۲۰ ۔

[۴] بعض مستشرقین نے خلیج کمبایت (Gulf of Cambay) کے قریب اس شہر کا واقع ہونا ظاہر کیا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد گندہارا (بالائی حصۂ سندھ کا ایک شہر) ہے سٹرالیٹ کہتے ہیں کہ اس کا صحیح نام کھنداوار ہے جو جزیرہ نمائے کاٹھیاوار کا ایک مقام ہے۔

[۵] طبری و ابوالفداء کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہشام عمر بن حفص کے بعد گورنر سندھ مقرر ہوا تھا۔ [۶] تحفۃ الکرام ۱۹-۲۲۴۔

بھیجنا بند کر دیا۔ غسان بن عباد کوفی جو خلیفہ کا عزیز بھی تھا ۲۱۳ھ میں اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ بشر نے ہتھیار ڈالدئے اور غسان اسے بغداد لے گیا لیکن خلیفہ نے اس کا قصور معاف کر دیا۔[1]

غسان بغداد جاتے وقت موسیٰ بن یحیٰی برمکی کو جو فضل اور جعفر برمکی کا چھوٹا بھائی تھا سندھ کی حکومت سپرد کر گیا (تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ موسیٰ بن یحیٰی برمکی ہارون الرشید کے زمانہ میں سندھ کا حاکم مقرر ہوا تھا لیکن اس نے زر خراج صرف کر ڈالا اس لئے علٰحدہ کر دیا گیا اور اس کے بعد علی بن عیسےٰ ہامان مقرر ہوا[2]) موسےٰ عرصہ دراز تک سندھ کا حاکم رہا جب ۲۲۱ھ میں اس کا انتقال ہوا تو عہد "معتصم باللہ" میں اس کا بیٹا عمران گورنر مقرر ہوا اس نے قیقان کو فتح کیا جو جاٹوں کے قبضہ میں تھا اور شہر "البیضاء" کی بنیاد ڈال کر اسے ایک فوجی مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد وہ منصورہ واپس آیا اور پھر قنداببیل[3] پہونچا۔ یہاں محمد بن خلیل فرمانروا تھا۔ شہر پر قبضہ کر کے یہاں کے خاص خاص لوگوں کو "قصدار" لے گیا۔ اس کے بعد اس نے میدیوں کو مغلوب کر کے ایک بندہ یہاں تعمیر کرایا۔ اس کے بعد دریائے اَرل پر خیمہ زن ہو کر جاٹوں سے جزیہ وصول کیا۔

خلافتِ عباسیہ کا زوال المستعصم باللہ کے عہد سے شروع ہو گیا تھا اور ترکی سپاہ خود مختار ہوتی جاتی تھی اس لئے المعتمد (۲۵۶-۲۷۹ھ / ۸۷۰-۸۹۲ء) اور المقتدر (۲۹۵-۳۲۰ھ / ۹۰۸-۹۳۲ء) کے عہد میں شیرازہ اور زیادہ پراگندہ ہو گیا۔ المعتمد نے یعقوب بن لیث صفاری کو حکومت سندھ سپرد کر دی تھی یعقوب نے ۲۶۵ھ میں انتقال کیا اور اس کے بعد ملتان اور منصورہ میں دو مستقل سلطنتیں قائم ہو گئیں۔

مسعودی ۳۰۳ و ۳۰۴ھ (۹۱۵ء) میں یہاں آیا تھا۔ اس نے ان دونوں سلطنتوں کا حال اپنی کتاب "مروج الذہب" میں لکھا ہے کہ:- ملتان کی سلطنت خراسان تک وسیع تھی۔ قریش خاندان کا ایک امیر یہاں حکمراں تھا اور قنوج بھی اسی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ ملتان میں ایک سورج کا مندر تھا۔ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ اسی مندر سے حاصل ہوتا تھا، کیونکہ زائرین دور دور سے آتے تھے اور قیمتی تحائف مندر پر چڑھاتے تھے۔ منصورہ میں بھی ایک

---

[1] ابوالفداء - ۲ - ۵۰ - [2] تحفۃ الکرام - ۱۸ - [3] قنداببیل - تاریخ سندھ میں قنداببیل کا نام اکثر آتا ہے، چچ نامہ میں قنداببیل کو قندابار بھی بتایا ہے، لیکن یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ بلاذری جو اس باب میں زیادہ قابل اعتبار ہے، ان دونوں مقامات کو الگ الگ ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ابن حوقل، اصطخری، اور صاحب اشکال البلاد، قنداببیل کی جائے وقوع صحرا کے اندر منصورہ سے ۸ منزل کے فاصلہ پر (قندابار سے علٰحدہ) ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقامات الگ الگ واقع تھے علاوہ اس کے یوں بھی اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی ہے کہ قنداببیل وہیں تھا جہاں اب گنڈاور (صوبہ کچھ کا صدر مقام) پایا جاتا ہے گنڈاور کے چاروں طرف اب بھی فصیل پائی جاتی ہے اور اب بھی قلات و شکارپور کے درمیان وہ بہت مشہور مانا جاتا ہے۔

قریشی نسل کا سردار ابوالمنذر بن عبداللہ حکمران تھا۔ ریاست منصورہ سمندر سے الور تک وسیع تھی۔ اس میں تین لاکھ گاؤں تھے اور امیر منصور کے پاس ۸۰ صرف مسلح ہاتھی تھے"۔

خلیفہ المطیع باللہ (۳۳۴-۳۶۳ھ / ۹۴۵-۹۷۴ء) اور خلیفہ القادر باللہ (۳۸۱-۴۲۲ھ / ۹۹۱-۱۰۳۱ء) کے عہد میں ابن حوقل، ہندوستان آیا تھا اس نے بھی چشم دید حالات یہاں کے بیان کئے ہیں وہ لکھتا ہے کہ "ملتان منصورہ سے چھوٹا شہر ہے، امیر ملتان شہر سے باہر رہتا ہے، صرف جمعہ کے روز ہاتھی پر سوار ہو کر جامع مسجد میں نماز کے لئے جاتا ہے۔ یہاں کا کوئی خاص سکہ نہیں ہے۔ تاتاری اور قندھاری درہم کا رواج ہے۔ مسلمانوں اور بُت پرستوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ڈھیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ ملتان اور منصورہ دونوں آزاد سلطنتیں ہیں اور خلیفۂ بغداد کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ الور[1] جو ہندوؤں کا قدیم دارالسلطنت تھا اس کی فصیل دوہری ہے اور حکومت منصورہ میں شامل ہے۔ سندھ میں سوائے ان دو اسلامی سلطنتوں کے چھوٹی چھوٹی اور ریاستیں بھی ہیں۔ ایک ریاست توران ہے جس کا حاکم ابوالقاسم باشندۂ بصرہ ہے، دوسری ریاست قُصدار اس کا حاکم ایک عرب نژاد معین بن احمد ہے، تیسری ریاست مکران ہے اور اس کا دارالریاست قیزبور ہے جو آبادی میں ملتان سے نصف ہے۔ اس کا حاکم عیسیٰ بن معدان ہے۔ چوتھی ریاست مشکی مکران کی سرحد پر ہے۔ منصورہ، ملتان اور دیگر اضلاع میں عربی و سندھی زبانیں بولی جاتی ہیں، مکران میں مکرانی اور فارسی زبان"۔

ابن حوقل نے قرامطہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر، سندھ میں بعد کو قایم ہوا۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ قرامطہ کو سنہ ۳۶۰ھ و ۳۶۳ھ میں مصر کے اندر سخت شکست حاصل ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ اس شکست کے بعد ہی انھوں نے سندھ کی طرف قسمت آزمائی کی ہوگی اور چونکہ سارا سندھ منتشر حالت میں تھا اس لئے انھوں نے منصورہ و ملتان پر قبضہ کر لیا ہوگا جہاں سے ان کو محمود غزنوی نے نکالا۔

ابن اثیر اور دیگر تواریخ سندھ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود نے بھی سندھ میں سلسلۂ فتوحات قایم کیا تھا۔

---

[1] الور۔ اس کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ مسعودی نے "الرور" لکھا ہے ابن خورداذبہ نے "الدور" ظاہر کیا ہے اصطخری "الروز" لکھتا ہے اور ادریسی "دور"۔ اس شہر کے کھنڈر "بھکر" اور "خیرپور" کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اور "اَلُور" کے نام سے مشہور ہیں۔ لفٹنٹ میکلاگن لکھتے ہیں کہ اسے "ارور" بھی کہتے ہیں۔ اور وہ "بندھ" جسے عمران گورنر نے تعمیر کرایا تھا اسکے آثار ایک محراب دار پل کی صورت میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل نام اس مقام کا اور تھا اور "ال" عربی کا زاید ہے۔ اب بھی انھیں کھنڈروں کے متصل ایک قصبہ "اوری" کے نام سے موجود ہے جسے اُسی قدیم "الرور" یا روڑ کی یادگار سمجھنا چاہئے۔

اگرچہ عام طور سے مورخین اس کا ذکر نہیں کرتے لیکن ایسا ہونا یقینی ہے کیونکہ جب قصدار اور ملتان اسکے قبضہ میں آگیا تھا تو پھر کوئی چیز اس کی پیشقدمی کے لئے مانع نہ تھی۔ چونکہ یہ امر بالکل یقینی ہے کہ سومنات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد چند روز تک اس نے دریائے سندھ کے کنارے کنارے کوچ کیا اس لئے ابن اثیر کا یہ بیان کہ "سنہ ۴۱۶ھ میں محمود نے منصورہ پر قبضہ کیا اور وہاں ایک مسلمان شہزادہ کو تخت نشین کیا" بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے قبل جو فرمانروا وہاں کا تھا مسلمان نہ تھا بلکہ قرامطہ میں سے تھا جنھوں نے تین صدی کی حکومت کو سندھ سے بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔

ہذا صورۃ بلاد السند

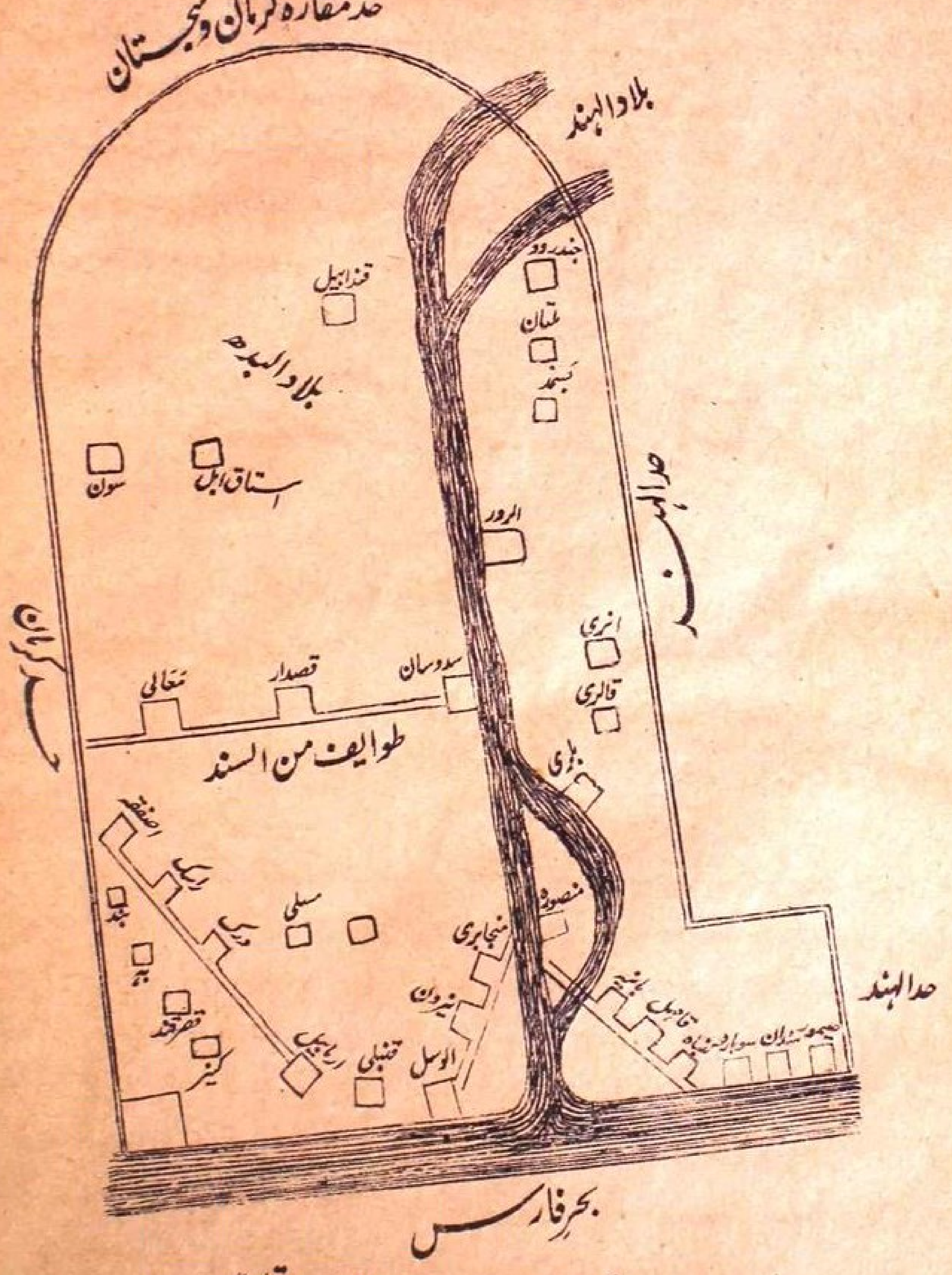

نقشۂ سندھ مرتبہ "ابن حوقل"

۳۶۶ھ
۹۷۶ء

باب دوم

حکومتِ سندھ کے عروج وزوال پر ایک تبصرہ

یہاں تک ہم نے اختصار مگر سلسلہ کے ساتھ بتا دیا ہے کہ عربوں نے کب سندھ پر حملہ کیا اور خلافتِ عباسیہ کے آخری زمانہ میں وہ کیونکر غزنی کی حکومت سے متعلق ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ محمود جب حملۂ سومنات کے بعد منصورہ میں اپنا نائب مقرر کر کے غزنی واپس گیا ہے، تو یہاں علی الترتیب سمرا، سما، ارغون، و ترخان خاندانوں[1] کی حکومتیں مختلف اقطاعِ سندھ میں قایم ہوئیں۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر نے اس طوائف الملوکی کو مٹا کر سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سوائے اس امر کے کہ صحرا و ریگستان ہونے کے لحاظ سے سندھ و عرب میں ایک اشتراکِ آب و ہوا توفی الجملہ ضرور پایا جاتا ہے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان دونوں جگہ کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتی۔ اگر اور کوئی

---

[1] سمرا خاندان کے ابتدائی حالات بہت کچھ پردۂ خفا میں ہیں۔ میر معصوم کا بیان ہے کہ عبدالرشید سلطان مسعود کے عہد میں (۴۴۳ھ ۱۰۵۱ء) سمرا قوم نے غزنوی حکومت سے بغاوت کی اور سندھ کے تخت پر ایک شخص سمرا نامی کو بٹھا دیا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ سمرا خاندان کے ۳۶ فرمانرواؤں نے ۵۰۰ سال تک حکومت کی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد قاسم کی وفات کے بعد ایک قبیلۂ عرب نے جس کا تعلق انصاریوں سے تھا اپنی حکومت سندھ میں قایم کی اور اس کے بعد ۵۰۰ سال تک سمرا زمینداروں نے سلطنت کی (جن کا حال معلوم نہیں ہو سکا)۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحۂ ۵۸ پر ملاحظہ کیجئے)

اختلاف نہ ہوتا تو بھی اختلافِ مذہب ایک ایسا زبردست پردہ تھا جو سندھیوں اور عربوں کے درمیان پڑا ہوا تھا لیکن باوجود اس اختلافِ مذہب و طبایع، اس تباینِ تہذیب و اخلاق کے فاتحین عرب نے سندھ والوں کے اُن حقوق کا بہت لحاظ کیا جو فطری طور سے حاکم و محکوم، راعی و رعایا کے درمیان قایم ہوتے ہیں۔ ممکن تھا کہ عربوں کی فتحمند جماعت سندھیوں کو بالکل بے دست و پا کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتی۔ لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ملک کا سارا انتظام جو اُن کے حملہ سے قبل پایا جاتا تھا علیٰ حالہ قائم رہنے دیا اور ایک سندھی کو بھی اسکی جگہ سے نہیں ہٹایا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۷)

اس کے بعد سما خاندان آیا جس نے جام کا لقب اختیار کیا۔ ان خاندانوں کے زمانہ میں شاہانِ غزنی و غور و سلاطین دہلی سندھ پر حملہ کرتے رہے اور بہت سے شہروں پر قبضہ کر کے اپنے گورنر مقرر کر دئے۔

تاریخ طاہری میں لکھا ہے کہ سمرا ایک ہندو خاندان تھا جس نے سنہ [illegible] سے ۸۴۳ھ تک حکومت کی۔ بیگ لرنامہ نے بھی وہی لکھا ہے جو فرشتہ نے بیان کیا ہے۔ محمد یوسف نے منتخب التواریخ میں میر معصوم کے بیان کا تتبع کرتے ہوئے سمرا خاندان کے ۱۹ بادشاہوں کا نام لکھا ہے جن میں سے اول سمرا اور آخری بھونگر ثالث ہے۔ ان میں بعض نام ایسے ہیں جن سے ان کے مسلمان ہونے کا قیاس ہوتا ہے مثلاً محمد طور، عمر سمرا، تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ سمرا قوم اعرابِ سامرہ سے پیدا ہوئی جو دوسری صدی ہجری میں سندھ آئے تھے۔ جب خاندان غزنی و غور کا اثر حکومتِ سندھ میں قایم ہونے لگا اور ان خاندانوں کے گورنر بھی متعین ہوئے اُسوقت سمرا خاندان کے افراد، سندھ کے بعض حصوں میں خود مختار فرمانروا تھے۔ دوسری جگہ سمرا خاندان کا ذکر کرتے ہوئے صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ جب غازی ملک سنہ ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں ملتان اور سندھ کی افواج مجتمع کر کے دہلی روانہ ہوا اور خسرو خاں کو شکست دیکر غیاث الدین تغلق شاہ کا لقب اختیار کیا تو سمرا قوم نے سندھ میں ایک شخص سمرا نامی کو اپنی ہی قوم میں سے منتخب کر کے اپنا حکمران بنا لیا اور پھر اس کی اولاد عرصہ تک حکمران رہی، حتے کہ ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں سما قوم نے خروج کیا اور سمرا خاندان کے آخری فرمانروا ارمیل کو ہلاک کر کے حکومتِ سندھ چھین لی۔

الغرض سمرا خاندان کے صحیح حالات پردۂ خفا میں ہیں اور اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کس خاندان سے تھے اور کب سے کب تک اُنھوں نے سندھ میں حکومت کی۔ یوروپین محققین میں بھی سخت اختلاف ہے۔ مسٹر الفنسٹن انھیں مسلمان راجپوت بتاتے ہیں اور ڈاکٹر برڈ ابولہب کی اولاد ظاہر کرتے ہیں۔

سما خاندان کی حکومت سندھ میں سمرا کے بعد قایم ہوئی۔ اس کا زمانۂ حکومت ۹۲۷ھ (۱۵۲۱ء) تک رہا یہاں تک کہ ارغون خاندان نے اس کو شکست دے کر اپنی حکومت قایم کر لی۔ بیگ لرنامہ، سما خاندان کی حکومت کا اختتام ۷۳۴ھ (۱۳۳۴ء) میں ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ طاہری میں ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) درج ہے اور تحفۃ الکرام میں ۹۲۷ھ تحریر ہے۔ اس لئے اس خاندان کی حکومت کم از کم ۸۴ سال اور زیادہ سے زیادہ ۱۹۳ سال تک قایم رہی، لیکن تحفۃ الکرام کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے جسکی تصدیق سراج عفیف کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ ہو)

حکومتِ عرب میں رعایا کے مساویانہ حقوق

جب داہر قتل ہوا تو محمد قاسم نے اس کے وزیر کو بدستور بحال رکھا تاکہ جو حقوق رعایا کے پہلے سے قائم تھے ان کی حفاظت کرے اور ٹیکس وصول کرنے کے لئے صرف سندھ کے برہمنوں کو مامور کیا اور ایک عرب کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں کی گئی۔

مسلمان جب کسی شہر پر حملہ کرنے والے ہوتے تھے تو پہلے وہاں کے باشندوں کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو خیر ورنہ پھر جزیہ طلب کرتے۔ اگر اس سے بھی انکار ہوتا تو پھر حملہ کرتے۔ اسلام لانے کی صورت میں سارے امتیازات اُٹھ جاتے اور مساوات قائم ہو جاتی۔ اگر وہ جزیہ ادا کرتے تو ملک اُنھیں کے قبضہ میں رہتا۔ حملہ کے وقت بھی اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا کہ صرف مسلح سپاہیوں سے مقابلہ کیا جائے، کاشتکاروں اور تاجروں سے مطلق کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۸)

اس خاندان کے فرمانروا جام کے لقب سے مشہور ہیں اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ جمشید کی اولاد میں سے تھے بعض کا بیان ہے کہ ان کا سلسلہ ابوجہل سے ملتا تھا اور بعض سام بن نوح سے متعلق کرتے ہیں۔ چچ نامہ میں درج ہے کہ جب وقت محمد قاسم نے حملہ کیا ہے تو دریائے سندھ کے ساحلِ زیریں کے باشندوں نے اطاعت اختیار کی۔ اسوقت اس جماعت کا سردار ایک شخص سمبا تھا جو چچ کی طرف سے دیبل کا گورنر بھی تھا۔ یہ لوگ ہندو تھے اور کرشن جی کے بیٹے سمبا سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا تھا اور ساحلِ دریائے سندھ پر سامنگر ان کا دارالحکومت تھا۔ یہ لوگ غالباً ۹۳ھ میں مسلمان ہوئے"۔ چچ نامہ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ سما خاندان یہی تھا جو پہلے راجپوت تھا اور بعد کو مسلمان ہو گیا۔

خاندان ارغون۔ ہلاکو (چنگیز خاں کا پوتا) کے ایک پوتے کا نام ارغون خاں ترخان تھا۔ اور یہ خاندان اس کی نسل سے ہے۔ اس خاندان کی حکومت ۵۰ یا ۶۰ سال تک قائم رہی۔ اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) میں ختم ہو گئی۔ آخری حکمران شاہ حسین تھا جس نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

خاندان ترخان۔۔۔ اس خاندان کے متعلق بعض کا بیان ہے کہ چنگیز خاں نے ایک نوجوان شخص کو اس کی بعض خدمات کے معاوضہ میں ترخان کا لقب دیا تھا اور یہ خاندان اُسی کی اولاد میں سے تھا بعض اس واقعہ کو تیمور سے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ ارغون خاں کی اولاد میں سے تھے۔ یہ خاندان صرف ۳۸ سال تک سندھ کا حکمران رہا۔ اس کے آخری فرمانروا مرزا جانی بیگ نے ۱۰۰۱ھ میں اپنی خود مختاری، اکبر کے جنرل خان خاناں کے سپرد کر دی۔ تاریخِ طاہری نے ۱۰۲۰ھ تک اس خاندان کا زمانۂ حکومت تحریر کیا ہے کیونکہ غازی بیگ ترخان اسی سال قندھار میں مرا تھا لیکن چونکہ غازی بیگ کی حیثیت صرف ایک جاگیردار کی سی تھی، اس لئے اس خاندان کی حکومت کا اختتام تو حقیقتاً ۱۰۰۱ھ ہی میں ہو گیا تھا اور سندھ اسی وقت تیموریہ سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔

مالگذاری کا تعین

مفتوحہ ممالک میں مالگذاری پیداوار پر قایم کی گئی، اُس زمین میں جہاں نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی، جَو اور گیہوں پر $\frac{1}{2}$ حصہ متعین کیا گیا اور اُس زمین میں جس کا ذریعۂ آب پاشی نہر نہ تھا (بلکہ کنویں یا جھیل وغیرہ سے چرخی لگاکر پانی دیا جاتا) $\frac{1}{3}$ حصہ مقرر کیا گیا۔ ایسی زمین پر جس کی پیداوار صرف بارش پر منحصر تھی، $\frac{1}{2}$ حصہ مالگذاری میں لیا جاتا اگر قابل کاشت زمین غیر مزروعہ رہتی تو قابض سے فی جریب ایک درہم معاوضہ وصول کیا جاتا۔ باغوں کی پیداوار میں $\frac{1}{5}$ حصہ سلطنت کا مقرر تھا اور دیگر ذرائع آمدنی پر (مثلاً مچھلی کا شکار موتیوں کا نکالنا) عام طور سے ایک خمس لیا جاتا۔ پیشہ وحرفہ پر بھی اسی طرح کچھ ٹیکس قایم تھا۔[1] پھر زمین کے رقبہ کا اندازہ مسلمان خود نہیں کرتے، بلکہ مالکان دیہ کے بیان پر اعتماد کر لیتے تھے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ اندازہ کتنا صحیح ہوتا ہوگا اور مسلمانوں کو کیا آمدنی ہوتی ہوگی۔

سندھ کی تجارتی ترقی

تجارت کے متعلق بھی عربوں نے بہت وسعت نظر سے کام لیا۔ سندھ اس سے قبل بھی تجارتی ملک تھا لیکن عربوں کی حکومت نے تجارت کو بہت ترقی دی۔ خراسان اور سندھ کے درمیان کابل کے راستہ سے تجارتی قافلوں کی آمد رفت شروع ہوگئی اور غزنی اور قندہار کی راہ سے زابلستان[2] و سجستان تک سندھی تجار پہونچنے لگے۔ یہ راستہ خشکی کا تھا لیکن بحری راستہ سے بھی تجارت جاری تھی اور چین و سراندیپ وغیرہ کا اسباب تجارت سندھ ہو کر اسی ذریعہ سے قسطنطنیہ تک جاتا تھا۔ عرب سے گھوڑے وغیرہ بھی سندھ تک دریا کے راستہ سے آتے تھے۔

ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری

مذہبی معاملات میں بھی عربوں نے سندھیوں کے ساتھ حد درجہ نرمی کا طرز عمل اختیار کیا۔ یہاں کے لوگوں کو عام اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مندروں کی مرمت کرائیں۔ آزادی سے پرستش کریں اور ملک کی آمدنی میں سے ۳ فیصدی کے حساب سے جو حقوق پجاریوں کے مقرر تھے وہ بھی بحال رکھے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ دیبل، نیرون، ملتان وغیرہ میں بعض مندر مسمار بھی کئے گئے۔ مساجد بھی تعمیر ہوئیں لیکن یہ اس وقت ہوا جب حملہ جاری تھا، اور پوری طرح تسلط قایم نہ ہوا تھا۔ قیام سلطنت وحکومت کے بعد کوئی زیادتی نہیں کی گئی اور تمام رعایا کے ساتھ اُسی رواداری کا اظہار کیا گیا جو اسلام کا مخصوص شیوہ رہا ہے۔ ملتان میں سورج دیوتا کا ایک طلائی بُت تھا۔ محمد قاسم کو اس کے سرداروں نے بہت مجبور کیا کہ اسے توڑ ڈالے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور جب تک عربوں کی حکومت ملتان میں قائم رہی یہ بُت بھی بدستور اپنی جگہ نصب رہا۔

---

1 Biog: Dictionary L. N. K. V. Almamuin.

2 مسعودی، زابلستان کا حال بیان کرتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے قلعے پائے جاتے تھے۔ یہاں آبادی مختلف قوموں کی تھی۔ سجستان کے متعلق لکھتا ہے کہ وہاں دریائے ہند مند کے دونوں طرف ساحل پر کثرت سے باغات اور کھیت پائے جاتے اور دریا کے اندر کثرت سے کشتیاں پائی جاتی تھیں اور آب پاشی زیادہ تر ہوائی چرخیوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

مسلمانوں کے حملے سے قبل سندھ میں بعض ایسے قوانین جاری تھے کہ انھوں نے قوموں میں امتیاز پیدا کردیا تھا بعض جماعتوں کے لئے گھوڑے کی سواری، نفیس کپڑوں کا استعمال، ممنوع تھا اور ان کے لئے لازم تھا کہ جب قافلے ان آبادیوں کی طرف گزریں تو رہنمائی کے لئے اپنے آدمی مقرر کریں۔ مسلمانوں نے ان قوانین کو بدستور قایم رکھا اور کوئی تغیر نہیں کیا۔

جب کوئی جماعت کسی ملک میں فاتحانہ طریقہ سے داخل ہوتی ہے، تو فطرتاً اس میں جذباتِ تفوق و برتری پیدا ہو جاتے ہیں اور ان جذبات کے زیر اثر وہ مفتوح جماعتوں کے ساتھ ضرور سختی کرنے لگتی ہے۔ چونکہ اسلام میں یہ طرزِ عمل ممنوع ہے، اس لئے سردارانِ عرب نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ مسلمان فوجیں شہروں کے اندر رہیں کیونکہ اس صورت میں ضرور رعایا کو تکلیف پہونچتی، بلکہ ان کے قیام کے لئے الگ نوآبادیاں بنائیں جن کو جنود و امصار کہتے تھے اور سخت تاکید تھی کہ وہ عام رعایا سے تعلقات قایم نہ کریں (منصورہ، قندابیل، بیضار، محفوظہ اور ملتان وغیرہ انھیں امصارِ عسکری میں سے تھے)۔

جب مسلمان کسی ملک میں پہونچتے ہیں تو شریعتِ اسلام اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا قانون وہی ہے اور وہ کسی دوسرے قانون کو فیصلہ کا ذریعہ بنا ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ سندھ میں بھی یہی قانون رائج کیا گیا اور قاضی مقرر کئے گئے کہ وہ شرع کے مطابق معاملات کو طے کریں لیکن ہندو مجبور کئے گئے کہ وہ بھی اس قانون کو تسلیم کریں چنانچہ وہ اپنے تمام معاملات و نزاعات جن کا تعلق حکومت سے نہ ہوتا پنچائت کے ذریعہ طے کرنے کے مجاز تھے۔

فوج میں اہل سندھ کو بھی آزادی کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس سے ایک فایدہ تو یہ ہوا کہ یہاں کا جنگ آزمودہ عنصر غالب ان کا طرفدار ہوگیا اور دوسرے یہ کہ جب کبھی عربوں نے سرکشی کی تو ان سے کام لے کر اُن کو دبا یا گیا۔ علاوہ اس کے سندھی افواج کو ملک سے باہر بھی دور دراز مقامات میں روانہ کیا گیا، چنانچہ جب سنہ ۱۰۵ھ میں سلطنت بازنطائن پر مسلمانوں نے حملہ کیا تو افواجِ شام میں سندھی دستے بھی موجود تھے۔

عربوں نے جس شان کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا اور جیسی نمایاں کامیابی حاصل کی، اس کا اقتضاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی پیشقدمی اور زیادہ جاری رہتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ صرف سندھ کے اندر ان کی حکومت قایم ہوئی اور وہ بھی تین صدی کے اندر ہی اندر رفتہ رفتہ کمزور ہو کر نیست و نابود ہوگئی اس کے اسباب پر جس قدر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب وہ نفاق تھا جو قبائل عرب میں باہم پیدا ہو گیا تھا۔ اگر خلیفۂ اول یا دوم کے زمانہ میں سندھ فتح ہو گیا ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ آج ہندوستان کی تاریخ کسی اور نہج سے مرتب کی جاتی اور نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں کی سلطنت یہاں کس حد تک وسیع ہو گئی ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ سندھ، بنو امیہ کے عہد میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، جب عرب دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تمام وہ اندرونی سازشیں جو ایک ملک کو تباہ کر دیتی ہیں، آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جارہی

تھیں۔ اگر محمد قاسم اس قبیلہ پرستی کی بنا پر سندھ سے بلاکر قتل نہ کر دیا جاتا تو یہ بالکل یقینی ہے کہ اس کا سلسلۂ فتوحات چین تک پہونچ جاتا جیسا کہ حجاج ابن یوسف کا خیال تھا۔ پھر دقت یہ تھی کہ ہر نئے خلیفہ کے اصول حکومت اپنے پیش رو سے بالکل جدا ہوتے تھے، اور ہر جدید حکمران کے ساتھ ساری دنیا نئی ہو جاتی تھی اس لئے کبھی کوئی گورنر اطمینان و سکون کے ساتھ نہ سندھ میں حکومت کر سکا اور نہ سلسلۂ فتوحات کو بڑھا سکا۔ اگر کسی نے اصلاحات شروع کیں اور آگے بڑھنے کے اسباب فراہم کئے تو بدقسمتی سے خلافت بدل گئی اور اس غریب کو بھی معزول ہو جانا پڑا۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ گورنرانِ سندھ کا مرکزِ خیال بدل گیا اور پایۂ تخت سے ہمدردی اٹھ جانے کی وجہ سے خود مختاری و خودسری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ پھر چونکہ سندھ میں عرب کے مختلف قبایل کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے، اس لئے جب عرب میں قبایل کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہوتا تھا تو یہاں کے قبایل بھی ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتے تھے۔

عہد بنی عباس میں بعض خلفاء ایسے ہوئے کہ یہ اختلاف قبائل چند دن کے لئے انھوں نے مٹا دیا اور اُن کے زمانہ میں سندھ کی حالت بھی بہتر ہو گئی لیکن خلیفہ معتصم کے زمانہ میں یمنی و نزاری نزاعات شروع ہو گئیں اور پھر سندھ انھیں نزاعات کا شکار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ جب مرکزِ حکومت ضعیف ہو جائے گا تو اس کا اثر نزدیک و دور تمام مملکت میں ہر جگہ پڑے گا، چونکہ عہد عباسیہ میں ہارون الرشید ہی کے وقت سے عجمیوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اس لئے تمام اُن مقامات میں جہاں خالص عرب حکومتوں کا تعلق تھا، ضعف پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا، جب خوارج و قرامطہ ملاحدہ اور روافض وغیرہ نے ساری سلطنت کے شیرازہ کو درہم و برہم کر دیا، اور ہر جگہ حکومت کی عمارت متزلزل ہو گئی چونکہ سندھ پایۂ تخت سے بہت دور واقع تھا اور تمام شورش پسند جماعتوں کے لئے ایک اچھی جائے پناہ بن سکتا تھا۔ اس لئے یہاں خوارج و زنادقہ، ملاحدہ و علویین نے کافی قوت حاصل کر لی اور تمام کمران و سندھ میں پھیل کر سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ اب تک بہت سے خاندان سیدوں کے سندھ میں ایسے باقی ہیں جو انھیں علویین کی اولاد میں سے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف سندھ کے اندر اپنے مستقل شہر قایم کئے بلکہ مشرقی ہندوستان تک بڑھ آئے۔ چنانچہ اکثر موجودہ خاندان سادات، انھیں علویین کی ذریات میں سے ہیں جو کسی وقت وادی سندھ میں آکر ٹھٹھ اور بھکر پر مستولی ہو گئے تھے۔

یہ بالکل یقینی ہے کہ جب عربوں نے سندھ پر حملہ کیا، اس وقت یہاں بودھ مذہب عام طور سے رائج تھا۔ بلاذری نے ملتان میں سورج کے مندر کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام بُد لکھا ہے جس سے مراد غالباً بت نہیں بلکہ بودھ ہے دیبل میں جو مندر تھا وہ بھی بودھ ہی کا تھا۔ اس کے متعلق تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ اس کی بلندی ۱۲۰ فٹ تھی اور اس کے اوپر ایک قبہ یا گنبد بنا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ بودھ کا ٹوپ رہا ہو۔ جیسا کہ سانچی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

اگرچہ چچ جس نے دیبل میں قبضہ کرلیا تھا برہمن تھا لیکن بت پرستی کے لحاظ سے برہمن قوم ایسی نہیں ہے جو بودھ کی پرستش کو منع کرتی یا خود اس طرف مائل نہ ہوجاتی، اس لئے بالکل ممکن ہے کہ چچ اور داہر، بودھ کے اس مندر کو عظمت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں اور فی الجملہ بودھ ہوگئے ہوں۔

اس امر کا ثبوت کہ اسوقت بودھ مذہب کا رواج تھا، نہ صرف چینی سیاحوں اور ابن خورداذبہ[1] کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے بلکہ خود عربوں کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً بلاذری کا بیان ہے کہ "مندر کے پجاریوں کو سمنی کہتے تھے"۔ سمنی سنسکرت لفظ سرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مذہبی بھکاری، اور مذہبی بھکاری خصوصیت کے ساتھ بودھ مذہب ہی میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح چچ نامہ میں لکھا ہے کہ جب محمد قاسم نے دیبل فتح کیا تو وہاں کے ایک ہزار برہمنوں نے استدعا کی کہ انھیں اپنے مراسم قدیم پر قایم رہنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی یہ استدعا قبول کی گئی اور وہ بدستور ہر صبح اٹھ کر ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لئے ہوئے بھیک مانگا کرتے تھے اور یہ طریقہ بودھ مذہب والوں ہی کا ہے۔ اس کے ساتھ اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ اس وقت تاریخوں میں کہیں گائے کی پوجا یا ستی وغیرہ کا ذکر نہیں ہے (جو ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہے) تو یہ امر اور زیادہ محقق ہوجاتا ہے کہ اس وقت سندھ میں بودھ مذہب ہی رائج تھا۔

---

[1] کتاب المسالک والممالک" کا مصنف ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ بن خورداذبہ تھا جو عام طور سے "ابن خورداذبہ" کے نام سے مشہور ہے۔ "خورداذبہ" کا جد اعلیٰ مذہباً آتش پرست تھا جو بعد کو مسلمان ہوگیا۔

ابن خورداذبہ (ابوالقاسم) نے خلفائے عباسیہ کے وقت میں بہت عزت حاصل کی اور مختلف ممالک کی جغرافی تحقیقات کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف کی۔ سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء میں اس نے انتقال کیا۔

کچھ زمانہ قبل ابن خورداذبہ کا تشخص مابہ النزاع امر تھا بعض کہتے تھے کہ ابواسحاق اسطخری اور یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں لیکن جب سے اصطخری کی کتاب جداگانہ شایع ہوگئی ہے، اس وقت سے یہ امر صاف ہوگیا ہے کہ یہ دونوں ہستیاں الگ الگ تھیں۔

باب سوم

فرماں روایانِ خاندانِ غزنوی

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عربوں کا حملہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر زیادہ بار آور ثابت نہیں ہوا اور ریگستان سندھ سے آگے بڑھ کر اُن کی حکومت اندرونِ ملک میں وسیع نہ ہو سکی، جس کا بڑا سبب صرف یہ تھا کہ مرکزِ خلافت اس تحریک و پیشقدمی کی طرف سے غافل تھا اور اس نے کوئی توجہ اس طرف نہیں کی۔ اسلئے ہندوستان کی اسلامی حکومت حقیقتاً عربوں کی تاریخ سے بالکل جدا چیز ہے اور اس کا تعلق صرف ترکوں سے ہے، جنھوں نے وسطِ ایشیا سے نکلکر مختلف ملکوں اور زمانوں میں اپنے فتوحات کے سیلاب سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور ساری دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔

مرکزِ خلافت میں ایرانی اثر و نفوذ

خلافتِ بنی امیہ کے بعد جب مرکزِ خلافت بجائے دمشق کے بغداد قرار پایا تو اسی کے ساتھ جو اہم اور تاریخ خیز تغیر نظامِ سلطنت میں پیدا ہوا، یہ تھا کہ خالص عربی حکومت میں ایرانی اثرات غالب ہونے لگے اور رفتہ رفتہ ایرانیوں نے عربوں کو ہٹا کر ان کی تمام ممتاز خدمتیں خود اختیار کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب خلافت زیادہ ضعیف ہو گئی تو تمام ایرانی امراء جو دور دراز صوبوں میں عامل مقرر تھے، خود مختار بننے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ ان ہی خود مختار حکومتوں میں سے ایک نہایت مشہور حکومت، سامانی[1] خاندان کی بھی تھی۔

---

[1] اس خاندان کا نام سامانی اس لئے ہے کہ اس کے مورثِ اعلیٰ کا نام سامان تھا۔ یہ بلخ کا ایرانی النسل امیر تھا جس نے اسد بن عبداللہ گورنرِ خراسان کی فیضِ صحبت سے زردشتی مذہب ترک کر کے اسلام اختیار کیا اور اپنے بیٹے کا نام گورنرِ خراسان کے نام پر اسد رکھا۔

اسد کے چار بیٹے تھے جنھوں نے خلیفہ مامون الرشید (خلیفۂ عباسی) کے عہد میں نمایاں خدمات انجام دیں اور ۲۰۴ھ ۸۱۹ء میں انکو مختلف صوبوں کی گورنری دی گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ کیجئے)

حکومتِ خلافت میں ایرانی اثرات

ترک غلاموں کا عروج

حکومتِ سامانی کا زوال

جب حکومتِ خلافت میں ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ عربوں کی بے چینیاں بڑھیں اور اندرونی نزاعات نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کی، تو خلفاء کو خود اپنی حفاظت کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہوئی جو عربوں اور ایرانیوں سے علٰحدہ ہو۔ چنانچہ اس غرض کے لئے وہ ترک غلام منتخب کئے گئے جو فتوحاتِ شمال کا یغمائے جمیل شمار کئے جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ترک غلاموں کی حفاظت میں جو بے انتہا شجاع تھے، خلفاءِ بغداد، عربوں اور ایرانیوں کے خطرہ سے تو بالکل مطمئن ہو گئے، لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ اس طرح وہ ایک تیسرے خطرہ کی پرورش کر رہے ہیں، جو عربوں اور ایرانیوں کے خطرہ سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہونے والا ہے۔ چند دن تک تو ترک خاموش رہے لیکن اس کے بعد انھوں نے اپنی آرزوؤں کو وسیع کرنا شروع کیا، حتےٰ کہ خلیفہ کا عزل و نصب بھی انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مصر سے لیکر سمرقند تک تمام سلطنتِ اسلام میں ہر جگہ جلوۂ ترکانہ نظر آنے لگا۔ اور اپنے بھائیوں کے اس عروج و زوال کو دیکھ کر تمام ترک جماعتیں کوہستانوں سے نکل کر سارے ایران پر چھا گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایران کی سامانی حکومت دو صدی کے بعد پاش پاش ہو گئی اور یہی وہ ہنگامہ تھا جس نے سب سے پہلے حملۂ ہندوستان کی بنیاد کوہستان غزنی میں قائم کی۔

(بقیہ نوٹ نوٹ صفحہ ۳۴)

نوح کو سمرقند کا حاکم بنایا گیا، احمد کو فرغانہ دیا گیا، یحییٰ کو شاش مرحمت ہوا، اور الیاس کو ہرات۔ ان میں سے احمد نے بہت ترقی کی۔ یہ نوح کے بعد نہ صرف سمرقند کا حاکم قرار پایا بلکہ اس نے کاشغر کو بھی اپنے حدودِ حکومت میں شامل کر لیا۔ اس کے ایک بیٹے اسماعیل نے ۲۹۰ھ میں صفاریوں سے خراسان لے لیا۔ محمد بن زید نے طبرستان کے علوی فرمانروا کو شکست دی، اور ایک طرف حدودِ ہند سے بغداد تک اور دوسری طرف صحرا ریگستان سے خلیج فارس تک اپنے قلمرو کو وسیع کر لیا۔ لیکن چونکہ ماوراء النہر اس کی حکومت کا خاص مرکز تھا اس لئے سمرقند و بخارا چند دن میں تعلیم و تہذیب کا گہوارہ بن گئے۔

اس کے جانشین ایسے کامیاب ثابت نہ ہوئے کیونکہ ایک طرف خراسان و سجستان میں بغاوتیں رونما ہونے لگیں اور دوسری طرف بویہ خاندان کی ترقی نے اس کے عروج کو صدمہ پہونچایا، یہاں تک کہ نصف صدی میں حدودِ سلطنت صرف ماوراء النہر تک رہ گئے اور یہاں بھی ترکی غلاموں اور ترکی امراء نے جو دربار سامانی کے روحِ رواں بنے ہوئے تھے، آلِ سامان کی گزشتہ شوکت و جبروت کو بہت جلد خاک میں ملا دیا۔ انھیں ترک غلاموں میں سے ایک الپتگین تھا جس نے غزنوی خاندان کی طرح ڈالی اور ۳۸۴ھ میں دریائے جیحون کے جنوبی حصہ ماوراء النہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ شمال کا علاقہ ترکستان کے "ایلک خانیوں" نے دبا رکھا تھا۔ جو فرغانہ سے لیکر حدودِ چین تک ترکی قبائل پر اقتدار رکھتے تھے اور جنھوں نے آخر کار ۳۸۹ھ میں ماوراء النہر پر حملہ کر کے اور بخارا پر قابض ہو کر ۳۸۹ھ میں آلِ سامان کی حکومت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ آلِ سامان کے خاندان نے ۲۶۱ھ سے ۳۸۹ھ تک حکومت کی۔

انھیں ترک سرداروں میں جو حقیقتاً ایک غلام کی حیثیت سے بڑھ کر آقا کے درجہ تک پہونچ گئے ایک الپ تگین[۱] بھی تھا جس نے صرف دو ہزار سواروں کی مدد سے قلعۂ غزنی پر قبضہ کر کے (۳۵۱ھ / ۹۶۲ء) اپنی مستقل حکومت قایم کرلی[۲] اور اسی الپ تگین کا غلام سبکتگین تھا جس نے سب سے پہلی مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا اور پھر بعد کو اس کے بیٹے محمود فاتح سومنات نے حکومتِ ہندوستان کے راستہ کو مسلمانوں کے لئے صاف اور آسان بنا دیا۔

سبکتگین کے متعلق منہاج سراج نے بروایت امام ابوالفضل بیہقی[۳] لکھا ہے کہ عبدالملک نوح، سامانی فرمانروا کے عہد میں ایک سوداگر، نصر حاجی نامی اس کو ترکستان سے خرید کر بخارا لایا تھا۔ اور الپ تگین نے جو اس وقت امیر حاجب کے درجہ پر ممتاز تھا اس کو مول لے لیا تھا۔

۱۔ نصر اول سامانی فرمانروا کا غلام، جو بعد کو آزاد کر دیا گیا۔ بعض مورخین امیر نوح سامانی کا غلام ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۶۰ھ / ۸۷۴ء اسکا سنہ ولادت ہے۔ بعد کو یہ امیر نوح سامانی کے عہد میں امیر حاجب کے درجہ تک پہونچ گیا۔

۲۔ الپ تگین، عبدالملک ابن نوح کے عہد میں (جو سامانی خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا) خراسان کا گورنر تھا۔ جب عبدالملک کا انتقال ہوا تو امراء بخارا نے الپ تگین کے پاس قاصد روانہ کر کے پوچھا کہ اب آل سامان میں تخت کس کو دیا جائے۔ الپ تگین نے جواب میں لکھا کہ عبدالملک کا بیٹا منصور ہنوز کمسن ہے، اس لئے اس کے چچا کو فرمانروا منتخب کرنا چاہئے۔ ابھی یہ قاصد بخارا نہ پہونچا تھا کہ امراء نے اتفاق کر کے منصور کو تخت نشین کر دیا۔ جب الپ تگین کا جواب پہونچا تو منصور بہت برہم ہوا اور الپ تگین کو حکومت خراسان سے معزول کر کے اپنے پاس طلب کیا۔ مگر یہ ایسا نادان نہ تھا کہ چلا جاتا۔ سیدھا غزنی پہونچا اور یہاں کے حاکم امیر انوک کو شکست دیکر خود قبضہ کر لیا۔ اسکے بعد منصور نے دو بار الپ تگین کے خلاف لشکر بھیجا لیکن کامیابی نہیں ہوئی اس نے پندرہ سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ افغانستان میں حکومت کی ۳۶۵ھ / ۹۷۵ء اس کی تاریخ وفات ہے۔

۳۔ مصنف کا پورا نام ابوالفضل بن الحسن البیہقی ہے۔ اور کتاب کا نام تاریخ آل سبکتگین، جسے تاریخ بیہقی اور مجلدات بیہقی بھی کہتے ہیں۔ صاحب تاریخ وصاف، نے ابوالفضل بیہقی سے ایک کتاب تاریخ ناصری بھی منسوب کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت تاریخ آلِ سبکتگین کے اس حصہ کو جو امیر ناصرالدین سبکتگین کے حالات کے متعلق تھا، تاریخ ناصری کہتے تھے، جس طرح مسعود کے حالات کی جلدیں تاریخ مسعودی کہلاتی ہیں۔ قصاید عنصری سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود سے متعلق جو حصہ تاریخ کا تھا اُسے تاج الفتوح کہتے تھے۔

خود مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۱ھ / ۱۰۱۰ء میں اس کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ اور حالات ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء تک کے لکھے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابوالفضل بیہقی کی عمر ستر سے بھی متجاوز تھی۔ حاکی شیرازی نے اُن کی تاریخ وفات ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷ء متعین کی ہے۔

حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندانِ غزنی کی نہایت مفصل تاریخ ہے میرخوند نے روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ اس کی تیس جلدیں تھیں فرشتہ نے بھی محمود کے حالات میں مجلداتِ ابوالفضل کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ فرشتہ نے اُسے خود دیکھا بھی تھا۔ کیونکہ محمود کے حالات لکھنے میں تو قطعاً اس سے مدد نہیں لی گئی اور بہت سے اہم واقعات ترک کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ گزیدہ میں بھی اس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اور ضیاء برنی و ابوالفضل نے بھی امام بیہقی کا ذکر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ تاریخ اب ناپید ہے اور اسکے صرف چند اجزا کہیں کہیں دستیاب ہوتے ہیں جن سے مسٹر الیٹ نے اپنی مشہور تاریخ میں مدد لی ہے۔

چونکہ سبکتگین کے اطوار و عادات سے حد درجہ فراست و ذہانت پیدا تھی اس لئے الپتگین نے اس کو بہت جلد لشکر کا سپہ سالار بنا دیا۔ اور بعض مورخین کا بیان ہے کہ اپنی لڑکی سے شادی بھی کر دی[۱]۔

سبکتگین کے سلسلۂ نسب کے متعلق طبقاتِ ناصری میں بہ روایت ابو القاسم حمادی (مصنف تاریخ مجدول) تحریر ہے کہ جب یزدجرد، شہریار ایران، حضرت عثمان کی خلافت میں بمقام مرو ہلاک ہوا، تو اس کے ساتھی ترکستان چلے آئے اور یہاں قرابت پیدا کر لی۔ اس لئے پانچ واسطوں[۲] سے سبکتگین کا سلسلۂ نسب یزدجرد سے ملتا ہے۔

سبکتگین کا مورثِ اعلیٰ، یزدجرد ہو یا کوئی اور اس میں کلام نہیں کہ پانچ پشتوں کے بعد اس کو سوائے ترکی النسل کہنے کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس میں جو شجاعت و جلادت پائی جاتی تھی اس کا تعلق ترکستان ہی کی آب و ہوا سے تھا نہ کہ یزدجرد کے ایرانی خون سے۔

جب الپتگین کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اسحاق تخت نشین ہوا لیکن ایک سال بعد یہ بھی مر گیا اور بلکاتگین (جو اس وقت جماعتِ اتراک میں سب سے زیادہ بزرگ تھا اور الپتگین کے ساتھ نسبت غلامی بھی رکھتا تھا) اس کا جانشین ہوا۔ یہ بھی صرف دو سال زندہ رہا اور اس کے بعد امیر پیری حکمران ہوا۔ چونکہ یہ فسادی اور ظالم شخص تھا، اس لئے غزنی کی ایک جماعت نے ابو علی انوک کو (جو پہلے یہاں کا حاکم تھا اور جسے الپتگین نے نکال دیا تھا) دعوت دی۔ لیکن سبکتگین نے اسے آنے نہیں دیا۔

اس کے بعد چونکہ لوگ امیر پیری سے تنگ آ گئے تھے اس لئے بالاتفاق سبکتگین کو بتاریخ ۲۷ شعبان ۳۶۶ھ[۳] فرمانروا تسلیم کیا گیا۔

حکومتِ غزنی گو الپتگین ہی کے وقت سے بالکل علحدہ تھی، تاہم خفیف سا تعلق سامانی حکومت سے باقی تھا اور غزنی کا فرمانروا فی المعنی سلطنتِ بخارا کا ماتحت سمجھا جاتا تھا لیکن جب سبکتگین یہاں کا فرمانروا ہوا تو اس نے حقیقی معنی میں غزنی کی حکومت کو بالکل علحدہ کر لیا اور سامانی حکومت (جو خود ہی اپنی زیست کے آخری لمحات سے گزر رہی تھی) پھر افغانستان کو اپنے ساتھ شامل نہ کر سکی۔

سبکتگین نے تخت نشین ہوتے ہی حدودِ سلطنت کو وسیع کرنے کی فکریں شروع کیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں بست کے فرمانروا، طغانے سبکتگین کی امداد چاہی اور وعدہ کیا کہ اگر اس کی مدد سے وہ دوبارہ بست پر قابض ہو گیا تو ہمیشہ مطیع رہے گا۔ سبکتگین نے اس کو مدد دی اور بایتور کو جو وہاں قابض ہو گیا تھا نکال کر طغا کو حکمران

---

[۱] فرشتہ ۔ ۱۸ ۔ [۲] سبکتگین ابن جوق قرابجکم، ابن قرا ارسلان، ابن قرا ملت، ابن قرا نعمان، ابن فیروز، بن یزدجرد شاہ ایران۔

[۳] طبقات ناصری ۔ ۷ ۔ فرشتہ نے ۳۶۷ھ تحریر کیا ہے۔

بنایا۔ لیکن طغا نے بعد کو دھوکا دیا۔ اس لئے سبکتگین نے قلعۂ بُست پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضہ سے چاہے کچھ فایدہ نہ ہوا ہو، لیکن ابوالفتح علی بن محمد کا ہاتھ آجانا جو بُست میں خانہ نشین تھا، سبکتگین کے لئے بڑی نعمت تھی۔ یہ شخص بہت سے فنون کا ماہر تھا اور فن کتابت میں تو نظیر نہ رکھتا تھا۔[1] جب بُست پر قبضہ ہو گیا تو سبکتگین نے قصدار کی طرف توجہ کی۔ قصدار غزنی کے قریب واقع تھا اور یہاں کا فرمانروا اس وقت تک تختِ غزنی کا ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے فرمانروا نے سبکتگین سے بغاوت کی کیونکہ اس کے نزدیک کوہستان کے سخت راستوں کو طے کرنا اور وہاں کے ناقابل تسخیر قلعہ پر قابض ہو جانا امیر سبکتگین کے بس کی بات نہ ہوگی۔ لیکن تجربہ نے اس کے خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ کیونکہ امیر سبکتگین نے بغاوت کی خبر سنتے ہی حملہ کر دیا اور بہت جلد قصدار پر قابض ہو گیا۔[2]

فتحِ بُست و قصدار کے بعد امیر سبکتگین حدودِ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا اور چند ایسے مقامات پر قابض ہو گیا جن کا تعلق حکومتِ پنجاب سے تھا۔ جب یہاں راجہ جے پال کو خبر پہونچی تو ایک بڑی فوج کے ساتھ جس میں بہت سے ہاتھی بھی تھے، بڑھا اور کئی دن جنگ جاری رہی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں سخت برف باری ہوئی[3] اور جے پال کی فوج، جو کبھی اس منظر سے آشنا نہ تھی، خائف ہو کر بد دل ہو گئی۔ جے پال نے اطاعت اختیار کی اور بہت کچھ زرِ فدیہ[4] دینے کا وعدہ کر کے واپس ہوا۔

محمود نے اول اول اس اظہارِ اطاعت کی مخالفت کی لیکن سبکتگین، جو خونریزی کو پسند نہ کرتا تھا مان گیا اور چند معتبر آدمی جے پال کے ساتھ کئے گئے تاکہ اس کے صداقتِ وعدہ کا حال معلوم ہو جائے

جب جے پال دور نکل آیا تو وہ اپنے وعدہ سے منحرف ہو گیا اور امیر سبکتگین کے بھیجے ہوئے آدمیوں کو اس نے قید کر لیا۔

جس وقت یہ خبر غزنی پہونچی تو امیر سخت برہم ہوا اور دوبارہ حملہ کرنے کی غرض سے ملتان کی طرف بڑھا۔ جے پال نے بھی کالنجر، قنوج، اجمیر وغیرہ کے راجاؤں کو لکھا اور وہاں سے امدادی فوجیں کثرت سے آئیں۔ اس جنگ کا نتیجہ جے پال کے خلاف ہوا اور اُسے بھاگنا پڑا۔ سبکتگین کا اس فتح سے دریائے اٹک تک قبضہ ہو گیا۔ اور

---

[1] فرشتہ - ۱۹ - روضۃ الصفا - ۴ - ۲۸ ―― [2] تاریخ یمینی - ۲ - ۱۸ -

[3] عتبی کا بیان ہے کہ محمود بھی اپنے باپ سبکتگین کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھا۔

[4] عتبی اور جوامع الحکایات وغیرہ، اس برف باری کے متعلق ایک عجیب حکایت لکھی ہے کہ یہاں پہاڑ میں ایک چشمہ تھا اسکے متعلق مشہور تھا کہ اگر اس میں کوئی نجس چیز ڈالدی جائے تو برف کا طوفان برپا ہو جاتا ہے، چنانچہ امیر محمود نے اسی ترکیب سے یہ طوفان پیدا کر کے اپنے دشمن کو خائف کیا

[5] دس لاکھ سکۂ طلائی اور پچاس ہاتھی زرِ فدیہ قرار پایا۔

فتوحاتِ ہند کی تکمیل

ملتان[1] کی افغان و خلجی آبادی بھی مطیع ہوگئی اس کے بعد امیر سبکتگین نے پشاور کو ہندوستان کے اس صوبہ کا صدر مقام قرار دیکر اپنی فوج وہاں چھوڑ دی اور ایک عامل مقرر کردیا[2]۔ فتوحاتِ ہند کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد امیر سبکتگین، امیر نوح سامانی فرمانروا کی کمک کے لئے روانہ ہوا اور اس ذریعہ سے خراسان کی طرف بھی اس کے اثرات قایم ہوگئے۔

محمود اور اسماعیل کی جنگ

جب ۳۸۷ھ ۹۹۷ء میں امیر سبکتگین کا انتقال ہوا، تو سیف الدولہ محمود اس کا بڑا بیٹا نیشاپور میں تھا۔ اس لئے چھوٹا بیٹا امیر اسماعیل بلخ میں اپنے باپ کی جگہ جانشین ہوا۔ محمود نے ایک تعزیت نامہ اپنے بھائی کو لکھکر سمجھایا کہ حکمرانی کے لئے بہت تجربہ کی ضرورت ہے اور تم میں وہ پایا نہیں جاتا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ غزنین مجھے دیدو۔ بلخ و خراسان کا ملک میں تمھارے لئے صاف کئے دیتا ہوں۔ باپ نے اگر تمھیں جانشین کردیا تھا، تو مصلحت اسی میں تھی، کیونکہ میں دور تھا اور تخت کا خالی رہنا مناسب نہ تھا۔ امیر اسماعیل اس پر راضی نہ ہوا اور آخرکار دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی اسماعیل گرفتار ہوگیا اور غزنی پر محمود کی حکومت قایم ہوگئی[3]۔ اس کے بعد محمود نے بلخ، خراسان، ہرات و سیستان پر تصرف قایم کرکے، اپنے نام کا خطبہ و سکہ وہاں جاری کیا اور پھر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔

محمود کی تخت نشینی غزنی پر

محمود کی فاتحانہ زندگی کا ممتاز ترین کارنامہ وہ ہے جو سرزمینِ ہند سے متعلق ہے، کیونکہ مسلمانوں میں سب سے پہلا وہ شخص جس نے ہندوستان میں ایک مستقل حکومتِ اسلام کی بنیاد قایم کی محمود ہی تھا۔

محمود کے حملے ہندوستان پر

وہ ہندوستان پر کتنی بار حملہ آور ہوا۔ کن کن مقامات کو فتح کیا، اب اُن مقامات کا پتہ، موجودہ جغرافیہ کے لحاظ سے کیونکر چل سکتا ہے؟۔ یہ تمام وہ سوالات ہیں جو تاریخ خاندانِ غزنی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور اختلافِ مؤرخین غلطیِ کتابت تحریفِ الفاظ وغیرہ نے اس بحث کو زیادہ دقیق و دشوار بنا دیا ہے، تاہم چونکہ محمود کا یہی ایک کارنامہ ایسا ہے جو اس کی ملوکانہ پیش قدمی و اسکندرانہ اولوالعزمی کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے ہم اسے جداگانہ بیان کریں گے۔ تاہم یہاں سلسلۂ کلام قایم رکھنے کے لئے مختصراً اتنا بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ۲۵ سال کے عرصہ میں، اُس نے ہندوستان پر سترہ مرتبہ حملہ کیا اور باوجود اس کے کہ اس کا مقصود ان حملوں سے یہاں کوئی مستقل قیام کرنا نہ تھا تاہم پنجاب کا تمام مغربی حصہ حکومتِ غزنی میں شامل ہوگیا اور قنوج و گجرات تک مسلمانوں کا اثر قایم ہوگیا۔

محمود کی وفات۔

محمود نے ۶۱ سال کی عمر میں ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء میں وفات پائی اور ۳۲ سال تک حکومت کی[4]۔

---

[1] نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ "ملتان شہرے ست از دیار سند از اعمال غزنین" چہار مقالہ - ۱۸

[2] تاریخ یمینی - ۲۱ - ۲۲ - (ایلیٹ) [3] روضۃ الصفا ہم - ۳۰ - [4] طبقات ناصری - ۱۱ -

محمود نے اپنے بعد دو بیٹے چھوڑے محمد و مسعود ــــ محمد بے انتہا نیک نفس اور مہذب و شایستہ شہزادہ تھا اور مسعود ویسا ہی شجاع اور اولوالعزم تھا۔ محمود نے پہلے مسعود ہی کو اپنا ولی عہد قرار دیا تھا۔ لیکن بعد کو اُس سے بدظن ہو گیا اور محمد کو اپنا جانشین قرار دیا۔

جب محمود کا انتقال ہوا تو مسعود اصفاہان میں تھا اس لئے محمد بغیر کسی مزاحمت کے تخت نشین ہو گیا۔ لیکن چونکہ محمد کی طرف سے سپاہ کو کوئی توقع نہ تھی اور مسعود کی فتوحات نے غلغلہ بلند کر رکھا تھا۔ اس لئے اس طرف محمد کی سپاہ اس سے منحرف ہو گئی اور دوسری طرف خود مسعود نے غزنی پر حملہ کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمود کے بعد ۵ مہینے کے اندر ہی محمد کی حکومت ختم ہو گئی اور مسعود محمد کو گرفتار کرکے ۴۲۲ھ ۱۰۳۱ء میں تخت نشین ہو گیا[1]۔

ہر چند مسعود کے عہد میں ہندوستان کی طرف خصوصیت کے ساتھ کوئی توجہ نہ ہو سکی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ سلجوقیوں[2] کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ وسط ایشیا کے اندر اپنے مقبوضات کے تحفظ میں مصروف رہا لیکن

---

[1] طبقات ناصری - ۱۳-

[2] حکومتِ سلاجقہ تاریخِ اسلام کا نہایت ممتاز و نمایاں باب ہے اور اس میں کلام نہیں کہ مغربی ایشیا میں کوئی حکومت مسلمانوں کی ایسی زبردست و ترقی یافتہ ثابت نہیں ہوئی جیسی سلجوقیوں کی۔ جس وقت سلجوقیوں کا زور ہوا ہے۔ خلافت بغداد کا عروج ختم ہو چکا تھا اور تمام مملکتِ اسلام پارہ پارہ ہو کر مختلف خود مختار خاندانوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ صرف مصر کا فاطمی خاندان ایسا باقی تھا جس کو کچھ شاہانہ اقتدار حاصل تھا ورنہ ہر جگہ ملوکِ طوائف نظر آتے تھے۔ اور اس منتشر شیرازہ کو کوئی یکجا کر دینے والا نظر نہ آتا تھا۔

شام و عراق کے شمال میں شیوخِ عرب نے اپنی ریاستیں قایم کر لی تھیں اور ایران میں متعدد خاندان مختلف مقامات پر حکمرانی کر رہے تھے۔ الغرض یہی زمانہ تھا جب وحشی و غیر مہذب ترکوں نے خروج کیا اور نہایت قلیل زمانہ میں وہ تمام ایران، عراق، شام اور ایشیا، کوچک پر چھا گئے۔ انھوں نے نہ صرف مغربی حدودِ افغانستان سے لیکر بحرِ روم تک اپنا اقتدار قایم کر لیا۔ بلکہ منتشر قوتوں کو یکجا کرکے تمام خاندانوں کو لاکر ایک پرچم کے نیچے مجتمع کر دیا اور یہی وہ بات تھی جس نے سلاجقہ کی حکومت کو تاریخ اسلام میں خاص اہمیت سے ممتاز بنا دیا ہے۔

سلاجقہ کا مورثِ اعلیٰ سلجوق بن یکاک ایک ترکی سوار تھا جو خوانینِ ترکستان کے دربار سے وابستہ تھا۔ سلجوق مع اپنے سارے قبیلے کے جند (صوبہ بخارا کا ایک مقام) آیا اور اسلام قبول کیا۔

اس نے اور اس کے بیٹے اور پوتوں نے سامانیوں، ایلک خانیوں، اور محمود غزنوی کی باہم لڑائیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اور طغرل بیگ و چغر بیگ دونوں بھائیوں نے (جو میکائیل کے بیٹے اور سلجوق کے پوتے تھے) اس قدر ترقی حاصل کی کہ غزنوی افواج کے مقابلہ میں متعدد فتوحات حاصل کرکے صوبہ خراسان کے اکثر اہم مقامات چھین لئے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۱ پر ملاحظہ ہو)

پھر بھی اس نے اپنے باپ کے مفتوحہ ملک کی طرف سے غفلت نہیں کی اور ایک سے زاید مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا چنانچہ ۴۲۴ھ ۱۰۳۳ء میں اس نے سالار مسعود غازی کو (جو محمود غزنوی کے بھانجے تھے) سیف الدین کی مدد کے لئے بہرائچ روانہ کیا جہاں آپ شہید ہوئے اور اب بھی آپ کا مزار مرجع خلائق ہے (مرآت مسعودی[1] میں آپ کی جنگ اور شہادت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۰)

۴۲۹ھ ۱۰۳۷ء میں مسجدِ مرو کے اندر چغرل بیگ داؤد کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور طغرل بیگ، نیشاپور میں حکمران تسلیم کیا گیا۔

اس کے بعد بلخ، جرجان، طبرستان اور خوارزم بھی اس حکومت میں شامل ہو گئے اور ۴۳۳ھ کے بعد چار سال کے اندر ہمدان، دینا وار، حلوان، رے اصفہان پر بھی قبضہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ۴۴۷ھ میں طغرل بیگ، بغداد میں داخل ہوا اور اپنے تئیں سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

جب سلاجقہ کی ترقی اس حد تک بڑھ گئی، اور ترکی قبایل بھی ان کی فوج میں داخل ہونے لگے اور ۴۷۰ھ ۱۰۷۷ء تک سارا مغربی ایشیاء حدودِ افغانستان سے لیکر (ایشیائے کوچک میں) سلطنت یونان تک اور مغرب میں خلافتِ فاطمی کی جولانگاہ یعنی مصر کی سرحد تک انکے قبضہ میں آگیا۔ طغرل بیگ، الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانہ تک تو یہ ساری سلطنت ایک مرکز سے وابستہ رہی۔ لیکن ان کے بعد اختلاف پیدا ہو کر ملک کے مختلف حصے ہو گئے اور اسی خاندان کے متعدد افراد خود مختار ہو کر وہاں حکومت کرنے لگے۔ چنانچہ کرمان، عراق، شام، روم (ایشیائے کوچک) میں علحدہ علحدہ سلجوقی حکومتیں قایم ہو گئیں۔ مشرق میں خوارزم شاہیوں نے سلاجقہ کا خاتمہ کر دیا۔ آذربیجان، عراق اور دیار بکر میں سلجوقی افسروں نے اپنی اپنی حکومتیں جداگانہ قایم کر لیں جنھیں اتابک کہتے ہیں۔ البتہ روم میں یہ اسوقت تک قایم رہی جب تک عثمانی ترکوں نے ان کو نیست و نابود نہیں کر دیا۔

[1] مرآۃِ مسعودی کے مصنف کا نام عبدالرحمن چشتی تھا۔ ہر چند اس کتاب میں کوئی تاریخ تصنیف درج نہیں ہے۔ لیکن خود اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں یہ کتاب مرتب ہوئی۔ سبب تالیف اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ "سالار مسعود غازی کے حالات چونکہ اسوقت تک قابل اعتبار توجہ سے کہیں یکجا نہیں کئے گئے تھے، اس لئے میں نے نہایت محنت و تلاش سے انھیں فراہم کر کے یہ کتاب مرتب کی"

اتفاق سے عبدالرحمن چشتی کو ملا محمد غزنوی کی لکھی ہوئی کتاب (تاریخ محمودی) دستیاب ہو گئی۔ اور اس سے بہت مدد اسکو ملی۔ یہ ملا محمد غزنوی، سلطان محمود، سالار ساہو (سالار مسعود غازی کے باپ) اور خود سالار مسعود غازی کی ملازمت میں رہا تھا اور اس لئے اس نے خود چشم دید واقعات دربار محمود وغیرہ کے لکھے تھے۔

ہر چند عبدالرحمن چشتی نے روضۃ الصفا، منتخب التواریخ، اور منہاج سراج کی تاریخ فیروز شاہی سے بھی مدد لی ہے۔ لیکن اس کا اصل ماخذ یہی تاریخ محمودی ہے۔ فن تاریخ کے لحاظ سے اس کتاب کا درجہ بلند نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ تاریخی قصص و حکایات میں اس کو جگہ دیجا سکتی ہے۔

کے مفصل واقعات درج ہیں) اور ۴۲۹ھ ۱۰۳۷ء میں خود اُس نے قلعۂ ہانسی[1] اور قلعۂ سومنات کو فتح کیا[2]۔ اس کے بعد سلجوقیوں کے خلاف خراسان اور مرو وغیرہ کی طرف مشغول رہا اور آخرکار جب ۴۳۲ھ میں وہ افواج فراہم کرنے کی غرض سے غزنی سے پھر ہندوستان آیا، تو اُس کی سپاہ منحرف ہوگئی اور دس سال حکومت کرنے کے بعد معزول کرکے اس کے بھائی محمد کو تخت نشین کردیا۔

بعد کو جب مسعود قتل کیا گیا تو اس کا بیٹا مودود بلخ میں تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ انتقام لینے کے لئے روانہ ہوا اور ۴۳۲ھ[3] میں محمد[4] کو قتل کرکے خود تخت نشین ہوگیا۔ مودود نے ۹ سال تک[5] حکومت کی۔ اس عرصہ میں ماوراء النہر کا علاقہ مطیع ہوگیا۔ اور ہر چند الپ ارسلان سلجوقی نے گرم سیر میں مودود کی سپاہ کو اُلجھائے رکھا لیکن آخرکار اسے بھی شکست ہوئی۔

ہندوستان سے متعلق اس کے عہد میں صرف دو واقعے قابل ذکر ہیں ایک مجدود کی بغاوت۔ دوسرے راجہ دہلی کی سرکشی۔ ان دونوں کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جب مسعود، ہانسی اور سومنات فتح کرکے لاہور واپس گیا تو اُس نے اپنے بیٹے ابوالمجدود کو طبل و علم عنایت کرکے یہاں کا انتظام اُس کے سپرد کردیا تھا۔ جب مسعود کے بعد مودود تخت نشین ہوا تو مجدود نے سرکشی اختیار کی اور خود مختار بن جانے کی کوششیں کیں۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ ایاز خاں[6]، ابن آتابک کی مدد سے ملتان سے لاہور آیا اور سندھ سے لیکر تھانیسر اور ہانسی کا سارا قلعہ لیکر، دہلی فتح کرنے کی غرض سے ہانسی میں قیام اختیار کیا۔ جب مودود کو اپنے بھائی کی اس سرکشی کا حال معلوم ہوا تو اس نے ۴۳۳ھ ۱۰۴۲ء میں کثیر سپاہ کے ساتھ لاہور کی طرف کوچ کیا اور اُدھر مجدود بھی روانہ ہوا لیکن قبل، اس کے کہ جنگ شروع ہوتی، صبح عید قربان کو مجدود اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا (جس کی وجہ نہیں معلوم ہوسکی) اور مملکت ہندوستان کا وہ سارا حصہ جو مجدود سے متعلق تھا مودود کے قبضہ میں آگیا۔

---

[1] ہانسی ضلع حصار کا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں کسی وقت نہایت مضبوط قلعہ بنا ہوا تھا اور مشہور تھا کہ وہ کسی سے فتح نہیں ہوسکتا لیکن مسعود نے اس دیرینہ روایت کو غلط ثابت کردیا۔ اب بھی اس قلعہ کے کھنڈر قصبہ سے متصل جانب شمال بلندی پر نظر آتے ہیں۔

[2] فرشتہ ۔ ۴۲ ۔ بیہقی ۲ ۔ ۱۴۰ ۔

[3] بیضاوی نے اپنی نظام التواریخ میں ۴۳۳ھ تحریر کیا ہے۔ طبقات ناصری اور طبقات اکبری میں ۴۳۲ھ درج ہے۔

[4] حسب بیان منہاج السراج محمد نے اول بار سات مہینے اور دوسری مرتبہ چار مہینے سلطنت کی۔

[5] خواندمیر نے سات سال مدت حکومت تحریر کی ہے۔

[6] رستم علی نے تاریخ ہندی میں تحریر کیا ہے کہ ایاز خاں فرمانروائے کشمیر کا بیٹا تھا۔

راجۂ دہلی سے جنگ

(۲) چونکہ مودود زیادہ تر وسط ایشیا کے معرکوں میں مصروف تھا[1] اس لئے راجہ دہلی نے اس فرصت کو غنیمت جان کر اور راجاؤں کو اپنا شریک بنایا اور ہانسی و تھانیسر وغیرہ کو مع مضافات کے "گماشتگانِ غزنویہ" سے چھین کر نگرکوٹ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس کے بعد لاہور کا محاصرہ کیا۔ حاکم لاہور نے مودود کو اطلاع کی لیکن قبل اس کے کہ وہاں سے مدد آتی ہندوؤں کی فوجیں باہم نفاق کی وجہ سے اور کچھ امیر مودود کے آنے کی خبر سنکر منتشر ہونے لگیں۔ لاہور کی فوج نے اس انتشار سے فایدہ اُٹھا کر ان کا تعاقب کیا اور قریب کے پہاڑ کا جہاں انھوں نے پناہ لی تھی محاصرہ کر لیا۔ آخر کار ہندوؤں نے پناہ طلب کی جو اس شرط پر دی گئی کہ تمام مفتوحہ قلعوں سے قبضہ اُٹھا لیا جائے۔ اس معرکہ کے بعد مملکتِ ہند زیادہ استحکام کے ساتھ غزنوی خاندان کی حکومت میں چلی آئی یہ واقعہ ۴۳۵ھ (۱۰۴۳ء) کا ہے۔

محمد کا عہد حکومت

جب ۴ رجب[2] ۴۴۱ھ (۱۰۴۹ء) کو مودود کا انتقال ہوا تو اُس کا بیٹا محمد[3] جو بہت کم سن تھا تخت نشین کیا گیا، لیکن بعد کو (باختلاف روایات) دو ماہ، ایک ماہ یا صرف ۵-۶ روز کے بعد اُسے ہٹا کر علی بن مسعود کو تخت نشین کر دیا جس نے صرف دو ماہ تک حکومت کی اور اس کے بعد عبدالرشید[4] فرمانروا ہوا۔

علی بن مسعود کی تخت نشینی

عبدالرشید کی تخت نشینی

علی بن مسعود کی مدت سلطنت کے متعلق مؤرخین کا اختلاف ہے طبقات ناصری میں دو ماہ، طبقات اکبری میں تین ماہ، تاریخ فرشتہ اور حبیب السیر میں دو سال درج ہے۔ اڈورڈ طامس نے لکھا ہے کہ عبدالرشید کا نام (جو علی بن مسعود کے بعد تخت نشین ہوا) ۴۴۰ھ کے بعض سکوں پر پایا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ مودود کا انتقال ۴۴۰ھ سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ منہاج السراج، ابن اثیر، ابوالفرج، ابوالفداء، رشید الدین اور ابن خلدون اس پر متفق ہیں کہ مودود کا انتقال اور عبدالرشید کی تخت نشینی ایک ہی سال (یعنی ۴۴۱ھ) میں ہوئی اب اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مودود کے انتقال کے بعد ہی عبدالرشید تخت نشین ہوا، تو پھر یہ سوال بحث طلب رہجاتا ہے کہ عبدالرشید

تاریخ انتقال مودود و تخت نشینی علی بن مسعود و عبدالرشید کی تحقیق

---

[1] فرشتہ نے اس کی وجہ سلطنت غزنوی کے آثارِ ضعف و ادبار کو قرار دیا ہے۔

[2] یہ تاریخ فرشتہ اور ملا نظام الدین احمد کے بیان کے مطابق ہے۔ خوندمیر نے حبیب السیر میں ۲۰ رجب تحریر کی ہے۔

[3] طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ اس کی عمر صرف ۴ سال کی تھی اور صرف پانچ دن سلطنت کرنے کے بعد معزول کر دیا گیا صاحب طبقات ناصری نے بھی اس کا نام محمد ظاہر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ علی بن مسعود شریک حکومت تھا اور یہ مشترکہ سلطنت دو ماہ تک قائم رہی۔

خوندامیر نے اس کا نام مسعود بتایا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ ایک ماہ بعد امراء غزنی نے اس کے چچا علی بن مسعود کو تخت نشین کر دیا۔

[4] علی بن مسعود تخت نشین ہوا تو عبدالرزاق بن احمد میمندی، حاکم سیستان نے عبدالرشید کو (جسے امیر مودود نے بست اور سفرائین کے درمیان ایک قلعہ میں مقید کر دیا تھا) آزاد کیا اور لشکر سے حلف اطاعت لیکر اسے بادشاہ بنایا اس کے بعد عبدالرشید غزنی کی طرف چلا۔ علی بن مسعود غزنی چھوڑ کر بھاگ گیا اور عبدالرشید تخت نشین ہو گیا۔

کے سکوں پر ۴۴۲ھ کیونکر تحریر ہے، جب کہ مودود کا انتقال ۴۴۱ھ میں ہوا۔ سو اس کے متعلق اگر بیضاوی کی نظام التواریخ پر اعتماد کیا جائے تو یہ جھگڑا ابھی طے ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے سلطان عبدالرشید کی حکومت تقریباً سات سال تحریر کی ہے اور سنہ وفات ۴۴۵ھ (۵۲-۱۰۵۳ء) لکھا ہے۔ اس حساب سے سلطان مودود[1] کی وفات اور عبدالرشید کی تخت نشینی دونوں ۴۴۰ھ کے ابتدائی حصہ میں واقع ہوتی ہیں ــــ بہرحال عبدالرشید مودود کے بعد ہی تخت نشین ہوا ہو یا علی بن مسعود کے بعد اس میں شک نہیں کہ جن مورخین نے علی بن مسعود کی مدتِ حکومت دو سال تحریر کی ہے وہ یقیناً غلطی پر ہیں ممکن ہے کہ آخر ۴۴۰ھ میں مودود کا انتقال ہوا ہو، اور اس کے بعد ایک یا دو ماہ تک علی بن مسعود کے حکمران رہنے کے بعد، عبدالرشید تخت نشین ہو گیا ہو۔ اس طرح نہ صرف قدیم مورخین کے بیان سے مطابقت ہو جائے گی۔ بلکہ اڈورڈ طامس کی شہادتِ سکہ سے بھی تطابق ہو جائے گا، جو تمام تاریخوں سے زیادہ زبردست ثبوت تعینِ سنہ کے باب میں ہے۔ معلوم نہیں فرشتہ نے کیونکر مدتِ حکومت دو سال تحریر کی ہے جبکہ اسکے ماخذ (طبقات اکبری) میں بھی صرف تین ماہ تحریر ہیں۔ عبدالرشید (جسے منہاج السراج، بہاء الدولہ کے لقب سے یاد کرتا ہے) کی ولدیت کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے۔ صاحب روضۃ الصفا نے اسے مسعود (بن سلطان محمد) کا بیٹا ظاہر کیا ہے۔ اور تاریخ گزیدہ میں اسے "ابوالمنصور مجدالدولہ بن محمود ابن سبکتگین" لکھا ہے۔ فرشتہ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ محمود ہی کا بیٹا تھا۔

عبدالرشید جب تختِ غزنی پر اطمینان سے متمکن ہو گیا تو اس نے طغرل حاجب کو (جو محمود کا نہایت ہی سرکش غلام تھا) کثیر فوج کے ساتھ الپ ارسلان کے خلاف روانہ کیا۔ چونکہ طغرل فطرتاً نہایت دلیر و ذی حوصلہ تھا اس لئے سلجوقیوں کو شکست دینے کے بعد تخت غزنی پر قابض ہونے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا اور اپنی سپاہ کو لیکر اس طرف روانہ ہوا۔

جب عبدالرشید کو معلوم ہوا تو وہ قلعہ بند ہو گیا اور طغرل، غزنی میں داخل ہو گیا۔ اس نے مسعود کی لڑکی سے بہ جبر شادی کر لی اور محمود غزنوی کے خاندان کے تمام افراد کو جو اُس کے ہاتھ آئے (جن میں عبدالرشید بھی شامل تھا) تہ تیغ کر کے تخت نشین ہو گیا۔ لیکن صرف چالیس دن اس نے حکومت کی ہوگی کہ ایک باغیرت جماعت نے (جسکو نوشتگین[2] کرخی نے آمادہ کیا تھا) نوروز سلطانی کے دن جبکہ وہ محمود غزنوی کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا

---

[1] خوند آمیر نے سات سال مدت حکومت ظاہر کی ہے اور اگر ۴۴۰ھ قرار دیا جائے تو حبیب السیر کا یہ بیان درست ہوگا۔

[2] نوشتگین کو عبدالرشید نے ہندوستان کا امیر الامراء بنا کر روانہ کیا تھا۔ اس نے نگرکوٹ کو ہندوؤں سے چھین کر وہاں حکومتِ اسلام قایم کی۔ عبدالرشید نے آخر زمانہ میں اس کو لاہور سے پشاور بلایا یہ اسی جگہ تھا کہ طغرل نے غزنی پر قبضہ کر لیا۔ حبیب السیر میں بجائے نوشتگین کے جرجبر لکھا ہے ممکن ہے یہ اس کا نام ہو اور نوشتگین لقب۔

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔[1]

عبدالرشید کے عہد حکومت کے متعلق مورخین کا اختلاف

عبدالرشید کی حکومت کے متعلق اختلاف ہے۔ منہاج السراج نے ڈھائی سال (بعض نسخوں میں صرف دوسال) فرشتہ نے صرف ایک جگہ "کمتر از یکسال" اور دوسری جگہ ایک سال اور نظام الدین احمد نے "چہار سال" تحریر کئے ہیں۔ اگر عبدالرشید کی حکومت، ۴۴۳ھ ۱۰۵۱ء میں ختم ہوئی جیسا کہ منہاج السراج کے بیان سے معلوم ہوتا ہے[2] تو یقیناً طبقاتِ اکبری کا بیان صحیح ہے کیونکہ اس حساب سے عبدالرشید کی سلطنت کی ابتدا ۴۳۹ھ یا زیادہ سے زیادہ ۴۴۰ھ قرار پائے گی اور اس کی صحت کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

فرخ زاد کا عہد حکومت

جب طغرل قتل ہو چکا تو نوشتگین غزنی آیا اور فرخ زاد کو قلعۂ برغند[3] سے نکال کر تخت نشین کیا۔ فرخ زاد کی نسبت، صاحب روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ وہ مسعود (بن سلطان محمود) کا بیٹا تھا۔ لیکن حمداللہ مستوفی نے اسے عبدالرشید کا بیٹا لکھا ہے اس اختلاف میں یقیناً روضۃ الصفا کا بیان صحیح ہے کیونکہ سکوں میں صاف طور سے اُسے مسعود کا بیٹا ظاہر کیا گیا ہے۔

اس نے تخت نشین ہوتے ہی نوشتگین کو اپنا وزیر بنا لیا اور تمام انتظامات اس کے ہاتھ میں دیدئے۔ اس کے

سلاجقہ سے جنگ

عہد میں سلجوقیوں سے دو بار جنگ ہوئی۔ ایک میں فرخ زاد کامیاب ہوا اور دوسری میں سلاجقہ فتحمند ثابت ہوئے۔ آخرکار دونوں طرف سے مصالحت کی کوشش کی گئی اور قیدیوں کا تبادلہ ہو گیا۔

بعارضۂ قولنج ۴۵۱ھ ۱۰۵۹ء میں اس نے انتقال کیا۔ اور سات سال حکومت کی۔ فرشتہ اور خوندامیر نے ۴۵۰ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے اور مدتِ حکومت ۶ سال ظاہر کی ہے۔

ابراہیم کی تخت نشینی

فرخ زاد کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا۔ غزنوی خاندان میں یہ بادشاہ اپنے زہد و اتقاء، اخلاق و انسانیت، علم پروری و امن پسندی کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس نے سلجوقیوں کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ اس کے عہد میں انھوں نے کوئی شورش نہیں کی اور نہایت سکون کے ساتھ اس کا زمانۂ سلطنت ختم ہو گیا۔

ہند کی طرف فوج کشی

۴۷۲ھ میں سلطان ابراہیم نے ہند کی طرف فوج کشی کی اور قلعہ اجودھن کو (جو اب پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے) مسخر کر کے لاہور سے وہاں تک کا ملک زیر نگیں کر لیا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور قلعہ کو فتح کیا جس کا

---

[1] طبقات ناصری میں، طغرل کا ذکر جدا گانہ کر کے، غزنی خاندان کا آٹھواں فرمانروا اُسے ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن جامع التواریخ اور تاریخ گزیدہ میں حکومت طغرل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ — [2] منہاج السراج نے طغرل کے بعد فرخ زاد کی تاریخ تخت نشینی ۹ ذی قعدہ ۴۴۴ھ تحریر کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ رمضان ۴۴۳ھ میں طغرل نے عبدالرشید کا تخت چھینا ہوگا (کیونکہ طغرل کی حکومت سب نے صرف چالیس دن مانی ہے) بعض مورخین نے عبدالرشید کا سنہ وفات ۴۴۵ھ تحریر کیا ہے۔ — [3] یہ مقام قلعۂ غزنی اور تاک کے درمیان واقع ہے۔

نام قلعۂ روپال تھا، جو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور دریا وصحرا کی وجہ سے وہاں پہونچنا دشوار تھا۔ اس سے فارغ ہوکر وہ ایک اور مقام پر پہونچا جسے درہ کہتے تھے۔ یہاں خراسانیوں کی وہ نسل آباد تھی جسے افراسیاب نے ایران سے نکالدیا تھا۔ یہ شہر بھی بہت دشوار گذار مقام پر واقع تھا، لیکن ابراہیم نے اسے بھی فتح کیا۔ یہ بیان فرشتہ کا ہے تاریخ الفی[1] اور طبقاتِ اکبری میں نہایت مختصر بیان اس جہم کا نظر آتا ہے۔ اور خوندامیر نے صرف اسقدر تحریر کیا ہے کہ:۔ "سلطان ابراہیم نے کئی بار ہند پر حملہ کیا اور کامیاب واپس آیا" منہاج السراج اور ملا عبدالقادر نے مطلق اس کا ذکر نہیں کیا۔ جامع التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سنہ میں ابراہیم نے آگرہ کو بھی فتح کیا (جسے اس نے قلعۂ آزرہ

---

[1] تاریخ الفی میں، چونکہ سنہ ۱۰۰۰ھ تک کے حالات درج کئے گئے ہیں اس لئے اس کا نام تاریخ الفی رکھا گیا۔ (الف عربی میں ہزار کو کہتے ہیں) یہ تاریخ شہنشاہ اکبر کے حکم سے طیار ہوئی اور اول اول متعدد علماء و مورخین اس خدمت پر مامور کئے گئے لیکن آخر میں سارا بار مولانا احمد (قاضی ٹھٹہ کے بیٹے) مصنف خلاصۃ الحیات پر ڈالا گیا۔ ڈاکٹر برڈ نے اس کو نصر اللہ ساکن نینوا کا بیٹا ظاہر کیا ہے۔ اور فرشتہ نے ملا احمد ساکن ننیوا ظاہر کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں تاریخ الفی کی ترتیب کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سنہ ۹۹۰ھ میں ملا احمد "رافضی" جو اپنے کو حکیم بھی کہتا تھا دکن سے آکر دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد سندھ میں رہتے تھے اور حنفی مذہب رکھتے تھے۔ لیکن یہ شیعہ ہوگیا۔ اور عہد شاہ طہماسپ میں شیعیانِ عراق کی صحبت نے اس کو غالی شیعہ بنا دیا۔ جب شاہ اسماعیل ثانی نے حنفی مسلک اختیار کیا اور شیعوں کے درپے آزار ہوگیا تو ملا احمد مخدوم شرقی کے ساتھ (جو سنی تھے اور جن کی تصنیف کتاب النوافض فی ذم الروافض مشہور ہے) مکہ معظمہ چلا گیا اور پھر وہاں سے دکن آیا۔ چند دن کے بعد یہ دکن سے ہندوستان آیا اور اپنے مذہب کی تعلیمات پھیلانے لگا۔ ابھی تک شیخ فیضی سے اس کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک دن بازار میں چلا جا رہا تھا کہ چند عراقیوں نے اس سے میری تعریف کی وہ بڑھا اور کہنے لگا کہ "نور رفض در جبینِ ایشاں می نماید" میں نے جواب دیکہ ہاں "جس طرح تمھارے چہرہ سے نورِ تسنن ظاہر ہے" لوگ ہنس پڑے اور یہ بہت خفیف ہوا۔

جب سنہ ۱۰۰۰ھ ختم ہوا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ آج کے دن تک کے تمام بادشاہانِ اسلام کا مفصل حال لکھا جائے اور اس کتاب کا نام تاریخ الفی رکھا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ واقعات، رحلتِ نبوی کے بعد سے لکھے جائیں اور سنین کے ذکر میں بجائے لفظ ہجرت کے رحلت لکھا جائے۔ اس خدمت کے لئے سات آدمی مامور ہوئے۔ پہلا سال نقیب خاں کے سپرد کیا گیا، دوسرا شاہ فتح اللہ کو دیا گیا اور اسی طرح حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سندھی، میرزا نظام الدین احمد اور مجھے ایک ایک سال دیا گیا۔ جب ۵۳ سال کے حالات مرتب ہوگئے تو اس کے بعد۔ حکیم ابوالفتح کی سفارش سے یہ خدمت کلیۃً ملا احمد کے سپرد کر دی گئی۔ اور اس نے اپنے اعتقاد کے مطابق جو چاہا لکھا۔ جب وہ چنگیز خاں کے وقت تک کے حالات دو جلدوں میں ختم کر چکا تو مرزا فولاد نے اسے لاہور کی ایک گلی میں قتل کر دیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ ہو)

لکھا ہے) اور آگرہ فتح کرکے دہ درہ پہونچا جس کا ذکر فرشتہ نے کیا ہے۔ سلمان[۱] (مشہور شاعر نے) بھی فتحِ آگرہ کا ذکر کیا ہو جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہے۔[۲]

سلطان ابراہیم کی مدتِ حکومت اور سنہ وفات کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے۔ منہاج السراج نے لکھا ہے کہ اس نے ۴۲ سال حکومت کی اور ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ء میں انتقال کیا۔ تاریخ گزیدہ نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ طبقاتِ اکبری میں ۴۸۱ھ / ۱۰۸۸ء ظاہر کیا گیا ہے۔ فرشتہ اور خوند امیر نے اس اختلاف کو ظاہر کرتے ہوئے دونوں سنہ تحریر کر دئے ہیں۔ لیکن سکوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم نے واقعی ۴۲ سال تک حکومت کی اس لئے اس کا سنہ وفات ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ء ہونا چاہیئے۔

ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا مسعود[۳] تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں لاہور، حکومتِ ہند کا مرکز قرار پایا۔ اور حاجب طغاتگین نے گنگا کو عبور کرکے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن مورخین نے جگہ کا تعین نہیں کیا صرف اس قدر لکھا ہے کہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۶)

اس کے بعد ۹۹۷ھ تک کے حالات آصف خاں نے مرتب کئے اور ۱۰۰۰ھ میں مجھے حکم دیا کہ لاہور جاکر ساری کتاب پر نظر ثانی کروں اور سنین کی ترتیب دوں چنانچہ میں نے پہلی جلدوں پر ایک سال میں نظر ثانی کی۔ اور تیسری جلد آصف خاں کے سپرد کر دی گئی "

تاریخ الفی، اس میں کلام نہیں کہ عہد اکبری کی بہترین تصانیف میں سے ہے لیکن چونکہ اس کی ترتیب ایک دماغ کا نتیجہ نہیں ہے اور تشیع و تسنن دونوں مذاہب کے جذبات شامل ہیں اس لئے کہیں کہیں اصل واقعات سے تحریف ضروری کی گئی ہے اور بعض اہم واقعات ترک بھی ہو گئے ہیں۔ مثلاً جنگ قادسیہ، جس نے عجم کو ہمیشہ کے لئے عرب کا غلام بنا دیا۔ اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ علاوہ اس کے وہ ایک فسانہ کی صورت میں مسلسل لکھی گئی ہے اور اس لئے واقعات کا استقصا بہت دشوار ہے۔

حیدرآباد اور مرشدآباد کے کتب خانوں میں اس کے ناتمام نسخے موجود ہیں۔ مغربی مورخین کو اس کا علم بہت کم ہے اور غالباً سوائے مسٹر الیٹ کے کسی اور مستشرق نے اس سے کام نہیں لیا۔

[۱] مسعود بن سعد سلمان نے غزنوی خاندان کے چند فرمانرواؤں (مسعود، ابراہیم اور بہرام شاہ) کی تعریف میں متعدد قصاید لکھے ہیں جو کلیاتِ سلمان میں نظر آتے ہیں۔ ان قصاید سے کچھ تاریخی حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سلمان نے ۵۲۵ھ / ۱۱۳۱ء میں اور بعض کے نزدیک ۵۱۵ھ / ۱۱۲۲ء میں انتقال کیا۔

[۲] ابوالفرج رونی نے ظاہر کیا ہے کہ سلطان ابراہیم نے قنوج بھی فتح کیا اور سید حسن غزنوی کا بیان ہے کہ ستام میں اس نے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا جس میں ایک لاکھ سوار رہ سکتے تھے۔ سلمان شاعر نے اور فتوحات بھی سلطان کی طرف منسوب کی ہیں۔

[۳] حمد اللہ مستوفی نے اس کا لقب علاء الدولہ اور صاحب روضۃ الصفا نے جلال الدولہ لکھا ہے۔

مسعود کی مدتِ حکومت و وفات میں اختلاف - ارسلان شاہ کی تخت نشینی - بھائیوں کی جنگ - ارسلان شاہ کی مدتِ حکومت و تاریخ قتل - بہرام شاہ کی تخت نشینی - ہندوستان پر حملہ

سوائے محمود کے وہاں اور کوئی اسوقت تک نہیں پہونچا تھا[1]۔

اس کی مدتِ حکومت میں بھی اختلاف ہے۔ منہاج السراج نے تاریخ وفات ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء اور مدتِ حکومت ۱۶ سال ظاہر کی ہے۔ تاریخ گزیدہ میں لکھا ہے کہ ۵۰۸ھ/۱۱۱۴ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا کمال الدولہ شیرزاد تخت نشین ہوا لیکن ایک سال کے بعد ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء میں ارسلان شاہ (اس کے بھائی) نے شیرزاد کو قتل کردیا اور خود تخت نشین ہوگیا۔ فرشتہ نے بھی اسی کا تتبع کیا ہے۔ طبقاتِ اکبری اور طبقاتِ ناصری میں شیرزاد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ سکوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدولہ شیرزاد نے یقیناً ایک سال حکومت کی اس لئے مسعود کی وفات ۵۰۸ھ/۱۱۱۴ء اور مدتِ حکومت سولہ سال درست معلوم ہوتی ہے۔

جب ارسلان شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے بھائیوں کو مقید کرلیا۔ لیکن بہرام شاہ بھاگ کر اپنے ماموں، سلطان سنجر کے پاس چلا گیا۔ سلطان سنجر اپنے بھائی، سلطان بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے خراسان کا فرمانروا تھا۔ ارسلان شاہ نے بہت کوشش کی کہ سلطان سنجر، بہرام شاہ کی مدد نہ کرے۔ لیکن وہ نہیں مانا اور آخرکار ارسلان شاہ کو افواجِ سنجر کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور یہ بھاگ کر ہندوستان چلا آیا۔ جب سنجر، بہرام شاہ کو تخت نشین کرکے واپس گیا تو ارسلان شاہ نے پھر غزنی پر حملہ کیا۔ اور بہرام شاہ بھاگ کر قلعۂ بامیان میں چھپ گیا۔ اس کے بعد سلطان سنجر نے پھر بہرام کی مدد کی اور ارسلان شاہ کو قتل کرکے بہرام کو تخت نشین کردیا۔

یہ ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء میں قتل کیا گیا اور صرف دو سال حکومت کی۔ فرشتہ اور نظام الدین احمد نے مدتِ حکومت تین سال لکھی ہے جو اُسی وقت صحیح ہوسکتی ہے، جب شیرزاد کی حکومتِ "یک سالہ" کو حذف کردیا جائے۔ خوندامیر نے ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء تاریخِ وفات بیان کی ہے۔

ارسلان شاہ کے بعد بہرام شاہ تخت نشین ہوا۔ خاندانِ غزنوی میں بہرام شاہ، اپنی جرأت و بسالت، عدل و رعیت پروری، بذل و کرم، اور قدردانیِ فضل و کمال کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے۔

بہرام شاہ کے متعلق طبقاتِ اکبری، تاریخ فرشتہ، طبقاتِ ناصری اور حبیب السیر میں یہ لکھا ہے کہ اس نے کئی بار ہندوستان پر حملہ کیا لیکن مقامات کا تعین کسی نے نہیں کیا۔

فرشتہ نے نسبتاً زیادہ صراحت سے کام لیکر صرف اسقدر بیان کیا ہے کہ اول مرتبہ ہندوستان پہونچنے کی وجہ یہ تھی کہ محمد باہلیم نے جو ارسلان شاہ کے وقت سے لشکرِ لاہور کا سپہ سالار تھا، کچھ مخالفت شروع کردی تھی، چنانچہ ۱۹-۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں ۲۷ رمضان کو بہرام شاہ نے ہندوستان پہونچکر اسے گرفتار کرلیا۔ لیکن پھر اس کا قصور معاف کرکے سابق عہدہ پر بحال کردیا۔

اس کے بعد جب بہرام شاہ غزنی واپس گیا تو اس نے زیادہ سرکشی اختیار کی اور ولایتِ سوالک میں قلعۂ ناگور تعمیر

---

[1] یہ بیان طبقاتِ ناصری اور تاریخ فرشتہ کا ہے حبیب السیر میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

محمد باہلیم کو شکست

کرکے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اس خبر کو سنکر بہرام شاہ پھر ہندوستان آیا اور ملتان کے قریب محمد باہلیم کو شکست دیکر اسے قتل کردیا[1]۔ اس کے عہد کا اہم ترین واقعہ صوبۂ غور کے فرمانروا قطب الدین محمد غوری کا قتل کیا جانا ہے۔ (جو اس کا داماد بھی تھا) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزنی کی حکومت آلِ محمود کے خاندان سے نکل گئی۔ اور ہندوستان میں ایک جداگانہ مستقل سلطنت قایم ہونے کے آثار شروع ہوگئے ان واقعات کو ہم تفصیل کے ساتھ خاندانِ غور کے بیان میں ظاہر کریں گے۔ یہاں مختصراً صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ جب علاء الدین غوری نے غزنی پر حملہ کیا تو بہرام شاہ بھاگ کر ہندوستان چلا آیا اور اسوقت تک وہ پھر غور واپس نہیں گیا، اسے غزنی جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

بہرام شاہ کا ہندوستان چھوڑنا

بہرام شاہ کی تاریخِ وفات میں بھی مورخین کا اختلاف ہے۔ طبقاتِ اکبری، تاریخ فرشتہ اور روضۃ الصفا میں ۵۴۷ھ تحریر ہے، حمد اللہ مستوفی نے ۵۴۴ھ تحریر کیا ہے اور طبقاتِ ناصری نے ۴۱ سال مدتِ حکومت ظاہر کرکے ۵۵۲ھ ظاہر کیا ہے۔ لیکن درست یہی ہے کہ اس نے ۳۵ سال حکومت کی اور ۵۴۷ھ میں انتقال کیا۔

خسرو شاہ کی تخت نشینی

بہرام شاہ کے بعد اس کا بیٹا خسرو شاہ[2] تخت نشین ہوا۔ لیکن چونکہ علاء الدین (جہانسوز) بہرام شاہ کی واپسی غزنی کا حال معلوم کرکے اُسی کی زندگی میں پھر غزنی پر حملہ کرنے کی غرض سے چلدیا تھا۔ اس لئے خسرو شاہ بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ علاء الدین نے غزنی پہونچکر جس بیدردی سے اسے تباہ کیا وہ تاریخ کا نہایت دردناک افسانہ ہے۔ جب علاء الدین (جہانسوز) تمام ممکن تباہیاں پھیلانے کے بعد غور واپس گیا تو خسرو شاہ کو پھر غزنی پر قابض ہونے کا خیال آیا اور اس ارادہ سے بڑھا۔ لیکن اُدھر ترکانِ غز[3] سلطان سنجر کی مدد کے لئے آرہے تھے۔ اس لئے اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور پھر اسے لاہور واپس آنا پڑا اور یہیں ۵۵۵ھ[4] میں اس کا انتقال ہوا۔

خسرو ملک کی تخت نشینی

خسرو شاہ کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ بہت نیک طینت اور صاحبِ علم وفضل تھا لیکن اسی کے ساتھ عیش وطرب کا بھی بہت شایق تھا۔ اس وقت شہاب الدین محمد غوری، غزنی پر قابض ہوچکا تھا اور ہندوستان پر متصرف ہونا چاہتا تھا۔ لیکن خسرو ملک کو کوئی فکر نہ تھی اور وہ اپنی اسی عشرت میں مشغول رہا۔ آخر شہاب الدین غوری پشاور، ملتان، افغانستان اور سندھ کو مسخر کرکے ۵۸۰ھ[5] میں لاہور پہونچا، خسرو ملک قلعہ بند ہوگیا اور محمد غوری اسکے خردسال لڑکے اور ایک مشہور ہاتھی کو لیکر غزنی واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ۵۸۳ھ میں اسنے پھر لاہور پر حملہ کیا، خسرو ملک کو گرفتار کرکے قلعۂ غرجستان میں بھیجدیا اور ۵۹۸ھ میں اُسکو مع اس کے بیٹے بہرام شاہ کے قتل کرکے، خاندانِ غزنوی یا آلِ سبکتگین کی حکومت کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ دنیا سے محو کردیا۔ خسرو شاہ نے کل ۲۸ سال تک حکومت کی۔

شہاب الدین کا غزنی پر قبضہ

خاندانِ غزنوی کا اختتام

---

[1] یہی بیان تقریباً منہاج السراج کا بھی ہے۔ [2] طبقاتِ ناصری میں اس کا لقب تاج الدولہ یا یمین الدولہ اور تاریخ گزیدہ میں ظہیر الدولہ لکھا ہے۔ [3] فرشتہ کا بیان ہے کہ ترکوں کی اس جماعت نے غزنی پر دس سال تک قبضہ قایم رکھا، لیکن بعد کو غوریوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا۔ [4] یہ سنہ فرشتہ نے لکھا ہے منہاج السراج نے ۵۵۰ھ تحریر کیا ہے۔ [5] یہ سنہ تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق ہے، طبقات ناصری میں ۵۸۳ھ تحریر ہے۔

باب چہارم

غزنوی حکومت پر ایک تبصرہ اور اُسکے اسبابِ زوال

حکومتِ اسلام کی تاریخ میں جسقدر شہرت محمود غزنوی کو حاصل ہوئی اور اس کی ہستی جتنی مختلف حیثیات کی جامع تھی، اس کی نظیر مشکل سے ملسکتی ہے اور اگر مبالغہ سے کام نہ لیا جائے تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف سبکتگین کی اولاد بلکہ ساری جماعتِ اتراک میں اُسے وہ درجہ حاصل ہوا جس کے بعد کوئی اور مرتفع زینہ باقی نہ رہا تھا، ممکن ہو کہ قبیلۂ بنی عامر میں کوئی دوسرا قیس نظر آسکتا، لیکن غزنوی خاندان میں کسی دوسرے محمود کا پیدا ہونا یقیناً ناممکن تھا۔ وہ شخص جو ایک مختصر سی کوہستانی ریاست کو ایک سلطنت میں تبدیل کردے (اور سلطنت بھی ایسی جو بحرِ اخضر سے دریائے فرات تک وسیع ہو) جو ہندوستان کے تمام جنگجو حصۂ ملک اور کثیر آبادی کو ایک رُبع صدی کے اندر اندر مسخر کرے، جو غزنی ایسے سنسان اور وحشی مقام کو علوم و فنون کا جولانگاہ بنادے، جو نہ صرف افغانستان، بلکہ تمام ملحقہ ممالک کے لئے تہذیب و شائستگی کے غیر معمولی اسباب فراہم کرنے میں اس قدر کامیاب ہوسکے، اور جس کا ایک ایک کارنامہ سارے عالم کے تصور و خیال کو مسحور کرلے، کیا دنیا کا کوئی ذی فہم شخص اُسے وحشی، غیر مہذب اور معمولی انسان کہہ سکتا ہے؟

یہ بالکل صحیح ہے کہ قرب و جوار کی سلطنتوں کا انتشار اس کی ترقی میں بہت کچھ معاون ہوا۔ یعنی سلطنتِ آلِ سامان کے تزلزل اور فارس کے شہزادگان خاندان بویہ کے اختلاف نے مغرب کی طرف اور ہندو راجاؤں کے باہمی رشک و عناد نے ہندوستان کی جانب، اس کی پیشقدمی کو زیادہ آسان بنادیا، لیکن یہ حقیقت کیونکر فراموش کی جاسکتی ہے کہ اس وقت فارس میں کثرت سے ایسے ترکی سردار پائے جاتے تھے جو اپنی شجاعت و بہادری، عزم و حوصلہ کے

لحاظ سے محمود کے آباؤ اجداد سے کسی طرح کم نہ تھے اور یہ کہ شمال کی طرف سے وسط ایشیا کے سخت اور جنگجو قبائل نے بڑھ بڑھ کر کبھی اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا، تاہم محمود کو کوئی قوت اس کی جگہ سے متزلزل نہ کر سکی۔ اور اس نے اپنے اُن دشمنوں کو بھی، جو غالباً اس سے زیادہ جنگجو اور جفاکش تھے کبھی اس بات کا موقعہ نہیں دیا کہ اس کی عظمت و شان، اس کی سطوت و جبروت سے دوش بدوش ہو کر نکل جائیں۔

جب الک خاں ترکوں کے نہایت خونخوار سردار نے اپنے مہیب اور بے شمار سواروں کے ساتھ خراسان پر حملہ کیا، تو وہ وقت محمود کے لئے نہایت سخت تھا کیونکہ عنان سلطنت ہاتھ میں لئے ہوئے بہت قلیل زمانہ گزرا تھا، ملک پر اچھی طرح قابض بھی نہ ہو سکا تھا، اور تمام قرب و جوار میں محمود کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اس نے اس الک خانی سیلاب کی مطلق پرواہ نہیں کی اور اپنی فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لیکر مقابلہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو سلطنت محمود ایسی ہستی کے عزائم پر قایم ہوئی وہ کیوں دو صدی سے زیادہ قایم نہ رہ سکی، اور اس کے اسباب کیا تھے؟ آپ جس قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا وہ کچھ نہیں ہے مگر ایک افسانہ دو باب میں منقسم ایک وہ جو مخصوص ہے "جرأت و بسالت اور شوکت و عظمت" کے لئے۔ اور دوسرا وہ جس میں انتشار و ابتری کے بعد تصویر نظر آتی ہے زوال و اختتام کی۔ پھر خاندانِ غزنوی کی تاریخ میں چونکہ محمود نے پہلے باب کی تکمیل کر دی تھی اسلئے اس کے بعد دوسرے حصہ کا شروع ہونا ضروری تھا اور قطرت اپنے اُصول کو کسی طرح بدل نہ سکتی تھی۔ یہ تھا مختصر ترین بیان عروج و زوال کے اس فلسفہ کا جو اپنے اُصول کو بلا استثنا، تمام قوموں پر نافذ کر دیتا ہے۔ اور خاندانِ غزنوی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن یہاں اس اختصار کی ذرا تفصیل بھی سن لیجئے۔

یہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ یوں تو محمود کی قایم کی ہوئی سلطنت تقریباً دو صدی تک باقی رہی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ زوال اس کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا اور ہر نیا دن اس میں اضافہ کرنے کے لئے طلوع ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جانشینانِ محمود میں باہم نااتفاقی بھی پیدا ہوئی عیش و عشرت کی جانب مائل ہو جانے سے اُن کے اخلاق میں ابتری بھی رونما ہونے لگی، لیکن زوالِ سلطنت کا بڑا سبب (علاوہ اس کے) ترکمانوں اور ترکانِ غز کا خروج تھا، جو خراسان کی سرسبز و شاداب زمین پر ہجوم کئے ہوئے تھے، اور سلطنت غزنی کی وسعت و کامیابی کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

محمود چونکہ بڑا ذی اقبال شخص تھا اس لئے اُس کی زندگی میں تو ترکوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن اسکے بعد دس سال کے اندر ہی اندر سلاجقہ نے دریائے سیحون کی سرزمین سے نکل کر سارے ایران کا احاطہ کر لیا اور سمرقند سے لیکر ساحل ابجین تک قبضہ کر کے محمود کے مقبوضاتِ ایران کو سلطنت غزنی سے جدا کر دیا۔

جب ۴۲۹ھ میں طغرل بیگ، خراسان کا بادشاہ بن بیٹھا تو محمود کا جانشین مسعود (جس نے اس وقت تک ان جنگجو گلہ بانوں کی پرواہ نہ کر کے حدودِ سلطنتِ غزنی پر ان کو منڈلاتے رہنے کا موقعہ دے رکھا تھا) چونکا اور تقریباً

تین سال بعد اس نے ایک قوی فوج بھیجکر ان باغیوں کی جماعت کو زیر کرنا چاہا، لیکن اس کا وقت حقیقتاً گزر گیا تھا۔ اس لئے مرو کے قریب مسعود کو شکست ہوئی اور اُسی وقت سے فارس سلطنتِ غزنی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔

چونکہ اب مغرب کی طرف ترقی کرنے کے لئے میدان تنگ ہوگیا تھا، اور حکومتِ سلاجقہ کی آہنی دیوار حایل ہوچکی تھی، اس لئے لازم تھا کہ ہندوستان کے مقبوضات کو وسیع کیا جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف بھی توجہ نہیں کیگئی اور سوائے پنجاب کے جس پر محمود ہی کے وقت میں مستقلاً قبضہ ہوگیا تھا، سلطنت میں کچھ بھی توسیع نہ ہوئی۔ پھر پنجاب کی بھی یہ حالت تھی کہ جب کوئی زیادہ ذی اثر اور قوی گورنر وہاں مامور کیا جاتا تھا تو ہر وقت اس کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا تھا کہ خدا جانے کس وقت وہ بھی خود مختار ہوجائے اور پنجاب بھی سلطنتِ غزنی کے قبضہ سے نکل جائے۔ چنانچہ اس زمانہ کی مشکلات جلد شروع ہوگئیں اور مشرق و مغرب دونوں جانب جارحانہ قوت نے مدافعانہ صورتیں اختیار کرلیں

محمود نے اپنے ہی زمانہ میں علی اریاروق کو مملکتِ ہند کا گورنر اور سپہ سالار مقرر کردیا تھا جو اس کے بعد بھی اس خدمت پر مامور رہا، لیکن مسعود کا عہد شروع ہوتے ہی اس کی طرف سے خطرات کا ظہور ہونے لگا، مسعود نے اسے دربار میں طلب کیا۔ لیکن اس نے انکار کیا۔ آخر کار اس کے وزیر خواجہ حسن میمندی نے اریاروق کو کسی تدبیر سے بلایا اور چونکہ وہ شراب کا عادی تھا اس لئے اسی ذریعہ سے اُسے مدہوش بنا کر گرفتار کرلیا۔ الغرض اسی قسم کی مشکلات تھیں جو صوبۂ پنجاب کے گورنروں کی طرف سے بھی کبھی کبھی پیدا ہوجاتی تھیں۔

دربار کی حالت یہ تھی کہ سب کے سب شراب کے عادی تھے اور نہایت آزادی سے صحبتِ میخواری برپا ہوا کرتی تھی۔ خود محمود کو بھی اس کا شوق تھا لیکن اعتدال کے ساتھ مسعود البتہ ضرورت سے زیادہ اس کا عادی تھا اور اگر خوش قسمتی سے اس کو خواجہ حسن میمندی ایسا وزیر نہ مل جاتا تو غالباً انتظام سلطنت بالکل درہم وبرہم ہوجاتا۔

خواجہ حسن میمندی، محمود کا بھی وزیر رہ چکا تھا۔ لیکن بعد کو محمود نے اسے قلعۂ کالنجر میں قید کرکے حسنک کو اسی کی جگہ مقرر کیا تھا۔ جب امیر مسعود تخت نشین ہوا تو اس نے خواجہ میمندی کو آزاد کرکے عہدۂ وزارت کے لئے طلب کیا۔ چنانچہ جب خواجہ میمندی دربار مسعود میں آیا تو اس کی یہ شان تھی کہ ایک ارغوانی رنگ کا قبا جس پر نہایت نازک و نفیس کارچوب کیا گیا تھا، زیب بدن تھی، سرپر زریں حاشیہ کا باریک ململ کا بڑا سا عمامہ تھا۔ طلائی زنجیر ایک ہزار اشرفی کے وزن وقیمت کی کمر میں تھی۔ جب وہ اندر پہنچا تو مسعود نے اس کو مبارک باد دی اور اس نے زمیں بوس ہوکر موتیوں کا ایک قیمتی آویزہ پیش کیا۔ اس کے بعد مسعود نے اُسے مُہرِ وزارت دی اور یہ اسے سر پر رکھ کر باہر آیا۔

اسی وقت جبکہ خواجہ حسن میمندی پر انعامات کی بارش ہورہی تھی، خواجہ حسنک (جس پر قرمطی ہونے کا الزام لگایا گیا تھا) سنگسار کئے جانے کے لئے کشاں کشاں جارہا تھا، اس حال میں کہ سر پر اس کے ایک عمامہ اور بدن میں ازار تھی، دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس کا حسین جسم چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور اس کا جوان چہرہ

بالکل تصویر نظر آتا تھا۔ آخر کار اس کا سر ایک طشت میں مسعود کے سامنے پیش کیا گیا، اور اس کا جسم دار پر لٹکایا گیا۔ جہاں اس کی ضعیف ماں رو رو کر کہہ رہی تھی کہ "اے میرے بیٹے تو بھی کیسا خوش قسمت ہے کہ ایک بادشاہ (محمود) نے تجھے یہ دُنیا دی اور دوسرے فرمانروا (یعنی مسعود) نے دوسری دُنیا کا بھی سردار بنا دیا[1]"

الغرض کچھ ایسا تھا دربارِ غزنی کا رنگ جب محمود اُٹھ گیا، لیکن صرف اس عیش و عشرت، اس بدمستی اور بے پرواہی کو معیار قرار دے کر مسعود کی حکومت پر تنقید کرنا غلطی ہوگی۔ کیونکہ وہ بہت اعتبارات سے صحیح معنی میں اپنے باپ کا جانشین تھا۔ اس کی فیاضی و دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے علیِ ثانی کہتے تھے۔ اور شجاعت کی یہ کیفیت تھی کہ رستمِ ثانی اس کا عام لقب ہوگیا تھا۔ اس کے جنگی تبر کو کوئی شخص اُٹھا نہ سکتا تھا درانحالیکہ وہ خود ایک ہی ضرب سے ہاتھی کو بٹھا دیتا تھا۔ علاوہ اس کے علم و ہنر کا وہ بہت بڑا مربی تھا اور کثرت سے اسنے حسین عمارات تعمیر کرا کے اپنے ملک کو دلھن کی طرح سجا دیا۔ رہا انتظام سلطنت، سو باوجود اس کے کہ پنجاب کی طرف سے ہمیشہ خلش ہی قایم رہی، وہ کبھی ادھر سے غافل نہیں رہا اور جب کسی نے سرکشی کی خود پہونچکر اس کو سزا دی۔

جب اریاروق حکومتِ پنجاب سے معزول کیا گیا تو احمد نیالتگین اس کی جگہ مقرر ہوا (یہ محمود کا خزانچی تھا اور اکثر مہموں میں اس کے ساتھ رہ چکا تھا) چلتے وقت خواجہ میمندی نے ہدایت کردی تھی کہ سیاسی و مالی معاملات میں اُسے دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق قاضی شیراز سے رہے گا۔ اس طرف نیالتگین کو تو یہ ہدایت کردی گئی اور اُدھر خفیہ محکمۂ خبر رسانی کو یہ تاکید کی گئی کہ سارے حالات سے دربار کو آگاہ رکھا جائے، لیکن چونکہ وہ محمود کے ساتھ رہ کر فتوحات کی لذت سے آشنا ہوچکا تھا، اس لئے اس کے لئے نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ چند دن گزرے تھے کہ اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں چلانے شروع کئے حتےٰ کہ بنارس تک اس نے اپنی تاخت کے حدود کو وسیع کرلیا اور قاضی شیراز سے اس کی چل گئی۔

ممکن تھا کہ مسعود اس کو برداشت کرلیتا۔ لیکن نیالتگین کے حوصلے بڑھتے ہی گئے اور مسعود کو خبر لگی کہ وہ خفیہ طور سے ترکی غلاموں کو خرید کے ان کی ایک جماعت مرتب کر رہا ہے اور اپنے تئیں محمود کا بیٹا ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ لاہور کی ساری فوج اس کی مطیع تھی اور ترکمانوں کی ساری جماعت اس کی معاون ہوگئی تھی اس لئے سارے اسباب بغاوت کے فراہم ہوگئے اور ۴۲۴ھ ۱۰۳۳ء میں اس نے سرکشی کا اعلان کردیا، قاضی شیراز قلعہ بند ہوگیا اور ہر جگہ بدامنی، فساد اور خونریزی نظر آنے لگی۔

جب مسعود کو سارے حالات معلوم ہوئے تو اس نے ایک ہندو سردار تلک کو اس سرکوبی کے لئے مامور کیا

---

[1] کیونکہ وہ شہید ہوا تھا اور مسلمانوں کے عقیدہ میں شہید ہمیشہ مغفور ہوتا ہے۔

تلک ایک ہندو نائی کا لڑکا تھا۔ لیکن نہایت حسین اور خوش تقریر عرصہ تک کشمیر میں رہ چکا تھا اور فارسی میں کافی استعداد رکھتا تھا۔ محمود کے عہد میں وہ خواجہ میمندی کا سکریٹری ہوا اور پھر رفتہ رفتہ جب امیر مسعود کا زمانہ آیا تو وہ مخصوص امراء دربار میں شامل ہوگیا۔ اور طبل وعلم اس کو عنایت ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسوقت ہندو مسلمانوں کے تعلقات باہمی بہت بڑھ گئے تھے اور مسلمان فرمانرواؤں کی رواداری ہندوؤں کے ساتھ آخری حد تک پہونچ گئی تھی

القصہ ملک احمد نیالتگین کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ مسعود بہت فکرمند تھا کیونکہ ادھر مغرب میں سلاجقہ کا خطرہ زیادہ سنگین ہوتا جاتا تھا اور کرمان میں مسعود کی ہندو فوج کے بھاگ جانے سے اسے سخت شکست ہوچکی تھی۔ لیکن ہندوستان کی طرف خیر گذری اور تلک نے نیالتگین کو شکست دے کر اس کا سر غزنی بھیجدیا۔

مسعود اس کامیابی سے اس قدر مسرور ہوا کہ اس نے خود ہانسی پر دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ مصمم کرلیا۔ ہر چند وزراء نے اس کو سمجھایا کہ یہ وقت غزنی چھوڑنے کا نہیں۔ کیونکہ اگر سلاجقہ نے خراسان یا اس کا ایک گاؤں لے لیا تو ہانسی پر دس بار جہاد کرنا بھی اس کی تلافی نہیں کرسکتا۔ لیکن مسعود نہیں مانا۔

مسعود نے خواجہ میمندی کو غزنی میں اپنا قایم مقام اور شہزادہ مودود کو بلخ کا وایسرائے مقرر کرکے ۴۲۵ھ ۱۰۳۴ء میں کابل ہوتے ہوئے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ راستہ میں وہ بیمار ہوا تو شراب سے توبہ کی اور سارا آبدارخانہ توڑوا کر خم کے خم دریائے جھیلم میں لنڈھا دئے۔ الغرض قلعہ ہانسی پہونچا اور اسے فتح کرکے غزنی واپس آیا۔ یہاں پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ واقعی ہانسی جانا اسوقت خلاف مصلحت تھا اور وزراء کا مشورہ بالکل درست تھا۔ اسوقت حالت یہ تھی کہ خراسان سلاجقہ کے ہاتھ میں چلا جارہا تھا، ایران کا مغربی حصہ غزنی کے حلقۂ اطاعت سے اپنے تئیں آزاد کررہا تھا۔ ہرچند مسعود نے امداد کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ مرو کے قریب اسے شکست ہوئی اور یہ عالم اضطراب میں پھر ہندوستان کی طرف آیا کہ یہاں سے فوج فراہم کرکے بارِ دگر سلاجقہ کا مقابلہ کرے۔ لیکن جونہی اس نے دریائے سندھ کو عبور کیا، باغی فوج نے اسے گرفتار کرکے اس کے بھائی کو تخت نشین کردیا اور چند دن بعد اسے قتل کردیا۔

اس میں شک نہیں کہ پہلی غلطی تو مسعود نے یہ کی کہ وہ خراسان کی طرف سے منھ موڑ کر ہانسی آیا اور اس سے زیادہ نادانی یہ ہوئی کہ سلاجقہ کے خوف سے اس نے پھر غزنی چھوڑ کر ہندوستان کا ارادہ کیا۔ سلاجقہ نے حقیقتاً اس وقت تک غزنی کا قصد نہ کیا تھا بلکہ وہ صرف ایران کے خواہشمند تھے، چنانچہ وہیں سے وہ واپس گئے۔

اس کے بعد مودود (مسعود کا لڑکا) اپنے باپ کا انتقام لینے کی غرض سے آیا اور اپنے چچا کو گرفتار کرکے تخت نشین ہوگیا۔ مسعود کے بعد اس کے جانشینوں نے ایک صدی سے زاید مدت تک غزنی کے کوہستانی علاقہ پر حکومت کی لیکن ضعف و انحطاط بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اور محمود کے کارناموں پر جتنے زاید دن گذررہے تھے اُسی قدر

غفلت وخمول آلِ سبکتگین میں پیدا ہوتا جاتا تھا۔

اس خاندان کے جتنے افراد نے حکومت کی اُن کا ذکر نام بہ نام اس سے قبل ہوچکا ہے لیکن چونکہ مسعود کے بعد کسی کی حکومت سیاسی نقطۂ نظر سے اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے ہم جداگانہ تنقید نہیں کرتے۔ باعتبارِ اخلاق و دیگر صفاتِ انسانی کے ان میں سے اکثر فرمانروا عجیب وغریب تھے اور ابراہیم و بہرام کی طویل مدتِ سلطنت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کم ازکم مرکزِ حکومت میں کوئی تزلزل واقع نہ ہوا تھا جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ سلاجقہ کے ساتھ انھوں نے تعلقاتِ ازدواج قایم کرلئے تھے اور اس طرح یہ دونوں خاندان متحد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب دورِ آخر میں سلطنتِ غزنی کے لئے باہم بھائیوں میں مخالفت پیدا ہوئی تو سلطان سنجر سلجوقی، ارسلان شاہ کے خلاف بہرام کی مدد کے لئے آیا اور چند دن تک غزنی پر عارضی قبضہ بھی رکھا۔

ہندوستان کی طرف سے بھی کسی خطرہ کا خیال قایم کرنا غلطی تھی۔ کیونکہ محمود کے حملوں نے ہندو راجاؤں کو ایسا معمولی درسِ سبق نہیں دیا تھا کہ وہ آسانی سے فراموش کردیتے۔ ایک بار تو تقریباً ایک لاکھ ہندوؤں نے ۴۳۵ھ (۱۰۴۳ء) میں لاہور پر قبضہ ہی کرلیا تھا۔ لیکن وہ افواجِ غزنی کی خبرِ آمد سُنکر مُنتشر ہوگئے اور اس طرح صوبۂ لاہور آخر دن تک نہ صرف سلطنتِ غزنی سے متعلق رہا۔ بلکہ آخری فرمانرواؤں نے اسے اپنا دارالحکومت بھی بنالیا۔

باب پنجم

محمود غزنوی کے سترہ حملے

محمود غزنوی کے حملوں کی تعیین و تحقیق مقامات ۔ حملوں کی تعداد اور مورخین کا اختلاف ۔ پہلے حملہ کے متعلق مورخین کا بیان

محمود کن کن اوقات میں ہندوستان آیا۔ اس نے کن کن مقامات پر حملے کئے اور حملوں کی تعداد کیا تھی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو خاندان غزنی کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ کتب تاریخ کے بیانات اس باب میں ایسے پیچیدہ اور اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں کہ آج موجودہ فن تنقید کے لحاظ سے اُن پر اعتبار کرکے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو روشنی میں لے آنا سخت دشوار ہوگیا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر متعدد حملے کئے، یہ بھی غلط نہیں کہ مختلف مقامات پر اُس نے تاخت کی۔ لیکن جسوقت یہ جستجو کی جاتی ہے کہ وہ مقامات اُسوقت ہندوستان کے کس حصہ میں پائے جاتے تھے اور اب بھی وہ موجود ہیں یا نہیں تو بہت سی دقتیں رونما ہو جاتی ہیں اور اصل واقعات و مقامات کا سراغ مشکل ہو جاتا ہے۔

عام طور سے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ محمود نے کل بارہ حملے کئے اور اس تعیین کے لئے سب سے بڑی سند "طبقات اکبری" کی پیش کی جاتی ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ملا نظام الدین احمد نے باوجود تعیین شمار کے جہاں اُن حملوں کی تفصیل بیان کی ہے تو وہ کسی طرح سولہ ۱۶ سے کم نہیں ہوتے۔ بہر حال ضرورت ہے کہ شروع سے ان حملوں کا استقصاء کرنے کے بعد معلوم کیا جائے کہ اُن کی تعداد کیا تھی۔

پہلا حملہ۔ نظام الدین احمد اور فرشتہ نے ظاہر کیا ہے کہ ۳۹۰ھ میں محمود ہندوستان کی طرف بڑھا اور

بہت سے مقامات پر قبضہ کرکے اور وہاں اپنے عامل چھوڑ کر غزنی واپس آیا۔

اس حملہ کا ذکر صرف انھیں دو مورخوں نے کیا ہے۔ تاریخ یمینی میں اس کا کوئی حال درج نہیں ہے لیکن اس حملہ کے غیر ممکن الوقوع ہونے کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔

تاریخ یمینی سے ثابت ہے کہ محمود کے باپ سبکتگین نے علاوہ قصدار اور لمغان کے تین حملوں کے (جن کا بیان صراحت سے کیا گیا ہے) اور بھی متعدد حملے ہندوستان پر کئے اور اُسوقت بھی جب کہ عنانِ حکومت الپ تگین کے ہاتھ میں تھی یہ دریائے چناب کے ایک ساحلی مقام سودرا تک بڑھ کر تاخت کر چکا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ محمود کی زندگی شروع ہی سے ان محاربانہ منظر کی عادی تھی اور اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہندوستان کی آبادی زابلستان کے سپاہیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تخت نشینی کے بعد تین سال تک ہندوستان کی طرف توجہ نہ کرتا جب کہ گزشتہ تجربات نے یہاں کے ملک کو زیادہ یسیر الحصول ثابت کر دیا تھا۔

محمود ۳۸۷ھ میں تخت نشین ہوا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اول اول اسے اپنے استحکام اور انتظام سلطنت کی طرف سے فرصت نہ ملی ہوگی کہ وہ دوسرے ممالک کی طرف دست آزدراز کرتا۔ لیکن تین سال کا زمانہ ایسا نہیں ہے کہ وہ اندرون ملک کے تمام معاملات طے نہ کر چکتا۔ اس لئے ملا نظام الدین اور فرشتہ کا بیان اس حملہ کے متعلق جو تخت نشینی کے تین سال بعد وقوع میں آیا، بالکل قرین قیاس ہے اور اس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ عتبی تاریخ یمینی کا مصنف دربار محمود سے وابستہ تھا اور اس کی کتاب خاندانِ غزنی کی نہایت معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ وہ کسی حملہ میں محمود کے ساتھ نہیں گیا جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جغرافیہ ہندوستان کے متعلق اس کے اکثر بیانات غیر صحیح ہیں اور اسے ہند کے کسی مقام کا صحیح جائے وقوع معلوم نہ تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس نے لاہور، اور دہلی ایسے مشہور مقامات کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا اور سوائے لفظ "رائے" کے کسی ہندی نام یا لفظ کا استعمال بھی اس کی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ یہی حال سنہ و تاریخ کا ہے۔ اس لئے عتبی کی فرو گزاشت (تردید نہیں) پر یقین کر کے اس حملہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ طبقات اکبری کی صحت میں مشکل سے کسی مشرقی یا مغربی مورخ کو انکار ہو سکتا ہے۔

چونکہ اس حملہ کا ذکر نہایت مجمل کیا گیا ہے اور کوئی تعیین مقام نہیں کی گئی ہے، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاخت صرف سرحدی مقامات پر تھی اور اندرون ملک میں پیشقدمی نہیں کی گئی۔

دوسرا حملہ۔ پشاور اور ویہند پر ہوا۔ شوال ۳۹۱ھ میں محمود غزنوی غزنی سے روانہ ہوا اور ۸ محرم ۳۹۲ھ

کو پشاور میں ایک سخت جنگ ہوئی، جس میں جے پال معہ اپنے پندرہ سرداروں کے گرفتار ہوگیا۔

بعد کے مورخین کا بیان ہے کہ جنگِ پشاور کے بعد وہ بھٹنڈا آیا اور یہاں کا محاصرہ کیا اب سوال یہ ہے کہ واقعی محمود بھٹنڈا تک آیا یا نہیں اور اگر وہ مقام بھٹنڈا نہیں تھا تو کون تھا؟

مسٹر الفنسٹن کا بیان ہے کہ:۔

"بھٹنڈا دریائے ستلج سے آگے واقع ہے اور غالباً اس عہد میں یہ کوئی اہم مقام رہا ہوگا"

کرنل ٹاڈ کی رائے ہے کہ:۔

"راجہ لاہور، بھٹنڈا میں بھی رہا کرتا تھا"

اگر محمود واقعی بھٹنڈا آیا تو ظاہر ہے کہ اُسے پنجاب کے پانچوں دریا عبور کرنے پڑے ہوں گے اور اسی اشکال کے رفع کرنے کے لئے مسٹر الفنسٹن نے یہ تاویل کی ہے کہ:۔

چونکہ جنگ پشاور ۲۸ر نومبر کو ہوئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ محمود بھٹنڈا آخر ایام سرما میں پہونچا ہوگا اور اس زمانہ میں ہر چند یہ تمام دریا پایاب نہیں ہو جاتے تاہم پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے سواروں کے لئے زیادہ دشوار گذار بھی نہیں رہتے۔"

طبقات اکبری میں بھی بھٹنڈا تحریر ہے اور فرشتہ نے تو یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ:۔

"راجہ جے پال یہیں رہا کرتا تھا کیونکہ یہاں سے وہ مسلمانوں کے حملہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتا تھا"

فرشتہ کی یہ دلیل جیسی کچھ ہے ظاہر ہے کیونکہ بھٹنڈا پنجاب کا بعید ترین مشرقی مقام ہے اور یہاں رہ کر کبھی مسلمانوں کا مقابلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا علی الخصوص اسوقت جبکہ درمیان میں حملہ روکنے کے لئے پانچ دریا بھی حایل تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مقام کے تعین میں سب سے پہلے غلطی طبقات اکبری کے مصنف سے ہوئی اور پھر اس سے فرشتہ نے اخذ کر کے تمام بعد کی کتب تاریخ میں پھیلا دی۔

تاریخ یمینی میں اس مقام کا نام ویہند یا ویہند تحریر کیا گیا ہے۔ اور ابن اثیر نے بھی ویہند لکھا ہے اور ویہند دریائے سندھ کے مغربی ساحل پر پشاور سے صرف تین منزل کے فاصلہ پر واقع تھا اور مشرقی علاقہ قندھار کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا چنانچہ بیرونی، بیہقی، اور ابو الفدا نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے اب بھی یہ مقام موجود ہے اور وہاں کے لوگ عام طور سے اُسے ہوند کہتے ہیں۔

تیسرا حملہ۔ ۳۹۵ھ میں بھیرا پر ہوا جسے عام طور سے مورخین نے بھاٹیا، بھٹیا، بھٹنا تحریر کیا ہے۔

برگس نے تاریخ فرشتہ کا ترجمہ کرتے ہوئے اس مقام کی تعیین سے معذوری ظاہر کی ہے۔ مسٹر الفنسٹن نے ظاہر کیا ہے کہ :-

"یہ مقام صوبۂ لاہور کے ماتحت ملتان کے جنوب میں واقع تھا"

برڈ نے اس کو بھٹنیر سے تعبیر کیا ہے جو صحرائے بیکانیر کے انتہائی شمال میں واقع ہے میجر گسٹال نے بھاولپور سمجھا ہے۔

فرشتہ نے لکھا ہے کہ "محمود غزنوی حدودِ ملتان سے گذر کر بھٹیا پہونچا اور یہاں کا راجہ لاہور کے راجہ سے مختلف تھا لیکن دوسری جگہ وہ ظاہر کرتا ہے کہ سلطنتِ لاہور کشمیر سے ملتان تک وسیع تھی اور یہاں کا راجہ دریائے سندھ کے ساحل پر ایک جنگل میں چھپ گیا"۔

عتبی کا بیان ہے کہ :-

"محمود دریائے سندھ کو عبور کر کے بھٹیا پہونچا اور یہاں کے راجہ نے بھاگ کر کسی پہاڑ میں پناہ لی"

یہ تمام بیانات قرین قیاس نہیں ہیں کیونکہ :-

(۱) ملتان کے جنوب میں کسی مقام کا لاہور سے متعلق ہونا بالکل خلاف قیاس ہے جب کہ ملتان آپ خود مختار تھا۔

(۲) محمود کو کیا ضرورت تھی کہ وہ پنجاب کے متعدد دریاؤں کو صرف اس لئے عبور کرتا کہ صحرائے بیکانیر کے ایک معمولی مقام پر قابض ہو جائے؟

(۳) یہ کیونکر ممکن ہے کہ محمود اس قدر آسانی سے بھاولپور پہونچ جاتا جب کہ راستہ میں سارا ملک جنگ آزما دشمنوں سے بھرا پڑا تھا۔

(۴) راجہ بھٹیا کس طرح اپنے قلعہ کو چھوڑ کر ایک صحرا میں پناہ لینا مناسب سمجھتا۔ یا

(۵) وہ پہاڑ میں کیونکر چھپ جاتا جب کہ اس کے چاروں طرف سو سو کوس سے زاید کہیں کسی پہاڑ کا پتہ نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس نام کے پڑھنے میں مورخین نے غلطی کی ہے۔ اصل میں اس کا نام بھیرا ہے جو دریائے جھیلم کے بائیں ساحل پر کوہستانِ نمک کے نیچے واقع ہے اور اب بھی وہاں کے کھنڈر اس کی قدامت کا پتہ دیتے ہیں خلاصۃ التواریخ میں بھیرا ہی لکھا ہے اور مسٹر ڈو نے تاریخ فرشتہ کے جس نسخہ سے ترجمہ کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ

"ہر چند محمود نے بھٹیا کا قصد کیا تھا لیکن وہ اتفاق سے شہر تہیرہ پہونچ گیا"

چونکہ تھیرہ اور بھیرہ میں تجنیسِ خطی موجود ہے اس لئے ممکن ہے کہ غلطی سے بھیرہ کو تہیرہ لکھ دیا ہو۔

یہاں ایک خیال اور پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ پہلے بھیرہ کا نام بھٹیا رہا ہو کیونکہ اب بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں بھٹی راجپوت رہتے تھے اور دریائے چناب پر پنڈی بھٹیان کا وجود اسکی کافی شہادت ہے

عتبی، ابن اثیر اور بیرونی نے بھی بھٹیا لکھا ہے لیکن موجودہ جغرافیہ کے لحاظ سے اس کو اب بھیرہ ہی تسلیم کرنا پڑ گیا۔ چونکہ ملتان کا علاقہ کوہستان نمک (Salt Range) تک وسیع تھا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنی سے چلکر بنّو آیا ہوگا اور یہاں سے خرم ہوتا ہوا اور عیسیٰ خیل کے قریب دریائے سندھ کو عبور کرتا ہوا براہ خوشاب و شاہپور بھیرہ آگیا ہوگا۔

چوتھا حملہ۔ ۳۹۶ھ میں ملتان پر ہوا۔ ابن اثیر اور مصنف حبیب السیر نے بھٹیا اور ملتان کا محاصرہ ایک ہی سال میں ظاہر کیا ہے لیکن عتبی کے بیان سے واضح ہے کہ اس جدید حملہ ملتان کے لئے خاص طیاریاں علحدہ کی گئی تھیں۔

اس زمانہ میں ملتان کا گورنر ابو المفتوح یا ابو الفتح تھا۔ یہ بت پرست تو نہیں تھا لیکن قرامطہ[1] میں سے تھا۔ البیرونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ " اس حملہ سے قبل ملتان پر قرامطہ کی حکومت تھی اور انھوں نے خلفائے بنی امیہ کے عہد کی بنی ہوئی مسجد کو بند کر دیا تھا۔ محمود غزنوی نے قرامطہ کا استیصال کیا تو یہ مسجد پھر کھولی گئی اور لوگ نماز پڑھنے لگے"۔

سوائے طبقات اکبری اور خلاصۃ التواریخ کے دیگر کتب تاریخ میں قرامطہ کے بجائے ملاحدہ لکھا ہے،

---

[1] قرامطہ جمع ہے قرمطہ کی۔ چونکہ قرمطہ کے لغوی معنی ہیں "تنگ و تاریک تحریر" کے اس کا بانی بھی خفیہ طور سے اپنے مذہب کی تلقین کرتا تھا۔ اس لئے وہ قرمطہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

تیسری صدی ہجری میں ایک ایرانی عبداللہ بن میمون نے اسماعیلیہ مذہب اختیار کیا، اور پھر اس کے بیٹے احمد کے ایک مبلغ حسین الاہوازی سے، ہمدان قرمطہ نے اس مذہب کے اصول سیکھ کر فرقۂ قرامطہ کی بنیاد ڈالی۔ عبداللہ ابن میمون کا مقصود یہ تھا کہ کسی طرح وہ عربوں کی قوت اور اسلام کے اثرات کو ضعیف کر دے اور اس لئے اس نے ایک خفیہ سوسائٹی قایم کی اور چونکہ سوادِ عراق ایسے فتنوں کی پرورش کے لئے زیادہ موزوں جگہ تھی اس لئے اس سوسائٹی کا نشو و نما یہیں ہوا اور اسی جگہ اس نے ترقی کی۔

عبداللہ کی تعلیم یہ تھی کہ ہر وقت کسی نہ کسی امام کا موجود رہنا ضروری ہے خواہ علانیہ طریقہ سے ہو یا خفیہ طور پر۔ اسماعیل کو وہ آخری امام قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اس کے بعد آنے والا امام پوشیدہ ہے۔ اور اس کے اصول اس کے داعیوں کے ذریعہ سے ملک میں پھیلائے جاتے تھے۔ انھیں داعیوں میں سے ہمدان قرمط تھا احمد بن عبداللہ برائے نام سردار تھا اور سارا کام یہی ہمدان کرتا تھا۔ جو لوگ اس مسلک کو اختیار کرتے تھے۔ انھیں خفیہ اصول کی تعلیم تدبیر کے ساتھ دی جاتی تھی پہلے اُن سے اطاعت کا حلف لیا جاتا تھا اور کچھ رقم بطور فیس کے وصول کی جاتی تھی۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۹۱ پر ملاحظہ کیجئے)

چونکہ ملاحدہ ایک عام لفظ ہے جس میں قرامطہ بھی داخل ہیں (ہر چند مورخین مابعد نے صرف اسماعیلیہ طبقہ کو ملاحدہ سے تعبیر کیا ہے) اس لئے یہ امر متفقہ طور سے ثابت ہے کہ حملۂ ملتان کے وقت یہاں قرامطہ کی حکومت تھی اور ان کا سردار ابو الفتح تھا۔

اس کا نام داؤد تھا اور شیخ حمید لودھی کا (جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اس نے امیر سبکتگین کی اطاعت اختیار کر لی تھی) پوتا تھا۔ اس نے راجہ انندپال کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور محمود کا مقابلہ کیا۔ محمود نے پشاور کے قریب انندپال کو شکست دیکر سودرا (دریائے چناب کے ایک ساحلی مقام) تک تعاقب کیا اور پھر یہاں سے بھیرہ[1] ہوتا ہوا ملتان پہونچا۔

ابن اثیر، میر خوند، اور رحید رازی کا بیان ہے کہ داؤد بھاگ کر سرندیپ چلا گیا۔ لیکن عتبی کہتا ہے کہ وہاں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۹۰)

تعلیم کے سات درجے مقرر تھے۔ پہلے درجہ میں صرف یہ بتایا جاتا تھا کہ قرآن ایک راز ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے کسی معلم کی ضرورت ہے دوسرے درجہ میں یہ تعلیم دیجاتی تھی کہ قرآن کی جو تعلیم اس سے قبل دی گئی ہے غلط ہے اور صرف وہی اُصول درست ہیں جو اماموں کے ذریعہ سے سینہ بہ سینہ پہونچے ہیں۔ تیسرے درجہ کی تعلیم یہ تھی کہ امام صرف سات ہیں اور شیعہ اس سے زیادہ تعداد بتانے میں غلطی کرتے ہیں۔ چوتھے درجہ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر امام کا ایک پیغامبر ہوا کرتا تھا اور آخری امام کا پیغامبر عبد اللہ تھا۔ پانچویں درجہ میں احادیث و سنن کی طرف سے منحرف کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ساتویں درجہ میں پہونچکر ایک شخص بالکل ملحد ہو جاتا تھا۔

۲۹۰ھ میں انھوں نے شام پر سخت حملہ کیا اور ۳۱۱ھ میں بصرہ اور کوفہ کو غارت کر کے ابو طاہر کو اپنا پیشوا بنایا اور مکۂ معظمہ پر تاخت کر کے حجر اسود وہاں سے اُٹھا کر لے گئے۔ عباسی خاندان کا بیسواں خلیفہ الراضی ان لوگوں کو سالانہ معقول رقم صرف اس لئے دیا کرتا تھا کہ وہ حاجیوں کو حج کرنے دیں۔ ہلاکو اور منگو خاں نے قرمطی اور اسماعیلی فرقہ کو بہت تباہ کیا۔ لیکن ان میں سے بقیۃ السیف (حسب بیان بیرونی) وادی سندھ میں آکر پھیل گئے۔ اور ملتان پر قابض ہو گئے۔

یہی جماعت تھی جس کے سردار ابو الفتح کو محمود غزنوی نے مغلوب کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نسل بالکل مفقود نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام خاندان کے زمانہ میں پھر انھوں نے جامع مسجد دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اب ہندوستان میں تو ان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ لیکن ان کے بعض اُصول بوہرہ قوم میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ یہاں کے زنجبار، شام، ایران و عرب کے بعض حصوں میں بھی بعض فرقے ایسے ہیں، جنھیں قرامطہ، یا اسماعیلیہ گروہ کی بگڑی ہوئی جماعتوں سے تعبیر کرنا چاہئے۔

[1] اس جگہ بھی مورخین نے بھٹنڈا لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ سودرا سے ملتان جانے کے لئے بھٹنڈا کا راستہ بالکل نامناسب پیچیدہ اور دور دراز ہے، بھیرہ ہوتے ہوئے البتہ سیدھا راستہ تھا۔

سے دو کروڑ درہم جرمانہ وصول کیا گیا فرشتہ نے لکھا ہے کہ بیس ہزار دینار خراج مقرر کرکے آیندہ کے لئے قرمطی عقاید سے توبہ لی گئی اگر عنصری کے شاعرانہ مبالغہ کو صحیح سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس حملہ میں محمود نے دو سو قلعے فتح کئے۔

پانچواں حملہ ۔ ۳۹۸ھ میں نواسہ شاہ کے خلاف عمل میں آیا۔ محمود اپنے چوتھے حملہ (فتح ملتان) سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایلک خاں نے ملک غزنی پر حملہ کیا۔ محمود یہ خبر سنکر غزنی واپس گیا اور ہندوستان کے مقبوضات سیوک پال (یا بقول فرشتہ سکھ پال) کے سپرد کر گیا۔

سکھ پال کو پشاور میں ابو علی سنجری نے قید کرکے مسلمان کرلیا تھا اور اسی بنا پر محمود اس کو اپنا قایم مقام بنا گیا تھا۔ لیکن جب ایلک خاں کے مقابلہ سے فارغ ہوا تو اُسے معلوم ہوا کہ سکھ پال مرتد ہوگیا ہے اس لئے اسنے پھر ہندوستان کا قصد کیا اور سکھ پال سے چار لاکھ درہم تاوان لیکر قید کرلیا۔

ڈاکٹر برڈ، اس مہم سے انکار کرتے ہوئے حملۂ ملتان ہی میں اسے شامل کرتے ہیں لیکن عتبی، میر خوند، خونزیر اور فرشتہ نے صراحتہً اس حملہ کا الگ ذکر کیا ہے اس لئے انکار کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

ڈاکٹر برڈ نے ایک دلیل اور یہ بھی پیش کی ہے کہ نواسہ شاہ، ابو الفتح کو کہا کرتے تھے (کیونکہ وہ شیخ حمید لودی کا نواسہ تھا) اور ابو الفتح حملۂ ملتان ہی میں مغلوب ہوا تھا لیکن اس دلیل کی کمزوری اس سے ظاہر ہے کہ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ نواسہ شاہ پھر بت پرستی کرنے لگا تھا اس لئے محمود نے حملہ کیا۔ اگر نواسہ شاہ سے ابو الفتح مراد ہو تو اس کے متعلق یہ فقرہ بیکار ہوجائے گا۔ کیونکہ اگر وہ اسلام سے پھرتا تو قرمطی ہوجاتا (جیسا کہ وہ پہلے تھا) نہ کہ بُت پرستی کرنے لگتا۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ صرف ابو الفتح کو نواسہ شاہ کہا جائے۔ ممکن ہے کہ سکھ پال کو بھی نواسہ شاہ کہتے ہوں کیونکہ وہ راجہ جے پال کا نواسہ تھا۔

مسلمان ہونے کے بعد سکھ پال کا نام کیا رکھا گیا اس میں مورخین کا اختلاف ہے بعض نے آب سہارا آب سار لکھا ہے اور بعض نے زاب شاہ۔ بہرحال اسلام لانے کے بعد اس کا نام جو کچھ بھی رکھا گیا ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ جے پال کا نواسہ تھا کیونکہ عتبی نے مہم قنوج کے بیان میں لکھا ہے کہ:۔

"بھیم پال (جے پال کے پوتے) نے اس بات کی شکایت کی تھی کہ میرا چچا بہ جبر مسلمان کیا گیا"

شاہ کا خطاب ممکن ہے خود محمود نے دیا ہو۔

چھٹا حملہ ۔ ۳۹۹ھ میں نگر کوٹ پر کیا گیا اس حملے کے ابتدائی واقعات یمینی، حبیب السیر اور تاریخ فرشتہ

میں کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن ہم یہاں فرشتہ سے اس کے واقعات مختصر طور پر بیان کرتے ہیں اور پھر اس پر تنقید کریں گے۔

۳۹۹ھ میں محمود نے انند پال کو سزا دینے کے لئے (جس نے حملہ ملتان کے وقت سخت مخالفت کا اظہار کیا تھا) افواج فراہم کیں۔ انند پال نے اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے ہندو راجاؤں کو اپنا شریک کرلیا اور بڑی فوج کے ساتھ پنجاب کی طرف بڑھا۔ گکھڑوں کی جماعت بھی ہندوؤں کے ساتھ ہوگئی تھی۔

اس جنگ میں نہ صرف ہندو راجاؤں نے اپنی ساری قوت صرف کردی بلکہ اُن کی عورتوں نے بھی زیور بیچ بیچ کر مجاہدین کفر کی اعانت میں بہت بڑا حصہ لیا ـــــ صحرائے پشاور اس یادگار جنگ کے لئے منتخب کیا گیا اور چالیس دن کی طیاریوں کے بعد لڑائی شروع ہوئی۔ اسمیں شک نہیں کہ محمود کی قلیل فوج ہندوؤں کے اس بحر ذخار سے بمشکل جانبر ہوسکتی لیکن اتفاق سے انند پال کا ہاتھی تیروں کی بارش اور روغن نفط کے شعلوں سے ڈر کر بھاگا اور اس طرح تمام ہندو سپاہ کے پاؤں اُکھڑ گئے اور تیس ہاتھیوں کے علاوہ اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے بعد محمود غزنوی، نگر کوٹ روانہ ہوا جس کا قلعہ "قلعۂ بھیم" کے نام سے مشہور تھا۔ تین دن کے محاصرہ کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہوا اور بے اندازہ دولت ہاتھ آئی۔

مسٹر الیٹ کی رائے ہے کہ:۔

"یہ جنگ بھی غالباً دریائے سندھ یا دریائے ویہند کے قریب ہوئی ہوگی کیونکہ پشاور مسلمانوں کے قبضہ میں پہلے سے موجود تھا اور اس کے صحرا میں جنگ کا ہونا قرین قیاس نہیں ہو یقیناً محمود نے اپنے ملک کے حدود سے آگے بڑھ کر یہ جنگ کی ہوگی جو جارحانہ اقدام کے لئے ضروری ہے"۔

رہا گکھڑوں کا شریک ہونا، سو یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے۔ لیکن ڈاکٹر برڈ کا یہ خیال کہ گکھڑ موجودہ جاٹوں کے مورث اعلیٰ تھے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

فتح نگر کوٹ کے متعلق تمام مورخین کا اتفاق ہے اور یہ وہی مقام ہے جسے اب کوٹ کانگڑا کہتے ہیں۔ قصبۂ بھیم جو قلعہ سے ایک میل کے فصل پر واقع ہے اس جگہ تھا جہاں اب بھون آباد ہے۔

ڈاکٹر برڈ نے بیان کیا ہے کہ:۔

"اگر فرشتہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ محمود جنگِ پشاور سے فارغ ہوکر نگر کوٹ گیا تو یقیناً یہ ۴۰۰ھ کا واقعہ ہوگا جیسا کہ طبقات اکبری اور حبیب السیر سے ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ محمود موسم بہار میں غزنی سے روانہ ہوا تھا اور تین چار ماہ پشاور ہی میں صرف ہو گئے تھے اس لئے اس کے بعد بارش کا زمانہ شروع ہو گیا ہوگا اور پھر دوسرے سال کے موسم بہار میں نگر کوٹ کا قصد کیا ہوگا"۔

اول تو طبقات اکبری اور حبیب السیر سے کہیں اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ نگرکوٹ کا حملہ سنہ ۳۹۹ھ میں ہوا لیکن اگر ڈاکٹر برڈ نے کسی نسخہ میں دیکھا ہو تو بھی ہمیں دیکھنا چاہئے کہ عتبی کا کیا بیان ہے جو تمام کتب مابعد کا ماخذ ہے اس نے صاف صاف لکھا ہے کہ:-

"محمود تعاقب کرتا ہوا قلعۂ بھیم نگر تک پہونچ گیا"

یعنی جنگ پشاور اور بھیم نگر ایک ہی سلسلہ میں واقع ہوئیں۔

رہا سوال موسم بہار کا سو ڈاکٹر برڈ نے یہ خیال نہیں کیا کہ جس فصل کو ایک یورپین موسم بہار سمجھتا ہے وہ ایشیا میں خزاں ہے اور جسے وہ خزاں سے تعبیر کرتا ہے وہ یہاں کی فصلِ بہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمود ربیع الآخر (یا دسمبر کے آخر) میں غزنی سے چلکر شروع فروری میں دریائے سندھ تک آیا اور مارچ تک نگرکوٹ کی مہم سے فارغ ہوکر قبل آغازِ گرما غزنی واپس گیا۔ معلوم نہیں بارش کی ابتدا ڈاکٹر برڈ نے کس حساب سے معلوم کی۔

ساتواں حملہ - سنہ ۴۰۰ھ میں نارائن کا ہے۔ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں اس حملہ کا ذکر نہیں ہے۔ عتبی، روضۃ الصفا اور حبیب السیر میں اس کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود نارائن کی طرف کوچ کرکے "وسطِ ہند" تک پہونچ گیا۔ اور بہت سے سرداروں کو اپنا مطیع بناکر اور کثیر مالِ غنیمت حاصل کرکے غزنی واپس گیا۔

اس حملہ کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ نارائن کس جگہ واقع تھا اور اب وہ کہاں پایا جاتا ہے۔ مسٹر الیٹ نے بعد تحقیق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نارائن سے مراد نہلواڑہ ہے جو گجرات کا صدر مقام تھا لیکن جنرل کننگھم نے اپنی رپورٹ آثار قدیمہ (سنہ ۱۸۶۴-۶۵ء) میں اس کی تردید کرکے ابوریحان بیرونی اور ایک چینی سیاح کے بیان سے ثابت کردیا ہے کہ اس سے مراد موجودہ نارائن پور (بیرات یا ویرات کا صدر مقام) ہے

آٹھواں حملہ - سنہ ۴۰۱ھ میں ملتان پر کیا گیا۔ اس حملہ کا ذکر عتبی، روضۃ الصفا اور حبیب السیر میں نہیں ہے۔ صاحبِ طبقات اکبری اور فرشتہ نے اس کا ذکر کیا ہے کہ:-

"سنہ ۴۰۱ھ میں فتح غور کے بعد محمود ملتان آیا اور بہت سے قرامطہ و ملاحدہ کو تہ تیغ کرکے ابوالفتح داؤد بن نصیر کو قید کرلیا اور پھر اُسے قلعۂ غور میں بھیجدیا"

نواں حملہ - سنہ ۴۰۴ھ میں نندونہ یا ناردین پر ہوا۔ اس مقام کا نام ابن اثیر، عتبی اور حبیب السیر نے ناردین ظاہر

کیا ہے۔ نظام الدین احمد اور فرشتہ نے قلعہ نندونہ تحریر کیا ہے۔

فرشتہ نے اس سے قبل سنہ ۴۰۲ھ میں حملہ تھانیسر کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن یمینی نے اس کا ذکر مہم نار دین کے بعد کیا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

آٹھویں اور نویں حملہ کے درمیان تین سال کا فصل ہے۔ اس اثنار میں محمود نے کوئی حملہ نہیں کیا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمود اور انند پال کے درمیان معاہدۂ صلح ہوگیا تھا جب سنہ ۴۰۳ھ میں انند پال کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا فرمانروائے لاہور ہوا (جیسا کہ فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہے) تو محمود نے ہندوستان کی طرف توجہ کی۔ یمینی جس نے مفصل حال اس حملہ کا بیان کیا ہے سنہ ۴۰۴ھ میں اس کا وقوع ظاہر کرتا ہے۔ اور تمام مورخین نے اس کا تتبع کیا ہے اس حملہ کے مجمل واقعات یہ ہیں کہ:۔

موسم خزاں کا اختتام تھا کہ محمود لشکر گران کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اتفاق سے سرحد ہندوستان کے قریب آکر سخت برف باری ہوئی اور بمشکل تمام دو ماہ میں ویران جنگلوں اور عمیق دریاؤں کو طے کرکے قلعۂ نار دین پر پہونچا (جو کوہ بالاناتھ[1] پر واقع ہے) یہاں کا حاکم بقول یمینی "نڈر بھیم" تھا اور طبقات اکبری میں اس کا نام پور جیپال لکھا ہے۔ بہرحال جب محمود نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا تو وہ درۂ کشمیر میں بھاگ گیا۔ محمود قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ اور سارو غ کو یہاں کا گورنر مقرر کرکے خود پور جیپال کے تعاقب میں درۂ کشمیر کی طرف چلا۔ لیکن وہ یہاں سے بھی بھاگ گیا اور محمود کو کثرت سے غلام دستیاب ہوئے اس کے بعد وہ غزنی واپس گیا۔

یمینی نے قلعۂ نندونہ یا نار دین کے حاکم کا نام نڈر بھیم لکھا ہے اور صاحب طبقات اکبری نے پور جیپال۔ لیکن غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہوجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نڈر بھیم یہاں کا گورنر تھا جس کو چھوڑ کر جیپال (یہاں کا فرمانروا) درۂ کشمیر میں چلا گیا اور چونکہ یمینی سے یہ بھی ثابت ہے کہ پور جیپال کا لڑکا بھیم پال کہلاتا تھا اس لئے بھیم پال اور گورنر نار دین دونوں ایک ہی شخص تھے۔ نڈر کا لفظ غالباً صرف اس صفت کے طور پر نام کے ساتھ شامل ہوگیا جس سے اس کی جرأت و بہادری ظاہر کرنی مقصود تھی۔

دسواں حملہ - سنہ ۴۰۵ھ میں تھانیسر پر کیا گیا۔ حبیب السیر میں اس حملہ کا بھی وہی سال (یعنی سنہ ۴۰۴ھ) تحریر کیا ہے جو نویں حملہ کا ظاہر کیا جاتا ہے۔ روضۃ الصفا میں سنہ ۴۰۲ھ تحریر ہے۔ یمینی نے حملۂ بالاناتھ کے بعد اس کا ذکر کیا ہے لیکن درمیان میں واپسی غزنی کا حال اس نے بیان نہیں کیا۔ لیکن اس سے یہ خیال کرنا کہ محمود قلعۂ بالاناتھ

---

[1] بالاناتھ ایک پہاڑی ہے جو دریائے جہلم کے قریب واقع ہے اب اُسے ٹیلہ کہتے ہیں اور بعض بعض لوگ بالاناتھ کے نام سے بھی پکارتے ہیں

فتح کرکے سیدھا تھانیسر کی طرف آیا۔ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ موسم بارش کی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے معذور تھا۔ تاریخ الفی نے اس حملہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہم فرشتہ سے یہاں مختصر واقعات اس حملہ کے بیان کرتے ہیں:۔

"محمود کو معلوم ہوا کہ تھانیسر میں ایک بڑا زبردست مندر ہے اور وہاں بہت بُت پائے جاتے ہیں اسلئے محمود نے پھر ہندوستان کا قصد کیا۔ راستہ میں راجہ انند پال کا ملک بھی پڑتا تھا جس سے صلح ہو چکی تھی اسلئے محمود نے اس کو اپنے ارادہ سے اطلاع دی تاکہ فوج کے گزرتے وقت اس کے ملک کو نقصان نہ پہونچے اور وہ اپنا انتظام کرلے۔ راجہ انند پال نے اپنی سلطنت میں احکام نافذ کر دئے کہ جس وقت عسکرِ سلطانی گزرے اس کے قیام اور آرام کا بندوبست کیا جائے لیکن اسی کے ساتھ اپنے بھائی کو (دو ہزار گھوڑے بطور تحفہ کے لیکر) محمود کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ:۔ "تھانیسر کا مندر ہندوؤں کا بہت مقدس مقام ہے اس لئے اگر وہ اُسے تباہ نہ کرے (جیسا کہ نگرکوٹ میں احتراز کیا گیا تھا) تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو خراج وہاں کا مقرر کیا جائے گا ہر سال غزنی پہونچتا رہے گا اور علاوہ اس کے میں خود بھی پچاس ہاتھی مع کثیر زر و جواہر کے پیش کروں گا۔"

محمود نے اس درخواست کو نہیں مانا اور راجۂ دہلی نے تمام راجاؤں کو اطلاع دیکر حملہ روکنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ لیکن وہ ابھی تدابیر ہی میں مصروف تھے کہ محمود یلغار کرتا ہوا تھانیسر پہونچ گیا اور جو کچھ اس نے ارادہ کیا تھا اسے کر گزرا۔ اس کے بعد محمود نے دہلی پر حملہ کرنے کا عزم کیا لیکن امراء نے مشورہ نہیں دیا۔ اور محمود غزنی واپس چلا گیا۔"

یمینی اور اس کے عہد کی دوسری تاریخوں میں عزمِ دہلی کا ذکر کہیں نہیں ہے اور فرشتہ کا مجرد بیان اس باب میں قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔

یمینی نے اس حملہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"محمود ایک لق و دق صحرا سے گزرا جس میں نام کو کہیں پانی نہ تھا اور تھانیسر پہونچا۔ اس کے نیچے ایک ندی جاری تھی جس کی تہ میں بڑے بڑے پتھر پائے جاتے تھے اور ساحل سخت سنگلاخ اور بلند تھے۔ محمود اس ندی پر اس جگہ پہونچا جہاں وہ ایک کوہستانی درہ سے نکلتی ہے۔"

اگر اس حصۂ ملک کی جغرافی حیثیت وہی تسلیم کی جائے جو یمینی نے ظاہر کی ہے تو تھانیسر کی مطابقت اس سے نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر محمود ریگستان راجپوتانہ کے بالائی حصہ کو عبور کرکے آیا ہوگا تو اُسے کوئی دریا اس انداز کا نہ ملا ہوگا اور اگر یہ دریا ملا (جو یقیناً چناب تھا) تو پھر صحرا کو عبور کرنا غلط قرار پائے گا۔

چونکہ یمینی خود اس مہم میں شریک نہ تھا اس لئے اس کا بیان یہاں کی جغرافیہ کے متعلق درست نہیں ہو سکتا ممکن ہے

کہ اس سے کسی نے غلط بیان کر دیا ہو۔

اس حملہ کی وجہ جو فرشتہ نے ظاہر کی ہے، بیان ہو چکی ہے۔ میر خوند نے تھانیسر کا نام کہیں درج نہیں کیا اور صرف اس قدر لکھا ہے کہ:-

میر خوند کا بیان

"سلطان بار دگر عزم دیار ہند کرد، چہ بمسامع علیہ او رسانیدند کہ دراں نواح بیشتر فیلانے ہستند کہ آنہا را افیالِ مسلمانان خوانند و والی آں بقعہ کافرے مشہور است۔ سلطان بعد از قطع منازل بداں دیار رسیدہ با حاکم آنجا محاربہ نمود و با اموال بسیار بہ غزنین مراجعت نمود۔"

افیالِ مسلمانان کی تشریح

اس بیان میں سب سے عجیب بات "افیالِ مسلمانان" کا ذکر ہے۔ یونیورسل ہسٹری نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ ان ہاتھیوں کا نام مسلمان اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ نہایت مطیع اور وفادار تھے۔ ڈاکٹر برڈ نے بجائے لفظ مسلمان کے سلیمان لکھا ہے۔ جامع التواریخ میں بھی مسلمان لکھا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصل ماخذ میں کتابت کی غلطی سے مورخینِ مابعد کو بھی بجنسہ وہی لکھ دینا پڑا۔ ابن اثیر اور عتبی نے بھی ان ہاتھیوں کا ذکر کیا ہے لیکن بجائے مسلمان کے سیلمانی یا صیلمانی تحریر کیا ہے اور یہی بیان قابل تسلیم ہے کیونکہ غالباً سیلمان یا صیلمان سے مراد سیلان ہے جو سیلون یا لنکا کا معرب نام ہے۔ اور سیلمانی ہاتھی سے سیلانی یعنی سیلون کا ہاتھی مراد ہوگا۔

لوہ کوٹ

گیارھواں حملہ - ۴۰۶ھ میں لوہ کوٹ[1] پر کیا گیا۔ اس حملہ سے مقصود یہ تھا کہ کشمیر کے اندر داخلہ ہو جائے لیکن اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور محمود صرف لوہ کوٹ تک پہونچ کر واپس آیا۔

مورخین کا اختلاف

یمینی روضۃ الصفا اور حبیب السیر میں اس حملہ کا ذکر نہیں ہے صرف تاریخ الفی، طبقات اکبری اور فرشتہ میں کیا گیا ہے۔ طبقات اکبری میں اس مقام کا نام صرف کوٹ اور ۴۰۶ھ تحریر ہے۔

فرشتہ نے اس حملہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"۴۰۶ھ میں محمود نے کشمیر کے اندر داخل ہونے کے لئے قلعۂ لوہ کوٹ کا محاصرہ کیا جو اپنی بلندی اور مضبوطی کے لحاظ سے مشہور تھا لیکن اس وقت شدت سے برفباری ہوئی اس لئے محمود کو محاصرہ اُٹھا کر غزنی واپس جانا پڑا۔ واپسی میں وہ راستہ بھول گیا اور ایسے مقام پر پہونچا جہاں پانی ہی پانی نظر آتا تھا بمشکل تمام اس سے نجات ملی لیکن فوج کا بڑا حصہ غرق ہو گیا۔

---

[1] ۴۱۳ھ کے چودھویں حملہ میں بھی لوہ کوٹ کا ذکر کیا گیا ہے اور اسوقت بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان دونوں حملوں کا بیان اس قدر ملتا جلتا ہے کہ بعض مورخین نے انھیں ایک ہی حملہ قرار دیا ہے۔ یمینی میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یقیناً یہ حملہ ۴۱۳ھ میں ہوا جب کہ تاریخ یمینی لکھی جا چکی تھی۔

لوہ کوٹ کہاں تھا۔ اس کا متعین کرنا ذرا مشکل ہے ممکن ہے کہ اس سے مراد وہی جگہ ہو جسے البیرونی اور رشید الدین نے لاہوریا لوہاور سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے لوہاور، راجاور سے دور نہ تھا (جو ہندوستان کی شمالی سرحد پر واقع ہے) اس لئے غالباً لوہ کوٹ سے مراد موجودہ کوٹہ ہوگا جہاں اب بھی ایک قدیم قلعہ پایا جاتا ہے اگر یہ صحیح ہے تو محمود کی واپسی دریائے پنجاب سے ہوئی ہوگی اور جس پانی میں وہ پھنس گیا تھا وہ دریائے چناب کا رہا ہوگا جو میدان میں پھیل کر اب بھی سمندر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

بارھواں حملہ - ۴۰۹ھ میں قنوج و متھرا پر ہوا۔ محمود کا یہ حملہ نہایت مشہور ہے اور اکثر مورخین نے اس کے تفصیلی حالات بیان کئے ہیں۔ متقدمین میں عتبی اور خوندامیر، متاخرین میں نظام الدین احمد اور فرشتہ خاص طور سے قابل لحاظ ہیں۔ سوائے میرخوند کے سب نے ۴۰۹ھ تاریخ حملہ متعین کی ہے اور اکثر نے یہی بیان کیا ہے کہ محمود موسم بہار میں روانہ ہوا۔ اس "موسم بہار" پر ڈاکٹر برڈ اور ان کے تتبع مسٹر الفنسٹن نے پھر مورخینِ ایشیاء کو قابل الزام قرار دیا ہے کہ:-

"۴۰۹ھ یا ۲۰ مئی ۱۰۱۸ء کو شروع ہوا تھا اس لئے اگر اس نے موسم بہار میں سفر شروع کیا تو ظاہر ہے کہ وہ ۴۰۸ھ رہا ہوگا۔"

لیکن ہم نے چھٹے حملہ کے ذکر میں ڈاکٹر برڈ کی اس غلطی کو ظاہر کر دیا ہے کہ موسم بہار کے سمجھنے میں مغربی مورخین صحت و حقیقت سے منحرف ہو جاتے ہیں اور وہ اس کا لحاظ نہیں رکھتے کہ ہندوستان کا موسم بہار بارش کے بعد شروع ہوتا ہے۔

عتبی کا بیان ہے کہ محمود نے ۹ رجب ۴۰۹ھ یعنی دسمبر ۱۰۱۸ء میں دریائے جمن کو عبور کیا اور شعبان یعنی جنوری ۱۰۱۹ء میں وہ قنوج پہونچا اور چونکہ یہ سارا سفر تین ماہ کا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اکتوبر کے مہینہ میں غزنی سے چلا ہوگا۔ اور سارا موسم سرما جنگ جاری رکھنے کے لئے اس کے واسطے کافی تھا۔

مسٹر الفنسٹن نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ:-

"اس حملہ میں محمود کا راستہ جو متعین کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ پہلے قنوج جانا بیان کیا گیا ہے اس کے بعد میرٹھ اور پھر متھرا۔"

یہ اعتراض مسٹر الفنسٹن کا محض فرشتہ کے بیان پر وارد ہو سکتا ہے جو یقیناً قابل وثوق نہیں کیونکہ وہ ہندوستان کی جغرافیہ سے آگاہ نہ تھا۔ عتبی نے جو راستہ بیان کیا ہے وہ بالکل صاف ہے اور معلوم نہیں فرشتہ نے کیوں اس سے انحراف کیا۔

عتبی لکھتا ہے کہ:-

"محمود نے حدود کشمیر کو ہمالیہ کے نشیبی سلسلہ کوہستان کے نیچے نیچے طے کر کے جمنا کو عبور کیا اور پہلے برن پر قبضہ کیا

(جو بلند شہر کا قدیم نام ہے اور جس کو بعض مورخین نے اپنی غلطی سے میرٹھ سمجھ لیا) اس کے بعد اس نے قلعۂ کل چند فتح کیا (جسے موجودہ مہابن سمجھنا چاہئے) یہاں اس نے جمنا کو عبور کیا اور متھرا پر قابض ہوا اس کے بعد وہ پھر جمنا کو طے کر کے قنوج گیا اور اس کے سات قلعے جن کے کھنڈر اب بھی نظر آتے ہیں فتح کئے اس کے بعد وہ منج گیا (جو دریائے پانڈو پر کانھ پور سے دس میل جنوب کی طرف واقع تھا اور جس کا قدیم ترین نام منجھاون یا منجھاون تھا اس کے کھنڈر اس وقت بھی موجود ہیں) یہ جگہ قنوجی برہمنوں کا صدر مقام تھا یہاں سے فارغ ہو کر وہ چندل بھور کے قلعہ پر پہونچا جو آسنی میں ساحل گنگ پر (ضلع فتحپور سے دس میل شمال شرق) تعمیر کیا گیا تھا۔ آسنی اب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن پہلے یہ بڑا شہر تھا اور اسونی کمار نے اپنے نام سے آباد کرایا تھا۔

۲۵ شعبان کو شروایا سروا[1] پر قابض ہونے کے بعد (جس سے مراد یا تو سیونرا ہے جو دریائے کین پر کالنجر اور باندہ کے درمیان واقع ہے یا سرسواگڈھ جو کو پنچ کے قریب پانچ پر نظر آتا ہے[2]) وہ چندر رائے کی جائے پناہ پر پہاڑیوں میں پہونچ گیا"

عتبی کے اس بیان سے جو راستہ محمود کا متعین ہوتا ہے وہ بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ صاحب روضۃ الصفا نے بھی یہی ترتیب قایم رکھی ہے البتہ اس نے بعض مقامات کے نام چھوڑ دئے ہیں۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ محمود نواحی کشمیر سے گزر کر۔

"بہ قلعۂ از قلاع منیع کہ پادشاہے ذوشوکت نافذ فرمان درانجا بود رسید۔ حاکم قلعہ چوں کثرت انصار دین مشاہدہ کرد با اتباع و ملازمان خود فرود آمدہ زبان بکلمۂ شہادت گویا گردانید"

(اس قلعہ سے مراد اس کی قلعۂ برن (بلند شہر) ہے) اس کے بعد اس نے قلعۂ کلچند (یعنی مہابن) فتح کیا اور پھر

"متوجہ شہرے گشت کہ معبد اہالی ہند بود"

(اس سے متھرا مقصود ہے) یہاں سے فارغ ہو کر وہ قنوج گیا اور پھر منج (جو اکثر نسخوں میں مسخ لکھا گیا ہے)

---

[1] سروا کا ذکر سوائے عتبی کے اور کسی مورخ نے نہیں کیا اور اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ بعد کے مورخین اس مقام کو سمجھ نہیں سکے۔

[2] غالب گمان یہی ہے کہ سروا سے مراد سرسواگڈھ ہوگا کیونکہ بندیلا راجاؤں کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بندیلکھنڈ میں یہ مقام بہت اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں کے مشہور شاعر چاند یا چند نے اس کے دو صدی بعد بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتھی رائے فرمانروائے دہلی نے دریائے سندھ کو عبور کر کے (جو دہلی راج اور مہوبہ راج کے درمیان حد فاصل واقع تھا) اسی شہر پر حملہ کیا تھا۔

اس کے بعد اس نے قلعہ چند پال کا محاصرہ کیا اور پھر چند رائے کے تعاقب میں مصروف ہوا۔ حبیب السیر کا بیان بھی یہی ہے سوائے اس کے کہ اس میں قنوج کے بعد کسی اور مقام کا ذکر نہیں پایا جاتا، نظام الدین احمد اور فرشتہ نے اس ترتیب کو بدل دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ محمود پہلے قنوج گیا پھر برن آیا اور اس کے بعد مہابن اور متھرا فتح کیا۔

اسی سلسلہ میں دوسرا اہم مسئلہ ہندو راجاؤں کے ناموں کا ہے۔ عتبی نے قنوج کے فرمانروا کا نام رائے جیپال اور پور وجے پال تحریر کیا ہے (اس سے مراد وہی جے پال ہے جو فرمانروائے لاہور تھا) میرخوند اور خوندمیر نے بھی اسے جیپال ظاہر کیا ہے اور البیرونی نے نروجن پال۔ نظام الدین احمد اور فرشتہ نے اسے کورا اور برگس نے فرشتہ کے ترجمہ میں کور رائے تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کور غلطی سے تحریر ہو گیا ہو اور اصل میں یہ پور رہا ہو جو کنور کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر برڈ نے کور کی یہ تاویل کی ہے کہ وہ ایک راجپوت جماعت کا نام تھا اور ممکن ہے اسوجہ سے اس راجہ کا نام کور رکھدیا گیا ہو۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ کور کسی راجپوت جماعت کا نام نہیں ہے گور اگر ہو تو البتہ قابل تسلیم ہے۔ اگر عتبی کے بیان کا اتباع کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ راجہ لاہور اسوقت قنوج پر بھی متصرف تھا۔ اس کی تصدیق عتبی کے اور بیانات سے بھی ہوتی ہے۔

مثلاً یہ کہ پور جیپال کا لڑکا بھیم پال تھا اور اسی بھیم پال نے اپنے چچا (نواسہ شاہ) کے زبردستی مسلمان کئے جانے کی شکایت کی تھی ———— اسی کے ساتھ تیرھویں حملہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ پور جیپال دریائے گنگ کے دوسری جانب بھی ایک حصۂ ملک پر قابض تھا یا اگر قابض نہ تھا تو کم از کم اس کا اقتدار ضرور وہاں قایم تھا اس لئے بالکل ممکن ہے کہ حملۂ قنوج کے وقت وہ اپنے لڑکے بھیم پال کی شادی کرنے کی غرض سے یا محمود کے آئے دن کے حملوں سے ڈر کر لاہور کو چھوڑ کر قنوج کی طرف آگیا ہو۔

تیرھواں حملہ ۔ سنہ ۴۱۲ھ میں ہوا۔ اسے جنگ راہب بھی کہتے ہیں۔ عتبی نے کوئی سنہ اس حملہ کا تحریر نہیں کیا۔ نظام الدین احمد نے سنہ ۴۰۹ھ اور فرشتہ نے سنہ ۴۱۲ھ بیان کیا ہے اور یہی تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس حملہ کے مختصر واقعات طبقات اکبری سے اخذ کر کے ہم یہاں بیان کرتے ہیں:۔

> "جب سلطان محمود نے سنا کہ ایک راجہ نے جس کا نام نندا[1] تھا، قنوج کے راجہ کو صرف اسوجہ سے مار ڈالا ہو کہ اس نے محمود کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔ تو وہ اس کے ملک پر حملہ کرنے کے لئے سنہ ۴۰۹ھ میں روانہ ہوا جب وہ جمنا کے ساحل پر پہونچا تو پور جیپال[2] (جو نندا کی مدد کے لئے آیا تھا) مقابلہ کے لئے آیا۔ چونکہ درمیان

---

[1] فرشتہ نے لکھا ہے کہ نندا کالنجر کا راجہ تھا اور بہت سے دوسرے راجہ اس جنگ میں اس کے شریک ہو گئے تھے۔

[2] فرشتہ نے "راجہ پنجاب جے پال کا پوتا" تحریر کیا ہے۔

میں عمیق دریا حائل تھا اس لئے محمود اس کے عبور کرنے کی فکر میں تھا کہ اس کے آٹھ[1] آدمیوں نے دفعتہً اس دریا کو طے کر لیا اور پورجیپال کی فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد یہی آٹھوں آدمی اور آگے بڑھ کر شہر باری[2] تک پہونچ گئے جو قریب ہی واقع تھا اور یہاں لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کے بعد محمود نندا کے ملک میں پہونچا جہاں ایک کثیر فوج[3] اس کے مقابلہ کے لئے جمع تھی۔ محمود نے پہلے اسلام کی طرف دعوت دی لیکن نندا نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد محمود نے ایک بلندی سے دشمن کی فوج کو دیکھا تو وہ پریشان ہو گیا اور خدا سے اپنی کامیابی کی دعا کی۔ رات کو نندا خدا جانے کس خوف سے مغلوب ہو کر بھاگ گیا۔ اور دوسرے دن محمود کو بغیر جنگ کئے ہوئے فتح حاصل ہو گئی۔"

عتبی نے اس جنگ کی جگہ ساحل راہب بتائی ہے اور دریائے راہب کے متعلق البیرونی نے لکھا ہے کہ وہ گنگا کے دوسری جانب بہتا تھا، اس لئے راہب کو رام گنگا ماننا پڑے گا یا دریائے سیئی سوائے عتبی کے اور تمام مورخین نے ساحل جمن پر اس جنگ کا ہونا ظاہر کیا ہے یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بیرونی نے پورجیپال کی موت ۴۱۲ھ میں تحریر کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اس جنگ میں مارا گیا۔ اگرچہ تاریخ یمینی میں صراحتہً اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

چودھواں حملہ محمود کا لوہ کوٹ اور لاہور پر

چودھواں حملہ۔ ۴۱۳ھ میں قیرات، نور، لوہ کوٹ اور لاہور پر کیا گیا چونکہ عتبی کی تاریخ یمینی اس حملہ سے قبل ختم ہو چکی تھی اس لئے اس میں اس حملہ کا ذکر نہیں ہے۔ طبقات اکبری سے اس حملہ کے مختصر واقعات یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"محمود کو معلوم ہوا کہ درۂ قیرات و نور میں کثرت سے بت پرستی کا رواج ہے اور بعض قلعے وہاں بہت مضبوط ہیں اس لئے محمود نے فراہمی افواج کا حکم دیا اور بہت سے نجار لوہار اور سنگ تراش لیکر وہاں سے چلا اس نے سب سے پہلے قیرات پر حملہ کیا۔ یہ مقام بہت سرد تھا اور پھل کثرت سے پائے جاتے تھے اور لوگ شیر کی پرستش کرتے تھے یہاں کے حاکم نے اطاعت اختیار کی اور مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد صاحب علی بن الت ارسلان نور پر

---

[1] فرشتہ نے ظاہر کیا ہے کہ یہ آٹھوں آدمی غالباً آٹھ افسر رہے ہوں گے جنھوں نے معہ اپنی ماتحت سپاہ کے حملہ کیا ہوگا۔

[2] فرشتہ نے کوئی نام نہیں لکھا۔ نظام الدین احمد کے بیان کی تصدیق ابوریحان سے بھی ہوتی ہے جس نے ظاہر کیا ہے کہ قنوج کے بعد باری ہندوؤں کا صدر مقام بن گیا تھا۔

[3] ۳۶ ہزار سوار، ۶۴۰ ہاتھی اور ایک لاکھ پچاس ہزار (بقول فرشتہ ۴۵ ہزار) پیادہ فوج۔

حملہ کرنے کے لئے مامور ہوا۔ اس نے فتح حاصل کرکے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا اور علی بن قدر جوق[1] کو وہاں کا گورنر متعین کیا۔ سنہ ۴۱۲ھ[2] میں محمود کشمیر کی طرف بڑھا اور لوہ کوٹ[3] کا محاصرہ کیا۔ یہاں ایک ماہ قیام کیا لیکن اسے ناقابل تسخیر پاکر لاہور اور باگر چلا گیا اور پھر یہاں سے غزنی۔"

حبیب السیر میں اس حملہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ فرشتہ نے اس میں صرف اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ لاہور کا راجہ، اجمیر بھاگ آیا اور محمود نے مفتوحہ ممالک ہند کے لئے حاکم نامزد کئے اور حفاظت کے لئے فوج چھوڑ گیا۔

الفنسٹن نے اس حملہ کا ذکر نہیں کیا اور برڈ نے ظاہر کیا ہے کہ اس حملہ کا ذکر کرنا گویا حملہ بالا ناتھ کی تکرار ہے کیونکہ دونوں حملوں میں مقامات و واقعات یکساں ہیں

قیرات اور نور کا ذکر ابوریحان نے بھی کیا ہے کہ:۔

"دریائے کابل ملک لمغان سے ہوتا ہوا قلعۂ دیرونہ کے قریب سے گزرتا ہے اور نور و قیرات (دو نوں ندیاں) اس سے ملجاتی ہیں اس کے بعد پشاور تک پہونچکر وہ بہت زیادہ وسیع ہوجاتی ہیں۔"

اس بیان کو دیکھ کر ہمیں نور و قیرات کا سراغ جلال آباد اور پشاور کے درمیان ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ حصۂ ملک جہاں محمود نے حملہ کیا تھا سوات، بجور اور کافرستان کا ایک ٹکڑا رہا ہوگا۔ جہاں کنیر اور لنیدی دو ندی جاری ہیں۔

طبقات اکبری نے جو حالت قیرات کی بیان کی ہے کہ وہاں میوے کثرت سے تھے، سردی زیادہ تھی اور لوگ شیر کی پرستش کرتے تھے۔ اس حصۂ ملک سے بالکل مطابق ہے اور بودھ مذہب کے بہت سے مسمار معبد یہاں پائے جاتے ہیں۔

شیر کی پرستش سے مراد بودھ کی پرستش ہے کیونکہ اُسے ساکیا سنہہ کہتے تھے اور سنہہ یا سنگھہ کے معنی شیر کے ہیں۔

پندرھواں حملہ۔ سنہ ۴۱۴ھ میں گوالیار اور کالنجر پر ہوا۔ اس کی تفصیل نظام الدین احمد نے یوں بیان کی ہے کہ:۔

"سنہ ۴۱۳ھ میں محمود نے نندا کے ملک پر حملہ کیا۔ جب وہ قلعۂ گوالیار پر پہونچا تو پہلے یہاں کا محاصرہ شروع کیا چار دن بعد یہاں کے راجہ نے ۳۵ ہاتھی پیش کرکے پناہ طلب کی۔ محمود اس پر راضی ہوگیا اور پھر کالنجر کی طرف

---

[1] فرشتہ نے سلجوقی لکھا ہے۔

[2] فرشتہ نے کوئی سال تحریر نہیں کیا لیکن اسکے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ سنہ ۴۱۳ھ میں ہوا کیونکہ اسنے سنہ ۴۱۲ھ اور سنہ ۴۱۳ھ میں دو الگ الگ حملوں کا ذکر کیا ہو۔

[3] لوہ کوٹ کی تشریح کے لئے گیارھویں حملہ کی تصریح ملاحظہ کی جائے۔

بڑھا (یہ قلعہ اپنے استحکام کے لحاظ سے بے نظیر سمجھا جاتا تھا) جب محمود نے اسکا بھی محاصرہ کر لیا تو راجہ نندا نے تین سو ہاتھی پیش کئے اور اسی کے ساتھ ہندی زبان میں کچھ اشعار محمود کی تعریف میں روانہ کئے چونکہ یہ ہاتھی بغیر مہاوتوں کے تھے اس لئے محمود نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ وہ سوار ہو گئے (جس پر نندا کو سخت تعجب ہوا) ہندی قصیدہ کا مفہوم بھی اپنے دربار کے ہندی جاننے والے شعراء سے دریافت کیا اور بے انتہا مسرور ہو کر پندرہ قلعوں کی حکومت نندا کو سپرد کر دی (فرشتہ کا بیان ہے کہ قلعۂ کالنجر بھی انھیں قلعوں میں شامل تھا) نندا نے اس عنایت کے شکریہ میں بہت سا زر و جواہر محمود کی خدمت میں پیش کیا۔"

مورخین کا اختلاف

اس حملہ کے متعلق بھی بعض مورخین کو اشتباہ ہے کیونکہ کالنجر کے قرب و جوار میں اس سے قبل محمود کا جانا ثابت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے کالنجر کو بھی فتح کر لیا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے قبل جن جن حملوں میں کالنجر کا ذکر آیا ہے ان میں گوالیار کا ذکر کہیں نہیں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حملہ حقیقتاً الگ ہے اور خصوصیت کے ساتھ کالنجر مفتوح کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔

سومنات کا حملہ

سولھواں حملہ۔ ۱۰۲۵ء — ۴۱۶ھ میں سومناتھ پر کیا گیا۔ محمود کا یہ حملہ بہت مشہور ہے اور تمام مورخین نے اس کے تفصیلی حالات بیان کئے ہیں جنھوں نے ابن اثیر اور میر خوند کا تتبع کیا ہے وہ اس حملہ کی ابتداء ۴۱۶ھ میں ظاہر کرتے ہیں اور فرشتہ کے متبعین ۴۱۵ھ۔

حملے کی تفصیل ابن اثیر کی زبانی

چونکہ اس حملہ کا قدیم ترین بیان ابن اثیر ہی کا ہے اور مورخین مابعد نے زیادہ تر اسی سے استفادہ کیا ہے اس لئے ہم بھی اس سے اخذ کر کے مختصر واقعات اس کے بیان کرتے ہیں:۔

"سومناتھ کا بت ہندوستان کے تمام بتوں سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا تھا۔ یوں تو وہاں ہمیشہ ہجوم رہتا تھا لیکن چاند گرہن کے وقت وہاں زائرین کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جاتی تھی۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ روحیں جسم سے جدا ہونے کے بعد یہیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور سمندر کا مد و جزر بھی گویا اسکی پرستش ہے جو وہ سومناتھ کے مقدس دیوتا کے حضور میں پیش کیا کرتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے قیمتی تحایف آتے اور مندر کے خدام ان کو کام میں لاتے۔ علاوہ اس کے دس ہزار گاؤں بھی اس مندر کے مصارف کے لئے وقف تھے اور بے شمار زر و جواہر اس مندر کے اندر پایا جاتا تھا۔ ہر چند دریائے گنگ کا فاصلہ یہاں سے ۲۰۰ فرسنگ تھا لیکن روزانہ وہاں سے پانی لا کر بت پر چڑھایا جاتا تھا اور ایک ہزار برہمن ہر وقت پوجا میں مصروف رہتے تھے۔ علاوہ ان کے تین سو آدمی صرف اس لئے مقرر تھے کہ جاتریوں کے سر و ریش مونڈا کریں اور ساڑھے تین سو ماہرین موسیقی مندر کے دروازہ پر نغمہ و رقص میں مصروف رہا کرتے تھے۔

جب محمود ہندوستان کے دوسرے مندروں کو مسمار کر رہا تھا تو یہاں کے ہندو کہا کرتے تھے کہ سومناتھ ان بتوں سے ناراض ہے ورنہ کس کی مجال تھی کہ انھیں تباہ کرتا۔ جب محمود کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے سومناتھ پر حملہ کرنا ضروری قرار دے لیا۔ اس خیال سے کہ جب میں اس کو مسمار کر دوں گا تو پھر ہندوؤں کا یہ خیال دور ہو جائے گا اور وہ مسلمان ہو جائیں گے۔

شعبان ۴۱۶ھ کی دسویں تاریخ تھی کہ محمود تیس ہزار سواروں کے ساتھ (علاوہ والنٹیروں کے) غزنی سے ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ اور وسط رمضان میں وہاں پہونچ گیا۔ چونکہ ملتان کے آگے راستہ صحرائی اور بے آب وگیاہ تھا اس لئے اُس نے تین ہزار اونٹوں پر سامان رسد انبار کیا اور نہلواڑہ کی طرف چلدیا"

جب وہ صحرا طے کر چکا تو اس نے ایک قلعہ دیکھا جو آدمیوں سے بھرا ہوا تھا اور وہاں کنوئیں بھی کثرت سے تھے۔ محمود نے اس قلعہ کو فتح کیا اور آیندہ سفر کے لئے پانی فراہم کر کے انھلواڑہ کی طرف کوچ کیا جہاں وہ شروع ذیقعدہ میں پہونچ گیا۔

انھلواڑہ کا سردار بھیم، محمود کے حملہ کی خبر سنتے ہی شہر سے بھاگ گیا اور کسی قلعہ میں جا کر جنگ کی طیاری میں مصروف ہو گیا۔

محمود آگے بڑھا اور راستہ میں متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا دبلوارہ پہونچا جہاں سے سومناتھ دو دن کے سفر پر تھا۔

یہاں کے لوگوں نے اس اعتقاد کی بنا پر کہ سومناتھ ان کی مدد کرے گا، محمود کا مقابلہ کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ سومناتھ نے ان کی کوئی مدد نہ کی اور محمود نے ان کو بھی تہ تیغ کر کے سومناتھ کا راستہ صاف کر لیا۔

وسط ذیقعدہ میں جمعرات کے دن وہ سومناتھ پہونچا۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ سمندر کے ساحل پر بنا ہوا تھا اور ساری آبادی محمود کی اس حماقت پر ہنس رہی تھی۔ کیونکہ ان کے پندار میں سومناتھ کے ساتھ اس گستاخی کی سزا میں تمام مسلمانوں کا تباہ ہو جانا بالکل یقینی تھا۔ دوسرے دن جمعہ کو جب حملہ شروع ہوا تو ہندو سپاہیوں نے قلعہ کی دیوار سے اپنے اپنے مقامات چھوڑ دئے اور اس طرح مسلمانوں کو زینہ لگا کر دیواروں پر چڑھ جانے کا موقع مل گیا۔

محمود نے اندر داخل ہوتے ہی قتل عام کا حکم دیا اور باوصف اس کے کہ سومناتھ کے پوجاری اپنی کامیابی کے لئے سر بسجود تھے ان کی دعا قبول نہ ہوئی اور سومناتھ فتح ہو گیا دوسرے دن ہندوؤں نے پھر کچھ مقابلہ کیا لیکن بیکار اور آخر کار محمود نے اس مندر کو توڑ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ مندر لکڑی کے ۵۶ ستونوں پر قایم تھا اور بت کے قریب سونے کی زنجیر دو من وزن کی آویزاں تھی۔ رات کا کچھ حصہ گزرنے پر یہ زنجیر ہلائی جاتی تھی تاکہ گھنٹے بجیں اور پوجاری برہمن حاضر ہو جائیں اس مندر کا خزانہ بھی بیں

قریب تھا جس میں بہت سے سونے چاندی کے بُت رکھے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر جواہر کار مرصع نقاب پڑے ہوئے تھے۔

اس حملہ میں پچاس ہزار ہندو مارے گئے اور بیس لاکھ دینار کی قیمت کا مال محمود کے ہاتھ آیا۔"

تاریخ الفی کا بیان

تاریخ الفی میں بھی کم و بیش یہی تفصیل بیان کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ:-

"جب محمود بُت توڑنے کے لئے آمادہ ہوا تو پجاریوں نے عرض کیا کہ اگر بُت نہ توڑا گیا تو وہ کروروں اشرفیاں پیش کریں گے لیکن محمود نے کہا کہ میں بُت شکن ہوں بُت فروش بننا پسند نہیں کرتا۔ اور اس کے بعد جب اسنے بُت توڑا تو اس کے اندر جس قدر خزانہ اس کو ملا وہ برہمنوں کے وعدہ سے بہت زیادہ تھا۔

حملۂ سومناتھ سے فارغ ہونیکے بعد محمود راجہ بھیم حاکم نہروارہ کو مغلوب کرنے کے لئے روانہ ہوا جو کندمہ[1] میں پناہ گزیں تھا جب محمود قلعہ کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ اس کے چاروں طرف پانی کثرت سے بہ رہا ہے اس نے چند غوطہ لگانے والوں کو متعین کیا کہ اس کی گہرائی معلوم کریں ایک جگہ وہ پایاب تھا لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر عبور کرتے وقت مد آگیا تو ساری سپاہ غرق ہو جائے گی۔ محمود نے کچھ پرواہ نہیں کی اور اللہ کا نام لیکر اپنا گھوڑا پانی میں ڈالدیا۔ یہ دیکھکر حاکم قلعہ بھاگ گیا اور بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔"

طبقات اکبری کا بیان

ملا نظام الدین احمد نے لکھا ہے کہ:-

"جب محمود نے سومناتھ سے واپسی کا ارادہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ہندوستان کا بڑا راجہ پرم دیو اس سے مقابلہ کرنے کے لئے طیاریاں کر رہا ہے لیکن محمود نے اس وقت اس سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور براہ سندھ ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں اُسے بہت تکلیف ہوئی اور سپاہ کا ایک حصہ پانی اور رسد دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ واپسی میں محمود نے زیادہ مغرب کی طرف ہٹا ہوا راستہ اختیار کیا جسکی تصدیق جامع الحکایات اور منہاج السراج جُرجانی سے بھی ہوتی ہے۔

طبقات ناصری کا بیان

صاحب طبقات ناصری نے اس دشواری اور تکلیف کا ذکر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:-

"محمود نے جب سندھ اور منصورہ ہوتے ہوئے سومناتھ سے واپسی کا ارادہ کیا تو اس نے رہنما تلاش کیا، چنانچہ ایک ہندو راضی ہوا اور ساتھ ساتھ ہو لیا۔ ایک رات[2] چلنے کے بعد جب قیام ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں کہیں

---

[1] فرشتہ نے گندبہ لکھا ہے اور بعض نسخوں میں کھدابہ اور کھدآوا تحریر ہے۔ ابن اثیر نے کندہت لکھا ہے اس سے مراد غالباً کھندوار ہے جو کاٹھیاواڑ میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ [2] جامع الحکایات میں تین دن لکھے ہیں۔

پانی نہیں ہے۔ محمود نے رہنما کو بلا کر دریافت کیا کہ پانی کہاں ہے، اس نے جواب دیا کہ پانی کہاں میں تو سومناتھ کا پجاری ہوں اور میں نے انتقام لینے کے لئے تمھاری ساری فوج کو قصداً اس مصیبت میں مبتلا کیا ہے۔ محمود نے یہ سنکر اسے قتل کرا دیا اور سربسجود ہو کر خدا سے مدد طلب کی چنانچہ تھوڑی رات گزری تھی کہ شمال کی جانب روشنی نظر آئی۔ محمود نے اسی وقت کوچ کر دیا اور صبح کو جس جگہ وہ پہونچا وہاں پانی موجود تھا"

روضۃ الصفا کا بیان

صاحب روضتہ الصفا نے بیان کیا ہے کہ:۔

"جب محمود سومناتھ کی مہم سے فارغ ہو گیا تو اس نے وہاں چند سال قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وزراء نے خراسان کے قرب سے علٰحدہ رہنے کا مشورہ نہیں دیا۔ اور مجبوراً اسے غزنی واپس جانا پڑا لیکن واپسی کے وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ یہاں کس کو حاکم مقرر کیا جائے آخرکار سب کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ یہاں کا حاکم اسی نواح کا رہنے والا ہونا چاہئے۔ چنانچہ داشلم خاندان میں جو قدیم شاہی خاندانوں میں سب سے زیادہ معزز خاندان تسلیم کیا جاتا تھا جستجو کی گئی اس میں صرف ایک فرد باقی رہ گیا تھا جو برہمنوں کی طرح مرتاض زندگی بسر کرتا تھا۔ محمود نے اس کو یہاں کا حاکم مقرر کیا اور غزنی واپس گیا"

لفظ سومناتھ کی تشریح

لفظ سومناتھ کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ لفظ مرکب ہے سوم اور ناتھ سے سوم ایک بادشاہ کا نام تھا جس نے یہ بت نصب کیا اور اس کا نام ناتھ رکھا۔ کثرت استعمال سے بعلبک کی طرح یہ دونوں لفظ ملکر ایک ہو گئے۔ ہندی میں ناتھ کے معنی "بزرگ" کے ہیں۔

ڈاکٹر برڈ نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے۔ یہ سنسکرت کے لفظ سومبھوناتھ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "قایم بالذات دیوتا" اور دوسری جگہ بیان کیا ہے کہ یہ سوم اور ناتھ سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں "چاند کے دیوتا" اور مہادیو کے مختلف ناموں میں سے ایک نام یہ بھی تھا جس کی پرستش کی جاتی تھی۔

البیرونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سومناتھ میں کوئی بت نصب نہ تھا صرف اس بت کا استھان تھا۔

مسٹر ولسن نے بھی اس سے انکار کیا ہے اور وہ اس کا قایل نہیں ہے کہ محمود نے وہاں کوئی بت توڑا کیونکہ قدیم مسلمان مورخین نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے علاوہ اس کے فرشتہ کا یہ بیان کہ بت کے اندر سے جواہرات نکلے درست نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر وہاں کوئی بت تھا بھی تو وہ بالکل ٹھوس تھا جس کے اندر کوئی چیز نہ رکھی جاسکتی تھی۔

ستر ھواں حملہ جاٹوں کے خلاف

سترھواں حملہ۔ ۴۱۸ھ میں جود کے جاٹوں پر کیا گیا۔ نظام الدین احمد نے اس حملہ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ:۔

"۴۱۸ھ میں ان جاٹوں کے شکست دینے کے لئے جنھوں نے سومناتھ سے واپس آتے ہوئے اس کی فوج کو پریشان کیا تھا محمود ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پہونچکر اس نے حکم دیا کہ چودہ سو کشتیاں طیار کی جائیں اور

ہر کشتی میں تین آہنی شاخیں (دو پہلو میں اور ایک سامنے) نصب کی جائیں تاکہ ان کے صدمہ سے دشمن کی کشتیاں غرق ہو جائیں، ہر کشتی میں بہت سے تیر انداز اور قارورہ باز بٹھائے۔ الغرض اس شان سے محمود نے جاٹوں کا مقابلہ کیا جو اپنی عورتوں اور بچوں کو جزائر میں بھیجکر لڑنے کے لئے آمادہ ہو کر آئے تھے۔ بعض کا بیان ہے کہ ان کے پاس چار ہزار اور بعض کا خیال ہے کہ آٹھ ہزار کشتیاں تھیں جب دونوں طرف کے بیڑے ایک دوسرے سے متصادم ہوئے تو سخت جنگ شروع ہوئی لیکن شاخوں کے صدمہ سے جاٹوں کی کشتیاں کثرت سے تباہ ہوئیں اور بہت سی غرق ہوئے اس کے بعد محمود وہاں پہونچا جہاں جاٹوں کے خاندان پناہ گزیں تھے، اور ان کو مقید کر لیا اس کے بعد وہ غزنی واپس گیا۔"

اس حملہ کا ذکر بھی صرف متاخرین نے کیا ہے اور ہر چند اس کے بعض واقعات مستبعد معلوم ہوتے ہیں لیکن نفس حملہ جاٹوں پر بالکل قرین قیاس ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ سلطنت لاہور تباہ ہونے کے بعد جاٹوں نے قوت حاصل کر لی ہو اور وہ اپنے جوار کے لوگوں کو ستاتے ہوں۔ اُن کا اپنے ملک سے چلکر اتنی کثیر کشتیاں فراہم کرنا، اور بڑی قوت سے مقابلہ کرنا کافی شہادت اس امر کی ہے کہ ان کی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ ــــ ابن اثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے منصورہ پر حملہ کر کے وہاں کے مسلمان امیر کو سخت پریشان کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کونسا کوہستانی علاقہ مراد ہے لیکن غالباً اس سے مقصود وہ کوہستانِ نمک ہوگا جو ملتان سے ملا ہوا ہے۔ اب جاٹ اور زیادہ شمال مشرق کی طرف ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ان کی بعض جماعتیں اب بھی اپنا اصلی وطن اسی سلسلۂ کوہستان کو ظاہر کرتی ہیں۔ البتہ سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ محمود اور جاٹوں نے کیونکر اسقدر سرعت کے ساتھ اتنا بڑا بیڑہ طیار کر لیا اور اس نے کیوں خشکی کی لڑائی کو چھوڑ کر دریا کی جنگ کو ترجیح دی۔ اگر محمود ایسا کر سکتا تھا تو حملہ سومناتھ میں کیوں ایسا نہ کیا اور وہاں سے واپس ہوتے ہوئے کیوں نہ اس نے دریائے سندھ سے اسی طرح فائدہ اُٹھایا؟ اگر یہ جواب دیا جائے کہ محمود نے ایسا صرف اس لئے کیا کہ وہ ہندوستان کی بارش اور گرمی سے قبل غزنی واپس جائے تو بھی درست نہیں ہو سکتا کیونکہ حملہ ۴۱۸ھ = ۲۲ فروری ۱۰۲۶ء کو شروع ہوا اور اس کے پاس کافی وقت تھا کہ وہ غزنی واپس آجاتا اور پھر افغانستان کی سردی شروع ہونے سے قبل ملتان چلا آتا۔

یہ اعتراض ہے مغربی مورخین کا جس میں انھوں نے صرف قیاس سے کام لیا ہے اگر وہ غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ محمود اس حملہ میں دریائی جنگ پر مجبور تھا اور خشکی میں کبھی وہ جاٹوں کا استیصال نہ کر سکتا تھا چونکہ جاٹوں کا مامن ایسی جگہ تھا جہاں چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اس لئے ان تک پہونچنے یا انھیں جنگ میں مبتلا کرنے کے لئے خشکی بالکل بیکار ثابت ہوتی۔ رہا یہ امر کہ محمود کیونکر اس قدر جلد اتنی کثیر تعداد میں کشتیاں طیار کر سکا۔ سو اس کے محال ہونے کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔

باب ششم

غزنوی عہد پر تبصرہ

جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن سے پوشیدہ نہیں کہ محمودؔ کے زمانہ میں غزنی (اس کے پایۂ تخت) کا کیا عالم تھا! اسوقت غزنی، علوم و فنون کا مخزن بنا ہوا تھا اور ہر چار طرف سے علماء و فضلا اُمنڈے چلے آرہے تھے۔ مصنف تاریخ گزیدہ[1] کا بیان ہے کہ ہر سال چار لاکھ دینار وہ شعراء اور علماء پر صرف کیا کرتا تھا پھر اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ متعدد مدارس بھی جاری کئے اور (حسب بیان فرشتہ[2]) غزنی کی اس مشہور مسجد کے جوار میں جو سنگ مرمر اور سنگ رخام کی حسین ساخت اور بے مثل آرائش کی وجہ سے "عروسِ فلک" کہی جاتی تھی، ایک

---

[1] تاریخ گزیدہ، ۷۳۰ھ (۱۳۲۹ء) میں مرتب ہوئی اس کا مؤلف حمد اللہ بن ابوبکر بن حمد بن نصر ستوفی قزوینی تھا۔ حمد اللہ، رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین (وزیر) کا سکریٹری تھا اور اسی کے نام یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔

تاریخ گزیدہ، مشرق کی بہترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یورپ کے مشہور مصنف و مورخ ہمیر پرگشتال (Hammer-Purgstal) نے اس تاریخ کو اس عہد کی بہترین تصنیف قرار دیا ہے۔

جب حمد اللہ اس تاریخ کو مرتب کر چکا تو اسکے گیارہ سال بعد اس نے جغرافیہ اور تاریخ طبعی میں ایک بے مثل کتاب نزہت القلوب لکھی۔

تاریخ گزیدہ کے خاص خاص ماخذ حسب ذیل ہیں۔ تاریخ طبری۔ تاریخ کامل ابن اثیر، نظام التواریخ بیضاوی، زبدۃ التواریخ جمال الدین کاشی۔ جہاں کشا جوینی —

[2] تاریخ فرشتہ عام طور سے ہندوستان کی بہترین تاریخ تسلیم کی جاتی ہے اس کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ (فرشتہ) بمقام استرآباد ۱۵۷۰ء میں اور بعض مورخین کی تحقیق سے ۱۵۵۰ء میں پیدا ہوا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۹ پر ملاحظہ ہو)

یونیورسٹی قایم کی اور اسی کے ساتھ اس نے مختلف زبانوں کی کتابوں کا بے نظیر اور بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور ایک عجائب خانہ بھی تعمیر کرایا جس میں بہت سے نوادر[1] پائے جاتے تھے۔

محمود نے اس یونیورسٹی کی تکمیل میں جس قدر روپیہ صرف کیا وہ اُس مستقل امداد سے علاحدہ تھا، جو اُس نے دیہات کی صورت میں یونیورسٹی کے سالانہ مصارف اور طلبار و مدرسین کے وظایف و مشاہرہ کے لئے وقف کر دئے تھے[2]۔

اس یونیورسٹی کے قیام اور محمود کی عام علم پروری کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے دنوں میں شعراء، ادبا، اور حکماء مختلف

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۸)

اس کے باپ (غلام علی ہندو شاہ) نے ہندوستان کا سفر اس وقت اختیار کیا جب کہ اس کا بیٹا محمد قاسم بہت کم سن تھا، وہ مرتضےٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر (دکن) پہونچا اور میران حسین ولی عہد کی تعلیم کے لئے مامور ہوا۔ اتفاق سے غلام علی ہندو شاہ جلد مر گیا۔ اور محمد قاسم یتیم ہو گیا۔ لیکن چونکہ غلام علی کا اقتدار دربارِ دکن میں بہت قایم ہو چکا تھا اس لئے وہی عنایات محمد قاسم پر بھی مبذول ہوئیں اور رفتہ رفتہ یہ بادشاہ کا مشیر خاص ہو گیا۔ جب شہزادہ میران حسین نے اپنے باپ مرتضےٰ نظام شاہ کو تخت سے علاحدہ کیا، اُس وقت محمد قاسم کی عمر ۱۶، ۱۷ سال کی تھی۔

ایک سال بعد جب میران حسین قتل کیا گیا تو محمد قاسم ۱۵۸۹ء میں بیجاپور چلا گیا۔ یہاں دلاور خاں وزیر نے ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں جو اسوقت وہاں کا حکمراں تھا اُسے پیش کیا لیکن کوئی خاص عزت اس کی نہیں کی گئی۔ جب دلاور خاں معزول ہو کر بھاگ گیا اور ۱۵۹۳ء میں عنایت خاں شیرازی وزیر ہوا تو اس نے پھر محمد قاسم کو پیش کیا اور ابراہیم عادل شاہ نے نہایت عزت سے اس کی پذیرائی کر کے تاریخ دکن لکھنے کی ہدایت کی جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۶۰۶ء میں اس نے یہ تاریخ مکمل کر کے عادل شاہ کے سامنے پیش کی لیکن اسکے بعد بھی وہ ہمیشہ اس کی صحت و ترمیم، حذف و اضافہ میں لگا رہا۔

برگس Briggs کا خیال ہے کہ ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ جب کہ اس کی عمر صرف ۴۱ سال کی تھی لیکن ایم جے مہل (J. M. Mohl) کی تحقیق یہ ہے کہ اس نے ۱۶۲۳ء تک اپنی تاریخ میں واقعات کا اضافہ کیا ہے اسلئے وفات کے وقت اس کی عمر ۵۰ سال سے کم نہ تھی۔

چونکہ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں یہ تاریخ مرتب ہوئی تھی اس لئے مصنف نے اس کا نام گلشن ابراہیمی یا تاریخ ابراہیمی رکھا اور بعد کو جب ابراہیم نے نیا پایۂ تخت نورس تعمیر کرایا تو اس کی یادگار میں دوسرا نام نورس نامہ بھی قرار پایا۔

یہ تاریخ دکن کی بہترین تاریخ ہے لیکن چونکہ اس کا مصنف شیعی مذہب رکھتا تھا اس لئے عصبیت کی جھلک کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔

[1] انھیں نوادر میں سے ایک طائر تھا قمری کی صورت کا۔ جب مجلس میں زہر آلود کھانا اس کے سامنے لایا جاتا تو وہ مضطرب ہو جاتا اور آنسو اسکی آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ ایک پتھر کا ٹکڑا بھی تھا جو مومیائی کا اثر رکھتا تھا کیسا ہی زخم ہو اس کے گھس کر لگانے سے فوراً اچھا ہو جاتا تھا۔

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲ (نولکشور)

حصص زمین سے کھنچکر آنے لگے اور غزنی جو اپنی بے نظیر عمارات و محلات و باغات اور بے شمار چشموں، حوضوں اور فواروں کی وجہ سے عروس البلاد بنا ہوا تھا، علم و حکمت کا مرکز بھی قرار پایا اور اس طرح حُسن صورت و سیرت کا امتزاج تکمیل کے ساتھ وہاں نظر آنے لگا۔ اُن مشاہیر میں سے جو محمود کی نگاہوں میں خاص عزت رکھتے تھے، ایک شخص عتبی تھا جس نے اولادِ سبکتگین کے حالات میں تاریخ یمینی[1] لکھی ہے۔ دوسرا غضائری رازی دیوان کا رہنے والا تھا۔ ایک بار اس نے ایک مختصر سا قصیدہ محمود کے سامنے پیش کیا اور چودہ ہزار درہم انعام میں حاصل کئے۔ تیسرا اسدی طوسی باشندۂ خراسان تھا۔ یہ بھی نہایت مشہور شاعر تھا اور محمود نے اُسے بارہا تصنیف شاہنامہ پر مجبور کیا، لیکن وہ ہمیشہ اپنی ضعیفی کا عذر پیش کر دیا کرتا تھا۔ اسی طرح منوچہر جو بلخ کا رئیس اور اپنی شاعری و ذہانت کی وجہ سے بہت مشہور تھا دربار محمود کا ایک جوہر تابندہ تھا۔

عنصری جو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، حکیم، زباندان اور فیلسوف تھا غزنی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا اور کوئی نظم محمود کے سامنے پیش نہ ہو سکتی تھی، جب تک عنصری اس کو نہ دیکھ لیتا۔

انھیں شعراء کے زمرہ میں فردوسی بھی تھا جسے محمود نے شاہنامہ لکھنے پر مامور کیا۔ سامانی فرمانروا دقیقی سے جو امیر نوح سامانی کا معاصر تھا، شاہنامہ کا سنگ بنیاد پہلے ہی رکھوا چکا تھا اور وہ تین ہزار شعر بھی لکھ چکا تھا[2] لیکن اس کی ناوقت موت سے یہ کام پورا نہ ہو سکا اور آخر کار محمود کے عہد میں قرعۂ فال فردوسی کے نام نکلا۔

محمود کی علم پروری اور ذوقِ ادب کے ثبوت میں جہاں اور بہت سی مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہیں ایک نمایاں مثال وہ بھی ہے جو صاحب طبقات اکبری[3] نے بیان کی ہے۔

---

[1] تاریخ یمینی کے مصنف کا نام ابوالنصر محمد ابن محمد الجبار العتبی تھا۔ یہ اس خاندان عتبہ سے تعلق رکھتا تھا جو سامانی بادشاہوں کے عہد میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا ابوالنصر عتبی سلطان محمود کا سکریٹری تھا۔ تاریخ یمینی میں اس نے ناصرالدین سبکتگین کے پورے حالات اور محمود کے حالات سنہ ۴۱۱ھ ۱۰۲۰ء تک درج کئے ہیں۔

تاریخ یمینی ادب کے لحاظ سے بھی عربی کی شکل کتاب خیال کی جاتی ہے اور فارسی میں بھی اس کے متعدد ترجمے کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں سب سے قدیم ترجمہ ابوالشرف کا ہے جو سنہ ۶۰۲ھ میں کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ اب نایاب ہے البتہ اس کو انگریزی ملبوس میں ریورینڈ جے رینالڈس Rev. J. Renolds نے ۱۸۵۸ء میں شایع کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ محمد کرامت علی دہلوی کا ہے جو مختلف کتب خانوں میں نظر آجاتا ہے۔ تاریخ یمینی کی شرحیں اور فرہنگیں بھی متعدد لکھی گئی ہیں جن میں سے اب صرف ایک آدھ کہیں نظر آجاتی ہے۔

[2] تاریخ گزیدہ صفحہ ۸۱۸

[3] طبقات اکبری کا صحیح نام طبقات اکبر شاہی اور اسم مصنف کی رعایت سے تاریخ نظامی بھی کہتے ہیں۔ یہ تصنیف ہندوستان کی مشہور ترین تاریخوں میں سے ہے اور غالباً سب سے پہلی تاریخ یہی ہے جس میں جدید اصول پر صرف ہندوستان کے حالات سے بحث کی گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ کیجئے)

جب ۴۱۳ھ ۱۰۲۲ء میں محمود نے گوالیار کا محاصرہ کرکے وہاں کے راجہ کو مطیع کر لیا تو کالنجر[1] کی طرف بڑھا جو اُسوقت اپنی مضبوطی کے لحاظ سے ایک بے مثل قلعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ جب یہاں کے راجہ نندا نے دیکھا کہ وہ محمود کے محاصرہ کی تاب نہیں لاسکتا، تو اُس نے تین سو ہاتھی پیش کرتے ہوئے صلح کی درخواست کی۔ چونکہ ان ہاتھیوں پر کوئی مہاوت نہ تھا، اسلئے محمود نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انھیں پکڑ کر سوار ہو جائیں۔ نندا یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور محمود کی تعریف میں ایک شعر یا چند اشعار ہندی زبان میں پیش کئے محمود نے اس کو پڑھوا کر سُنا اور سمجھا۔ یہ اشعار اپنے معانی کے لحاظ سے اسقدر بے مثل تھے کہ محمود اپنے صحیح مقصود کو بھی بھول گیا اور اس نے بے اختیار ہو کر نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت تفویض کرکے (جن میں کالنجر بھی شامل تھا) اور بھی تحایف و ہدایا دئے جانے کا حکم دیا۔ فرشتہ نے بھی اسکو انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے[2]۔ اس سے ثابت ہے کہ محمود اپنی فطرت کے لحاظ سے کیسا ہنر شناس تھا اور اپنے ذوقِ علم کے ماتحت بسا اوقات اپنے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۱)

تمام بعد کے مورخین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ یہاں تک کہ ملا عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ تو اپنی تصنیف کو صرف طبقات اکبری ہی کا خلاصہ ظاہر کرتا ہے اور ۱۰۰۲ھ تک کے تمام واقعات اس سے اخذ کرتا ہے۔

صاحب مآثر الامرا نے بھی اس تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد قاسم فرشتہ نے بھی اس سے بہت مدد لی ہے البتہ ابوالفضل کے اکبر نامہ سے کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اکبر نامہ زیادہ صحیح ہو سکتا ہے یا طبقات اکبری یوروپین مصنفین بھی اس تاریخ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس کا مصنف خواجہ نظام الدین احمد خواجہ مقیم ہروی کا بیٹا تھا۔ یہ خواجہ مقیم وہی ہے جو بابر کا ندیم و مصاحب تھا اور بعد کو اس کے خانگی انتظام کا مہتمم ہو گیا تھا۔ بابر نے اپنی تصنیف تزک بابری میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بابر کی وفات پر جب ہمایوں نے گجرات فتح کرکے صوبہ احمد آباد مرزا عسکری کے سپرد کی تو ساتھ ہی ساتھ خواجہ مقیم کو مرزا عسکری کا وزیر بھی مقرر کیا۔ جب ہمایوں کو چونسہ کے مقام پر شیر شاہ نے شکست دی اور وہ آگرہ کی طرف بھاگا تو مقیم خاں ساتھ ساتھ تھا۔

خواجہ نظام الدین اسی مقیم خاں کا بیٹا تھا اور عہد اکبری کے ممتاز ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ صوبہ گجرات میں وہ بخشی گری کے عہدہ پر متمکن تھا۔ اس نے مختلف جنگوں میں نمایاں حصہ بھی لیا۔

جب ۳۴ سال جلوس (۹۹۸ھ) میں حکومت گجرات خان اعظم صوبہ دار مالوہ کے سپرد کی گئی تو خواجہ نظام الدین کو اکبر نے اپنے حضور میں طلب کیا۔ وقت بہت کم تھا اور تاریخ سالگرہ قریب تھی اس لئے خواجہ نے ۶۰۰ کوس کا سفر بارہ دن میں طے کیا اور عین تاریخ جلوس پر پہونچ گیا۔ اکبر نے اسکی بہت عزت کی۔ ۳۹ سال (۱۰۰۳ھ) میں جبکہ بادشاہ باہر شکار میں مصروف تھا خواجہ تپ میں مبتلا ہوا اور لاہور پہونچتے پہونچتے ساحل راوی پر انتقال کیا۔ بعد کو جہانگیر کے عہد میں خواجہ کی بعض اولاد نے کافی ترقیاں کیں۔

[1] اب یہ ایک گاؤں ہے ضلع باندہ کا۔ یہاں اب تک قلعہ شکستہ حالت میں موجود ہے۔

[2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۳۔

خیالِ ملک گیری کو بھی ترک کر دیتا تھا۔

صاحب نگارستان[1] نے احمد حسن میمندی کی ذہانت کے متعلق جو محمود کے عنفوان شباب کا ساتھی اور اُسکا نہایت معتمد علیہ خادم تھا جو واقعات درج کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس ذہن و دماغ کے لوگوں کی صحبت پسند کرتا تھا۔

عضایری رازی اپنے وطن ہی سے قصیدہ لکھ کر محمود کے دربار میں بھیجا کرتا تھا اور ہر قصیدہ کے عوض میں مقررہ انعام ایک ہزار اشرفیوں کا اُسے ملجاتا تھا۔ ایک بار وہ دربار میں خود آیا اور ایک رباعی پیش کی تو اشرفیوں کے دو توڑے اور زاید دئے گئے چنانچہ وہ خود کہتا ہے:۔

بلے دو بدرۂ دینار یافتم بہ تمام　　حلال و پاک تر از شیر دایۂ اطفال[2]،

بعض مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ محمود خود بھی شاعر تھا اور اس کے ثبوت میں حسب ذیل قطعہ پیش کرتے ہیں:۔

بزخم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے　　جہان مسخر من شد چو تن مسخر رائے
بسے بلاد گرفتم بیک اشارتِ دست　　بسے قلاع گرفتم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نبود　　بقا، بقائے خداوند و ملک، ملکِ خدائے

لیکن صاحب تاریخ گزیدہ نے سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف ان اشعار کو منسوب کیا ہے[3]۔

نپولین اعظم کی ممتاز ترین صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس نے جن جن ممالک کو مغلوب کیا وہاں کے بہترین صناعات اپنے ملک میں لایا اور اس طرح پیرس کی آرایش میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھا۔ لیکن محمود نے اپنے پایۂ تخت غزنین کی ترقی میں نپولین سے زیادہ کام کیا، کیونکہ وہ مفتوحہ ممالک کی صناعات کے ساتھ ہی خود وہاں کے صناع، شعراء، علماء اور فضلاء کو بھی غزنین لے آیا اور اپنے دربار کو ان تابندہ جواہرات سے جگمگا دیا۔

ماوراء النہر کے سواحل بحرِ خضر، ایران، خراسان میں کوئی ایسا مقام نہ تھا جس نے اپنے بہترین فرزندوں کو

---

[1] نگارستان ایک مجموعہ ہے مختلف حکمران خاندانوں کے متعلق مختلف قصص و حکایات کا۔ اس کا مصنف احمد بن محمد بن عبدالغفور الغفاری القزوینی تھا جو عام طور سے قاضی احمد الغفاری کے نام سے مشہور ہے۔ نگارستان اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء میں لکھی گئی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس نے ۲۸ معتبر کتب تاریخ سے مواد فراہم کیا ہے۔

[2] شعر العجم جلد ۴ - صفحہ ۱۵۔

[3] تاریخ گزیدہ صفحہ ۴۵۷۔

محمود کی خدمت کے لئے پیش نہ کر دیا ہو۔

سامانی خاندان، جو علم و ادب کا بڑا قدرشناس تھا تباہ ہو چکا تھا اور اب علماء و شعراء وغیرہ کے لئے غزنین سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی جہاں سلطان محمود اہلِ کمال کی قدردانی کے لئے کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

محمود پر طمع و بخل کا الزام غلط ہے

محمود پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ طامع تھا، بخیل و خسیس تھا لیکن کیا وہ شخص جو چار لاکھ اشرفی سالانہ مستقلاً شعراء و علماء پر صرف کرے، جو دارالعلوم اور اُس کے مصارف کے لئے ایک زبردست جایداد وقف کر دے، جو طلبہ اور شائقین علم کی ہمت افزائی میں ہمیشہ اپنے خزانہ کا منھ کھلا رکھے، جو حوضوں اور فواروں، پلوں، محلوں، مسجدوں، خانقاہوں کی تعمیر میں دولت خطیر صرف کرنے سے گریز نہ کرے، جو ایک ایک شعر پر تین تین بار ایک شاعر کا منھ جواہرات سے بھر دے، جو ایک معمولی سی اور وہ بھی غیر زبان کی نظم پر اپنی فتوحات سے فایدہ نہ اُٹھا کر ایک غیر مذہب والے مفتوح شخص کو پندرہ پندرہ قلعے تفویض کر دے، جس کا دربار دُنیا کے حکماء اور علماء کا مخزن رہا ہو، کیا اس کی نسبت کوئی دانشمند شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ طامع و بخیل تھا؟

محمود کی تربیت

محمود کو تمام مورخین نے متفقہ طور سے سلیم الطبع، شجاع، مستقل مزاج، حلیم و بردبار اور علم دوست تسلیم کیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک سبب تو خود اس کی فطری صلاحیت تھی جو قدرت نے اس میں ودیعت کی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کا باپ سبکتگین خود بے مثل صفات کا فرمانروا تھا اور اس نے محمود کی تربیت میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہ رکھا تھا۔ محمود نے اپنی کم سنی میں ایک باغ نہایت محنت سے طیار کرایا اور اس کے وسط میں ایک عالی شان عمارت بھی قایم کرائی جس میں اپنے باپ اور ملک کے امراء نامدار کو بھی دعوت دی۔ جب سبکتگین آیا تو اُس نے محمود سے کہا کہ "اے جانِ پدر ایسے باغ اور محلات تو معمولی امیر بھی طیار کرا سکتا ہے میں تو تجھ سے ایسی عمارت کی توقع رکھتا ہوں جس کی نظیر کہیں نہ ملے"

محمود نے دریافت کیا کہ وہ عمارت کیسی ہے۔ سبکتگین نے جواب دیا کہ وہ "تعمیر ہے اہلِ فضل و کمال کے دلوں کی جو قایم رہنے والی ہے اور جس پر کسی نہال کا نصب کرنا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا ہے۔"[1] پھر جنھوں نے محمود کی سیرت کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ باپ کی نصیحت پر اس نے کس حد تک عمل کیا اور اس باب میں وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا۔ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جوان ہو کر محمود نے سارے عالم کو اپنی شہرت سے معمور کر دیا۔

محمود کی مجتہدانہ فطرت

محمود حقیقتاً ایک مجتہدانہ فطرت رکھتا تھا اور سخت سے سخت وقت میں بھی وہ عزم و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا، چنانچہ صاحب جامع الحکایات[2] راوی ہے کہ جب محمود سومنات سے واپس آنے لگا، تو دو ہندو آئے اور

---

[1] فرشتہ بحوالہ آثر الملوک جلد اول صفحہ ۲۱ (نولکشور)

[2] اس کتاب کا پورا نام "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" ہے۔ اس کا مصنف مولانا نورالدین محمد عوفی تھا جو شمس الدین التمش کے عہد میں پایا جاتا تھا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۴ پر ملاحظہ ہو)

اُنھوں نے رہبری کی خدمات پیش کیں، چونکہ محمود ہندوستان کی راہوں سے واقف نہ تھا اس لئے ان کو رہبر بننے کی اجازت دی گئی۔ تین دن کے بعد سارا لشکر ایک بے آب وگیاہ صحرا میں پہونچا۔ محمود نے رہبروں سے دریافت کیا کہ یہ کیسا راستہ ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ راستہ نہیں ہے بلکہ صحرا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے راجہ کے حکم سے یہاں پہونچا دیا ہے اور اپنے فرض کو اچھی طرح ادا کر دیا ہے۔ اب یہ صحرا تمھارے سامنے ہے اور افواجِ ہند تمھارے عقب میں اس لئے تمھارا جانبر ہونا محال ہے۔" محمود اس کو سُن کر ذرا مضطرب ہوا لیکن اتفاق سے اُسی وقت اُسے ایک مرغابی اُڑتی نظر آئی۔ محمود نے کہا کہ یقیناً یہاں کسی جگہ شیریں پانی ملنا چاہئے اور مرغابی کے پیچھے پیچھے اس نے گھوڑا ڈال دیا۔ بہت دور چلکر اُسے ایک بڑا دریا ملا جس کا پانی بہت شور تھا، لیکن یہاں پھر اُسے ایک مرغابی اُڑتی ہوئی ملی اور اس کے تعاقب سے وہ ایک گاؤں میں پہونچا جہاں شیریں پانی دستیاب ہوا۔ اب محمود کے سامنے بڑا مرحلہ اس دریا کو عبور کرنا تھا اور باوجود دریافت وتلاش کے کوئی حصہ دریا کا ایسا نہ ملتا تھا جو پایاب یا قابلِ عبور ہو۔ آکار محمود نے اپنے فطری عزم اور بے نظیر شجاعت سے کام لیکر گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور فوج کو حکم دیا کہ اُس کی تقلید کریں[1]۔

انتظامی معاملات میں محمود حد درجہ ذی فہم تھا اور کسی حال میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک بار کوئی دادخواہ حاضر ہوا اور کہا کہ خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محمود فوراً اُسے کونہ میں لے گیا اور حال دریافت کیا اُسنے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۳)

یہ کتاب نظام الملک محمد (ابو سعید جنیدی کے بیٹے) کے نام سے منسوب ہے جو التتمش کا وزیر تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اس نے بخارا میں تعلیم پائی تھی اور رکن الدین امام اس کے اُستاد تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخارا ہی کے قرب وجوار میں کہیں پیدا ہوا تھا۔ اس نے کھمبایت Cambay اور خوارزم کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سے ثابت ہے کہ وہ سیاحانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

اس نے نظام الملک جنیدی اور ناصر الدین قباچہ کی جنگ کا بھی ذکر کیا ہے اور ناصر الدین کے ساتھ قلعۂ بھکر میں اپنے قید ہونے کا بھی حال لکھا ہے۔ مصنف نے جامع الحکایات میں صرف ان تاریخی حکایتوں کو فراہم کیا ہے جن سے ملوک اسلام کے اخلاق وعادات وغیرہ پر روشنی پڑے۔ یقیناً اس میں ایسی حکایات بھی مندرج ہیں جو پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں۔ لیکن انھیں کے ساتھ ایسے قصص بھی پائے جاتے ہیں جن سے تاریخی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔

مصنف نے جن کتابوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔ تاریخ یمینی، تاریخ ناصری، تاریخ ملوک عجم تاریخ العباس، مجمع الامثال، عیون الاخبار، شرف النبی، فرج بعد الشدت، خلق الانسان، اخبار برامکہ وغیرہ۔

اس کے مصنف نے علاوہ اس کے ایک تذکرہ شعراء فارس، لباب الالباب کے نام سے بھی لکھا ہے جو مشہور کتاب ہے، اور مسٹر براؤن نے اس کا بہترین اڈیشن شایع کیا ہے ۔۔۔

[1] جامع الحکایات قسم اول - باب ۱۲ - حکایت ۱۶ -

کہا کہ "آپ کا بھانجہ روزرات کو میرے مکان میں آتا ہے اور مجھے گھر سے باہر نکال دیتا ہے میں نے آپ کے تمام اعیانِ دولت سے انصاف طلب کیا لیکن کسی نے میری فریاد کو نہیں سُنا۔ اس لئے اب مجبور ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ انصاف کرتے ہوں تو کیجئے، ورنہ میں معاملہ کو منصفِ حقیقی پر چھوڑ دوں۔" محمود یہ سُن کر آبدیدہ ہو گیا اور بولا کہ "آئندہ جس وقت وہ شخص تیرے گھر میں آئے مجھے فوراً مطلع کر۔" چنانچہ تیسرے روز وہ پھر آیا اور کہا کہ "اسوقت وہ شخص موجود ہے۔" محمود نے یہ سنتے ہی تلوار ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ ہو لیا جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ ایک مرد اور عورت پلنگ پر سو رہے ہیں فوراً چراغ گل کر کے تلوار سے مرد کا سر قطع کر دیا اور پھر روشن کر کے مقتول کا چہرہ دیکھا اور خدا کا شکر ادا کر کے پانی پینے کو مانگا اور پانی پی کر اپنے گھر واپس آیا۔ اس آدمی نے چراغ گل کرنے اور پانی پینے کا سبب دریافت کیا۔ محمود نے کہا کہ چراغ گل کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ کہیں اُس کی صورت دیکھ کر مجھے رحم نہ آجائے اور پانی پینے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں اس ظلم کا انسداد نہ کرلوں گا پانی نہ پیوں گا۔ چنانچہ تین دن کا پیاسا تھا اور اسی لئے زیادہ انتظار رفع تشنگی نہ کر سکا۔[1]

محمود کی انصاف پسندی

ایک بار محمود نے فرمانروائے کرمان کے پاس کچھ قیمتی تحائف روانہ کئے۔ راستہ میں قزاقوں نے سارا مال لوٹ لیا اور سفارت کے چند آدمی قتل بھی کر دئے۔ اس گروہ کے متعلق عرصہ سے شکایت پائی جاتی تھی اور بہت نقصان لوگوں کو پہونچ چکا تھا۔ سلطان براہ بست، غزنین سے خوارزم کی طرف جا رہا تھا کہ اُسے اس کی اطلاع ملی۔ جب محمود، بست میں پہونچا تو مسعود اُس کا بیٹا ہرات سے ملنے آیا لیکن محمود نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے کہا کہ میں کیونکر تمہاری صورت دیکھ سکتا ہوں جبکہ تمہارے جوار میں ظلم و بے امنی کا یہ حال ہے۔ میں اُسوقت تک تم سے نہیں مل سکتا جب تک اس کا انسداد نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسعود گیا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد اس گروہ کو گرفتار کر کے پیش کیا۔[2]

محمود کی انصاف پسندی

اسی طرح عراق کی اُس بڑھیا کا واقعہ نہایت مشہور ہے جس نے اپنا قافلہ لُٹ جانے کے بعد محمود کو تنبیہ کی تھی کہ وہ دور دراز مقامات کا انتظام نہیں کر سکتا تو کیوں اپنے ملک کو اس قدر وسیع کر لیا ہے۔

الغرض محمود کی یہی انصاف پسندی تھی جس نے فردوسی کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ:-

جہاندار محمود شاہِ بزرگ — بہ آبے خورانند ہمی میش و گرگ
چو کودک لب از شیر مادر بشست — بہ گہوارہ محمود گوید نخست

---

[1] فرشتہ۔ جلد اول صفحہ ۳۶۔ (نولکشور)

[2] جامع الحکایات ——— باب (۱۳) حکایت (۲۰۴)

محمود کی حقیقت پسندی [illegible]

محمود، معاملات کی حقیقت سمجھنے میں حد درجہ کوشش کرتا اور جب تک وہ خود انتہائی غور و تامل کے بعد مطمئن نہ ہو جاتا معتبر سے معتبر آدمی کی شکایت یا سفارش قبول نہ کرتا۔

صاحب زینت المجالس[۱] نے بحوالۂ تاریخ ناصری لکھا ہے کہ جب محمود، ہرات آیا تو عبدالرحمن خاں، جو مجلس وزراء کا ممبر تھا، ایک نہایت عمدہ اور وسیع مکان میں مقیم تھا۔ یہ مکان ایک نہایت مشہور فاضل اور بزرگ شخص کا تھا۔ ایک دن عبدالرحمن نے محمود سے کہا کہ "جس مکان میں میرا قیام ہے یہ ایک ضعیف شخص کا ہے جس کی عقل و ذہانت کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اس کی زندگی زیادہ تر ایک خلوت کدہ میں بسر ہوا کرتی ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اس کی عبادت گاہ ہے۔ ایک دن میں دفعتہً اس کی خلوت میں چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک برتن شراب سے لبریز ہے اور اس کے سامنے ایک برنجی بُت رکھا ہوا ہے۔ اس شخص نے شراب پی اور پھر اُس بُت کے سامنے سرنگوں ہو گیا چنانچہ میں اُس بُت اور اُس برتن کو لے آیا ہوں جو حکم مناسب ہو دیا جائے۔"

محمود نے حکم دیا کہ "صاحب مکان لایا جائے"۔ محمود نے اس کو دیکھا اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد عبدالرحمن سے کہا کہ "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ جو کچھ تم نے کہا ہے صحیح ہے"۔ عبدالرحمن نے قسم کھائی اور اپنے بیان کی مکرر تصدیق کی۔ محمود اس پر سخت برہم ہوا اور بولا کہ "اے بزدل سچ بتا تو نے ایسی لغو بات کیوں کہی اور کیوں تو اس درویش کا دشمن ہو گیا ہے؟" آخرکار عبدالرحمن کو اقرار کرنا پڑا کہ "یہ جھوٹی شکایت صرف اس لئے کی تھی کہ اس طرح اس کا مکان ضبط کر لیا جائے گا اور مجھے مل جائے گا۔"

عہد غزنوی کا قانون

عہد غزنوی کے کسی مخصوص قانون یا آئین کا پتہ تاریخ سے نہیں چلتا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمود تمام معاملات میں صرف مذہب اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرتا تھا اور کسی دوسرے آئین کی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور اُسکے متقدمین کا بھی اسی پر عمل تھا

فوجی انتظام

فوجی انتظام کی بھی کوئی تفصیل نہیں معلوم، لیکن یہ ضرور ثابت ہے کہ محمود کو اس میں خاص ملکہ حاصل تھا کیونکہ اس کی سپاہ میں ترکی، تاتاری، عربی، ایرانی ہندی سبھی شامل تھے۔ یہ صرف محمود کی تدبیر و فراست تھی کہ اُس نے ایسے مختلف عناصر کو یکجا کر کے اُن میں امتزاج پیدا کر دیا اگر محمود کی حکومت قلوب انسانی پر نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی اس میں کامیاب نہ ہوتا اور اتنے وسیع ملک میں جو ایک طرف دریائے دجلہ سے لیکر دریائے گنگ تک اور دوسری طرف تاتار سے

---

[۱] زینت المجالس بھی نگارستان کی طرح مختلف قصص و حکایات کا مجموعہ ہے اس کا مصنف مجدالدین محمد الحسنی تھا جو عام طور سے مجدی کے نام سے مشہور ہے مصنف اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے متعدد کتب تاریخ سے استفادہ کیا اور جامع الحکایات سے لیکر نگارستان تک کوئی کتاب اس نے نہیں چھوڑی اس کی تاریخ تالیف سنہ ۱۰۰۴ھ ہے۔

لیکر بحر ہند تک پھیلا ہوا تھا کبھی امن و امان قایم نہ رہتا۔

ایک بار محمود نے خلیفۂ عباسی القادر باللہ کے پاس تحریر روانہ کی کہ "بلادِ خراسان کے اکثر صوبے میرے قبضہ میں ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے مقامات جن پر خلیفہ کے حاکموں کا تصرف ہے میرے حق میں چھوڑ دئے جائیں۔" چونکہ القادر باللہ میں محمود سے مقابلہ کرنے کی قوت نہ تھی مجبوراً اُس کو منظور کر لیا۔ چند دن بعد محمود نے سمرقند بھی طلب کیا اس پر خلیفہ نے انکار کر دیا۔ محمود کو ناگوار ہوا اور اُس نے اطلاع دی کہ "اگر یہ درخواست منظور نہ کی گئی تو میں ہزار ہاتھیوں کو لے کر آؤں گا اور دار الخلافۃ کو تباہ کر دوں گا۔" قاصد اس کا جواب لیکر پھر واپس آیا۔ مکتوب کھولا گیا تو اس میں پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی تھی اور اس کے بعد ایک سطر حروف مقطعات میں لکھی ہوئی تھی اور صرف ال م، ال م پڑھا جاتا تھا۔ بہت کوشش کی گئی کہ اس کا مطلب سمجھ میں آوے لیکن یہ معمہ حل نہ ہوا آخر کار ابوبکر قہستانی جو اسوقت ایک معمولی شخص تھا جرأت کر کے آگے بڑھا اور عرض کی کہ۔ "چونکہ خلیفہ کو ہاتھیوں کے حملہ سے ڈرایا گیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ ان حروف مقطعات سے مقصود "الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل" ہو۔ یہ سنتے ہی محمود کے دل پر حد درجہ خوف خدا طاری ہوا اور دیر تک روتا رہا۔[1]

محمود فطرۃً بے انتہا منکسر المزاج بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا اور اس کی فتوحات نے وسط ایشیا اور سرزمین ہند کے ایک معقول حصہ کا احاطہ کر لیا تھا لیکن اُس نے خود کبھی اپنے تئیں سلطان نہیں سمجھا اور نہ سکوں میں اپنے نام کے ساتھ لفظ "سلطان" کا اضافہ کیا۔ تخت خلافت کی طرف سے اسکو یمین الدولہ، امین الملۃ، کہف الدولہ والاسلام کے خطابات ملے اور طبقات ناصری[2] کی روایت سے "سلطان" کا خطاب بھی

---

[1] فرشتہ جلد اول۔ صفحہ ۲۸۔

[2] طبقات ناصری کا مصنف ابوعمر منہاج الدین عثمان ابن سراج الدین الجوزجانی تھا۔ منہاج الدین کا جد اعلےٰ جوزجان سے غزنی آیا تھا اور یہاں سلطان ابراہیم نے اپنی ایک لڑکی کی شادی اس سے کر دی تھی (سلطان ابراہیم کی چالیس لڑکیاں تھیں جو سب کی سب ایسے ہی فاضل اور مشہور لوگوں سے منسوب کی گئی تھیں۔) اس مواصلت سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ابراہیم رکھا گیا اسی ابراہیم کا بیٹا سراج الدین تھا جو منہاج السراج مصنف طبقات کا باپ تھا۔ سراج الدین سنہ ۵۸۲ھ میں بعہد محمد غوری افواج ہندوستان کا قاضی مقرر کیا گیا اور منہاج السراج نے اُسے "اعجوبۃ الزمان وافصح العجم" ظاہر کیا ہے۔

منہاج السراج سنہ ۶۲۴ھ میں غور سے سندھ اور ملتان آیا اور اوچ میں دار العلوم فیروزی کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

دوسرے سال جب سلطان شمس الدین التمش، ناصر الدین قباچہ کو زیر کر کے واپس آیا تو منہاج السراج کو شرف حضوری حاصل ہوا اور ساتھ ہی ساتھ دہلی آیا۔ سنہ ۶۲۹ھ میں وہ سلطان التمش کے ساتھ تھا اور محاصرۂ گوالیار کے وقت یہیں وہ محکمۂ افتاء و قضا کا صدر اعظم بنایا گیا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۸ پر ملاحظہ ہو)

اس کو دیا گیا۔[1] لیکن محمود نے ہمیشہ لفظ "سلطان" کے استعمال سے احتراز کیا اور خلیفۂ بغداد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اُس نے کبھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا۔

تاریخ "خاندان غزنی" کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم پروری کی خصوصیت صرف محمود پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ اُس کے بیٹے مسعود اور دیگر جانشینوں میں بھی یہی ذوق قایم رہا۔ چنانچہ مسعود کے متعلق بیان[2] کیا جاتا ہے کہ وہ علماء کے لئے بے انتہا فیاض تھا اُسے قابل لوگوں کی صحبت کا اسقدر شوق تھا کہ مختلف ممالک سے ماہرین علم و فن اُسکے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص "ابوریحان[3] خوارزمی" بہت مشہور ہوا ہے جو اپنے عہد کا بہت بڑا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۷)

جب ۶۳۵ھ میں سلطان رضیہ کی افواج اس طرف آئیں تو منہاج السراج اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ جب رضیہ کا انتقال ہو گیا اور بہرام شاہ تخت نشین ہوا اسوقت منہاج السراج دہلی میں تھا۔ ۶۳۹ھ میں بہرام شاہ نے اُسے قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ لیکن وہ عرصہ تک اس عہدہ پر قایم نہ رہ سکا کیونکہ ۶۳۹ھ کے آخر میں بہرام شاہ قتل کیا گیا اور منہاج السراج کو بھی مجبوراً استعفا دینا پڑا۔ ۶۴۰ھ میں وہ لکھنوتی کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ۶۴۲ھ تک مقیم رہا اس کے بعد وہ ۶۴۳ھ میں پھر دہلی آیا اور ناصریہ دار العلوم کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ۶۴۴ھ میں جب ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا تو اُس نے بہت ترقی حاصل کی اور غیاث الدین بلبن کے عہد میں (جو ناصر الدین کے بعد تخت نشین ہوا اور جسے وہ خان معظم کہتا ہے) وہ صدر جہاں اور قاضی مقرر ہوا۔

طبقات ناصری، ناصر الدین محمود کے نام سے منسوب ہے اور اس کی تخت نشینی کے بعد ۱۵ سال تک کے حالات اس میں درج کئے گئے ہیں۔

طبقات ناصری نہایت معتبر تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے اور فرشتہ وغیرہ نے اکثر اس کا حوالہ دیا ہے۔ یوروپین مورخین بھی اس کو نہایت عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ منہاج السراج کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی لیکن غالب گمان ہے کہ وہ ناصر الدین کے بعد کچھ زمانہ تک ضرور زندہ رہا۔

[1] طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۶۶۔ [2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰۔ [3] برگس (Briggs) نے جو ترجمہ انگریزی میں تاریخ فرشتہ کا کیا ہے اس میں بجائے ابوریحان کے انوریحان لکھا ہے۔ جس پر الیٹ نے بھی اظہار حیرت کیا ہے اور بعض دیگر انگریزی تاریخوں میں بھی برگس پر اعتبار کر کے انوریحان ہی لکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس غلطی کی یہ ہے کہ:- Briggs (برگس) نے ابوریحان کو انوریحان پڑھ لیا (کیونکہ تحریر میں یہ دونوں ایک ہی طرح نظر آتے ہیں اور اگر نقطوں کا محل ذرا بدل جائے تو یہ غلطی بہت ممکن ہو جاتی ہے) افسوس ہے کہ کسی انگریزی مورخ نے اصل کتاب پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ غریب فرشتہ اس الزام سے بری ہو جاتا (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۹ پر ملاحظہ کیجئے)

فیلسوف اور ماہر ریاضی و ہیئت و علم نجوم تھا، اس نے ریاضی پر مشہور کتاب

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۸)

بیرونی کا پورا نام محمد بن احمد تھا اور ابوریحان اس کی کنیت تھی۔ اس کی تاریخ ولادت ۳۶۲ھ ۹۷۰ء ہے۔ مسٹر ساشا (Sachau) نے تحقیق الہند انگریزی ترجمہ (Alberuni in India) کے دیباچہ میں سنہ ولادت ۹۷۳ء ظاہر کیا ہے۔ اس کی جائے ولادت کا مسئلہ البتہ بحث طلب ہے اگر لفظ بیرونی اس کی جائے ولادت یا مسکن کو ظاہر کرتا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ بیرون میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن تحقیق طلب امر یہ ہے کہ بیرون کس جگہ کا نام ہے اور یہ مقام ملک کے کس حصہ میں پایا جاتا تھا۔

شہرزوری اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں بیان کرتا ہے کہ ابوریحان بیرون میں پیدا ہوا تھا جو سندھ کا ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔

حاجی خلیفہ نے بھی اس بیان کا تتبع کیا ہے اور ابوالفداء نے بھی ابوسعید کے اسناد سے یہی لکھا ہے۔

ایم رینالڈ (M. Renolds) فرانسیسی مورخ نے بھی اس کو سندھی لکھا ہے، اس لئے اب قابل غور امر یہ ہے کہ بیرون سندھ میں کس جگہ واقع ہے؟ جہاں اب حیدرآباد (سندھ) واقع ہے اس کے قریب ایک مقام نیرون یا نیرون کوٹ، اس جگہ واقع ہے جہاں بیرون کا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ چونکہ نیرون صرف ایک نقطہ کی جگہ بدل جانے سے بیرون پڑھا جا سکتا ہے اس لئے بالکل ممکن ہے کہ ابوالفداء سے یہ غلطی ہو گئی ہو۔ چونکہ ابوالفداء مورخ خود کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا اور سوائے مکہ اور مصر کے سفر کے اس نے کبھی شام کو نہیں چھوڑا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا بیان دوسرے لوگوں کی روایت یا تحریر پر منحصر ہے اور اس غلطی کا امکان اس سے بعید نہ تھا۔ ادریسی نے شہر منصورہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے دریائے مہران کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ نیرون کے قریب سے ہوتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ تحفۃ الکرام اور چچ نامہ میں بھی نیرون ہی کا ذکر کیا ہے۔ یوروپین مورخین میں فرانسیسی مصنفین، ابوالفداء کا تتبع کر کے اس کو بیرون لکھتے ہیں اور انگریزی مصنفین ادریسی کی پیروی کر کے نیرون صحیح سمجھتے ہیں۔

خود بیرونی نے جو جغرافیہ ہندوستان کا لکھا ہے اس میں کہیں بیرون کا ذکر نہیں ہے اگر بیرون کوئی جگہ سندھ میں ہوتی اور وہ وہاں پیدا ہوا ہوتا تو یقیناً وہ وہاں کے حالات لکھتا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیرون کوئی مقام سندھ میں نہیں تھا اور نہ وہ وہاں پیدا ہوا۔

صمعانی نے اپنی مشہور اور نہایت معتبر کتاب الانساب میں جو ۵۶۲ھ کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ بیرونی فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "باہر کا"، اور ہر وہ شخص جو پایۂ تخت سے باہر پیدا ہوتا تھا اسے بیرونی کہتے تھے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۰ پر ملاحظہ ہو)

"قانون مسعودی"[1] کے نام سے مرتب کی جس کے صلہ میں ایک ہاتھی پر انبار کرکے چاندی اس کو دی گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۹)

فرشتہ نے بھی اس کو خوارزمی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا۔ اور اس لئے حسب بیان کتاب الانساب بیرونی کے نام سے مشہور ہوگیا نصف صدی سے زاید زمانہ گزرا جب مسٹر رالنسن (Rawlinson) نے ۱۸۶۹ء کے کوارٹرلی ریویو Quarterly Review میں ابوریحان کے کچھ حالات لکھے تھے۔ مسٹر الیٹ نے اپنی مشہور انگریزی تاریخ ہند میں اس کا ایک جزو نقل کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتا ہے کہ:۔

"ابوریحان خوارزم کا رہنے والا تھا اور سب سے پہلے یہی وہ عرب تھا جسے صحیح معنی میں مشرق کی تاریخ قدیم کی جستجو کی۔ ابوریحان بہت بڑا فاضل شخص تھا اور اس نے لکھا ہے کہ خوارزم کی تقویم شمسی نہایت مکمل توقیت تھی اور ابوریحان اس سے بخوبی واقف تھا"

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا مسٹر ساشا Sachau کی بھی یہی تحقیق ہے۔

ابوریحان اپنے عہد کا بہت بڑا ماہر نجوم، ریاضی داں، مورخ اور حکیم تھا اسے علمی تحقیقات کا اس قدر شوق تھا کہ (بقول شہرزوری) وہ سال بھر میں صرف دو دن (نوروز و مہرجان) آرام کرتا اور باقی تمام سال تحریر و مطالعہ میں صرف کر دیتا تھا۔

ابوالفضل بیہقی نے جس کا زمانہ بیرونی کے نصف صدی بعد ہوا ہے لکھتا ہے کہ:۔

"فلسفہ و ریاضی کا وہ بہت بڑا فاضل و محقق تھا"

رشید الدین مصنف جامع التواریخ لکھتا ہے کہ:۔

"ابوریحان بیرونی اپنے عہد میں بے مثل محقق ریاضی و فلسفہ کا ہوا ہے محمود سبکتگین کے عہد میں وہ غزنی آیا اور شاہی ملازم ہوگیا"

مسٹر ساشا، تحقیق الہند کے انگریزی ترجمہ Alberuni's India کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"محمود کے عہد میں خوارزم ایک مامونی خاندان کے زیر حکومت تھا اور البیرونی اپنے وطن یعنی خوارزم میں فرمانروائے عہد کا مشیر خاص تھا۔ محمود کسی نہ کسی بہانہ سے خوارزم پر بھی قابض ہو جانا چاہتا تھا اور البیرونی اس کا مخالف تھا جب محمود نے خوارزم پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لیا تو وہاں اپنا ایک گورنر مقرر کر دیا اور غزنی واپس آیا اس حال میں کہ بہت سا مال غنیمت، مامونی خاندان کے تمام افراد اور بہت سے قیدی وغیرہ ساتھ ساتھ تھے۔ انھیں لوگوں میں سے ایک ابوریحان بھی تھا چونکہ ابوریحان سے محمود خوش نہیں تھا اور اس کا وزیر احمد ابن حسن مہندی بھی مخالف تھا اسلئے وہ ایک منجم کی حیثیت سے محمود کے دربار میں پایا جاتا تھا۔ مسعود کے عہد میں اس نے کافی ترقی کی اور ہندوستان بھی آیا اور یہاں کی زبان سنسکرت سیکھ کر ایک سنسکرت کتاب پاتنجل کا عربی میں ترجمہ کرکے اس کا نام پاتجل رکھا"

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مشہور تصنیف ریاضی قانون مسعودی میں اس کتاب سے مدد لی ہے اس کی دوسری کتاب تحقیق الہند بھی بہت مشہور ہے جس کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس نے یونانی زبان سے بھی کئی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں اس کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ ۴۳۰ھ اس کا سنہ وفات ہے۔

[1] قانون مسعودی کے ترجمہ و اشاعت کا انتظام نواب محمد اسحاق خانصاحب آنریری سکریٹری کالج نے ۳۹-۱۹۳۸ء کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ کوئی شخص اس کا ترجمہ نہ کر سکا اور یہ کام انجام کو نہ پہنچ سکا۔

اسی عہد کا ایک اور بہت مشہور شخص ابو محمد ناصحی تھا۔ اس نے فقہ حنفی پر ایک کتاب مسعودی کے نام سے تصنیف کی اور بادشاہ کے سامنے پیش کی تھی۔

سلطان مسعود نے علاوہ مساجد کے بہت سے مدارس اور کالج (دار العلوم) ملک کے مختلف حصص میں قایم کئے۔

الغرض مسعود اشاعت علم و ہنر، توقیر فضل و کمال میں اپنے باپ کا صحیح معنی میں جانشین تھا۔ اسکی کوشش یہ تھی کہ معمولی سا معمولی شخص بھی علم کی طرف توجہ کرے اور یہی وجہ تھی کہ اس نے کسب علم کے لئے بہت سی آسانیاں ہر ایک کے واسطے بہم پہونچا دی تھیں۔ طلبہ کو وظایف دئے جاتے تھے۔ اُن کے تمام مصارف کا بار برداشت کیا جاتا تھا اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔

صاحب "روضۃ الصفا"[1] کا بیان ہے کہ مسعود نے ملک کے مختلف حصص میں اسقدر کثرت سے معابد و مساجد مدارس و کالج تعمیر کرائے کہ اُن کا شمار مشکل ہے اور اس کی فیاضی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ ایک بار ماہ رمضان میں اسنے ایک لاکھ درہم ایک ہی دن میں غربا کو تقسیم کر دئے۔

---

[1] روضۃ الصفافی سیرۃ الانبیا و الملوک و الخلفاء کا مصنف محمد بن خاوند شاہ بن محمود تھا جو میر "خاوند" اور "میر خوند" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سنہ ۸۳۶ھ کے آخر یا شروع ۸۳۷ھ ۱۴۳۳ء میں پیدا ہوا۔ "میر خوند" کا باپ سید برہان الدین خاوند شاہ ماوراء النہر کا رہنے والا تھا اس کا سلسلہ نسب حسن ابن علی سے ملتا ہے جب برہان الدین کا انتقال ہوا تو وہ کم سن تھا اور ترک وطن پر مجبور ہوگیا۔ آخر کار بلخ پہونچا اور یہیں تحصیل علوم کی۔

اس کے بیٹے میر خوند صاحب روضۃ الصفا کے بھی تفصیلی حالات تاریکی میں ہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کا ابتدائی زمانہ بھی سختی و صعوبت میں بسر ہوا یہاں تک کہ وہ دنیا کی طرف سے سرد دل ہوگیا۔ اور صرف مشاغل علمیہ کو اپنا شعار قرار دیا۔ اتفاق سے میر علی شیر جو سلطان حسین شاہ ایران کا وزیر تھا اور خود بھی فن تاریخ کا بہت بڑا شایق و ماہر تھا اس کا معاون ہوگیا اور اس طرح میر خوند کو اپنے طبعی ذوق کے پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ روضۃ الصفا کا اکثر حصہ میر خوند نے اپنی بیماری کے عالم میں لکھا ہے چنانچہ وہ خود لکھتا ہے کہ:-

> "میں صرف داہنے پہلو پر لیٹ کر لکھ سکتا تھا۔ بیٹھ کر ایک صفحہ لکھنا بھی دشوار تھا۔ اطباء نے ہدایت کر دی تھی کہ اگر لکھنا ترک کر دیا گیا تو مرض بڑھ جائے گا۔ چنانچہ جب کبھی وہ چند گھنٹوں کے لئے بھی آرام لینے کے لئے قلم ہات سے رکھ دیتا تو نیند نہ آتی اور بڑے بڑے خواب نظر آتے۔"

میر خوند نے سنہ ۹۰۳ھ ۱۴۹۸ء میں جب اس کی عمر ۶۶ سال کی تھی انتقال کیا۔

روضۃ الصفا نہایت معتبر تاریخ ہے اور تقریباً ۱۹ عربی اور ۲۲ فارسی کی تاریخوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ بعد کے مورخین نے اس سے بہت مدد لی ہے اور حاجی خلیفہ کی تاریخ تو تمام تر اسی پر منحصر ہے۔

ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ابوریحان خوارزمی نے جسے بیرونی بھی کہتے ہیں سلطان مسعود ہی کے زمانہ میں ترقی کی ابوریحان اُس سفارت کے ساتھ محمود کے دربار میں پہونچا تھا جو خوارزم کے بادشاہ نے روانہ کی تھی۔ فارابی اور ابوالخیر بھی اس کے ساتھ تھے۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا سے بھی (جو اس کا ہم عصر تھا) جاتے وقت درخواست کی گئی لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ سفارت کی واپسی کے بعد محمود نے بوعلی سینا اور ابوریحان دونوں کو طلب کیا کہ شاہی ملازمت میں داخل ہو جائیں لیکن بوعلی سینا نے انکار کر دیا اور ابوریحان نے منظور کر لیا۔[1]

چونکہ محمود کا وزیر خواجہ حسن احمد بن میمندی ابوریحان سے سیاسی مخالفت رکھتا تھا اس لئے اُس کی پوری عزت نہ ہو سکی۔ البتہ مسعود کے عہد میں اُس کی بہت توقیر ہوئی اور اسی کے عہد میں اُس نے بہت سی بے مثل تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں۔

اسی بیرونی کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی عہد میں عربی و فارسی زبانیں کس قدر ترقی کر رہی تھیں اور یونان و ہند کا نایاب علمی ذخیرہ ان زبانوں میں منتقل ہو رہا تھا، ریاضی، نجوم، فلسفہ، علم الادویہ، ہیئت و ہندسہ یہ خاص فنون تھے جن کی طرف مسلمانوں کو عام طور سے توجہ تھی اور اسی کے ساتھ ادب کا ذخیرہ بھی سنسکرت وغیرہ سے عربی فارسی میں منتقل ہو رہا تھا۔[2] مسعود کو خود علم و ادب کا کیسا ذوق تھا وہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانۂ ولیعہدی میں جب وہ خراسان سے غزنیں آیا اور شعراء نے قصائد تہنیت پیش کئے تو عنصری اور زینبی کو ۵۰،۵۰ ہزار درہم اور باقی شعراء کو ۲۰،۲۰ ہزار درہم انعام دلوایا۔[3]

مسعود کریم و فیاض، علم دوست اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ ہی بے انتہا دلیر و شجاع بھی تھا۔ اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُسے رستم ثانی کہا کرتے تھے اور اس کا گرز کوئی شخص ایک ہاتھ سے نہ اُٹھا سکتا تھا۔[4] اس کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ وہ علی ثانی کے نام سے مشہور ہو گیا۔[5] وہ کبھی گوارا نہ کرتا تھا کہ اُس کی سلطنت میں بے امنی یا جور و ظلم رونما ہو۔ وہ قیام امن کے لئے مختلف تدابیر سے کام لیتا تھا اور بعض دفعہ اس نے حد درجہ ذہانت سے کام لیا چنانچہ جامع الحکایات راوی ہے کہ ایک بار صحرائے کرمان میں قزاقوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا اور قافلوں کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ مسعود نے فوج اُس کی سرکوبی کے لئے روانہ کی لیکن وہ سب جنگل میں منتشر ہو گئے اور گرفتار نہ ہو سکے سلطان مسعود کو اسکی اطلاع ملی۔ تھوڑی دیر تک اُس نے غور کیا اور حکم دیا کہ اصفہان سے بہت سے سیب لائے جائیں اور

---

[1] یہ بیان مسٹر الیٹ کا ہے جو ان کی تاریخ ہند جلد دوم صفحہ ۲ میں درج ہے لیکن مسٹر ساشا (Sasha) کو اختلاف ہے۔

[2] Preface to Alberuni's India by Sachau۔ [3] مجمع الفصحا۔

[4] فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۰۔ [5] طبقات ناصری (ایلیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۷۱۔

انھیں باریک سا سوراخ کرکے زہر ڈال دیا جائے جب سیب اس طرح مسموم کر دیے گئے تو وہ ایک قافلہ کے سپرد کر دیے گئے جو صحرائے کرمان کی طرف سے گزرنے والا تھا اور ایک دستہ فوج کا بھی مامور کیا گیا کہ قافلہ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو۔ جب یہ قافلہ قزاقوں کی جائے پناہ سے گزرا تو انھوں نے حملہ کرکے سب سے پہلے ان سیبوں کو کھانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی جماعت اُن کے زہر کے اثر سے ہلاک ہو گئی اور جو چند نفوس بچ گئے اُن کو دستۂ فوج نے آکر گرفتار کر لیا۔[1]

اسی طرح ایک بار اُس کے سامنے شکایت پیش ہوئی کہ ایک شخص غور جا رہا تھا کہ اُس نواح کے فرمانروا نے اُس کو گرفتار کرکے زبردستی سارا مال چھین لیا۔ مسعود نے ایک تحریر اُس کے پاس روانہ کی کہ سارا مال واپس کر دیا جائے لیکن جو قاصد خط لیکر گیا تھا اس کی بھی سخت توہین کی گئی اور اُس نے مسعود سے سارا حال آکر بیان کیا۔ مسعود نے حکم دیا کہ "دوبارہ خط لکھا جائے اور ہدایت کی جائے کہ اگر ان تمام باتوں کی تلافی نہ کی گئی تو شاہی لشکر سرکوبی کے لئے روانہ کیا جائے گا" جب یہ خط لکھ گیا تو پھر اُسی قاصد کے سپرد کیا گیا جو پہلے تحریر لے گیا تھا اُس نے عرض کیا کہ "جہاں پناہ! کسی نہایت ہی مختصر پرزہ پر یہ پیام تحریر فرمانے کا حکم دیجئے کیونکہ وہاں یقیناً مجھے اس کاغذ کے نگلنے پر مجبور کیا جائیگا اور کاغذ بڑا ہوگا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی"۔ مسعود نے یہ سنتے ہی تیاری لشکر کا حکم دیا اور حاکم غور کو شکست دیکر اُس کے مُلک پر اپنا قبضہ کر لیا اور جو شخص لوٹا گیا تھا اُس کا مال واپس دلوا دیا۔[2]

غزنوی خاندان کا ساتواں فرمانروا عبدالرشید ابن محمود بھی بڑا فاضل و ذہین شخص تھا۔[3] تاریخ کا اُسے بہت شوق تھا اور خود بھی اکثر لکھنے پڑھنے ہی میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔

اسی طرح نواں حکمراں فرخ زاد ابن مسعود حد درجہ حلیم و منصف تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو زابلستان وبائی امراض کی وجہ سے تباہ ہو رہا تھا۔ فرخ زاد نے تمام محاصل معاف کر دئے اور عملی طور سے ہمدردی کا اظہار کیا۔[4]

اس کے بعد سلطان ابراہیم کا زمانہ آیا۔ سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غازی جو سلطان فرخ زاد کے بعد تخت نشین ہوا، حد درجہ زاہد و متقی تھا اور باوجود عنفوانِ شباب کے اس نے لذاتِ نفسانی کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ ماہ رمضان کے ساتھ رجب و شعبان کو بھی ملا لیا کرتا تھا اور اسی طرح سال میں مسلسل تین ماہ روزہ رکھتا تھا اس کا کوئی لمحہ رعیت پروری اور عدل پسندی کے خیال سے خالی نہ گزرتا تھا اور کثرت سے خیرات کرتا تھا۔[5]

ابراہیم کو نصفت پروری اور حُسن انتظام کا کس قدر خیال تھا اس کا حال یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ صبح سے دوپہر تک ملول و مغموم بیٹھا رہا۔ تمام وزرا و اراکین خائف تھے اور کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ دریافت کرے

---

[1] و [2] جامع الحکایات قسم (۳) باب (۱۲) حکایت (۹) — [3] طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۷۴ —
[4] طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۷۶ — [5] فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۸ (نولکشور)

آخر کار ایک درباری جس سے ابراہیم بہت زیادہ مانوس تھا آگے بڑھا اور وجہ دریافت کی۔ ابراہیم نے کہا کہ "میرا وزیر و مشیر خاص بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ آج میں نے تمام ارکانِ دربار کو دیکھا تو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو اس کا جانشین ہو سکے۔ کیا یہ افسوسناک امر نہیں ہے؟" اُس نے عرض کیا کہ "جہاں پناہ کی نگاہ آفتاب کی طرح منور و تاباں ہے اور معمولی پتھر کو الماس اور ادنیٰ خاک کو سونا بنا سکتی ہے جس کو بھی اس خدمت پر مامور کیا جائیگا وہ اس قابل ثابت ہوگا۔"

سلطان ابراہیم نے جواب دیا۔ "یہ صحیح ہے لیکن آفتاب کو بھی ایک زمانہ درکار ہوتا ہے کہ وہ کسی پارۂ سنگ کو الماس بنا سکے اور ایک کیمیا گر بھی سونا نہیں بنا سکتا جب تک تمام ضروری اجزا فراہم نہ ہو جائیں۔"[1]

سلطان ابراہیم نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ انتظامِ سلطنت قابل اور تجربہ کار ہاتھوں میں رہے۔ وہ اپنے افسروں کو خود تربیت کرتا تھا اور اُنھیں مختلف طریقوں سے بتاتا تھا کہ راعی و رعایا کے تعلقات کیا ہیں اور امن و سکون کا قیام کن تدابیر پر منحصر ہے۔ اسی کے ساتھ وہ قابل سے قابل افسر کے ذہن میں یہ بات مرتسم نہ ہونے دیتا تھا کہ سلطنت اس کی محتاج ہے۔ وہ ایک ہی خدمت کے لئے مختلف آدمی رکھتا تھا تاکہ ہر شخص خایف رہے کہ اگر وہ اہل ثابت نہ ہوا تو دوسرا اُس کی جگہ پُر کرنے کے لئے موجود ہے۔[2]

فرشتہ جامع الحکایات کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ سلطان ابراہیم مذہب کی طرف زیادہ مایل تھا اور نہایت پابندی کے ساتھ وہ امام یوسف سجاوندی کی صحبت میں مذہبی معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ سجاوندی نے سلطان ابراہیم کو سخت الفاظ میں اخلاق کا درس دیا اور اُس نے ہمیشہ صبر و تحمل کے ساتھ اُسے سُنا سلطان ابراہیم درس کے وقت اپنی شاہانہ حیثیت کو بالکل فراموش کر دیا کرتا تھا اور ایک معمولی شاگرد کی طرح زانوے ادب تہ کر کے تمام زجر و توبیخ کو تلمیذانہ رواداری کے ساتھ برداشت کرتا تھا۔

سلطان ابراہیم خط نسخ کا خوشنویس تھا اور ہر سال خود اپنے ہاتھ سے دو ایک نسخے کلام مجید کے لکھ کر کبھی مکۂ معظمہ اور کبھی مدینۂ منورہ بھیجا کرتا تھا۔[3] ارزقی جو الفیہ و شافیہ کا مصنف ہے اسی کے عہد میں ہوا ہے۔

اس کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین مسعود تخت نشین ہوا۔ یہ بھی نہایت بردبار، فیاض، وسیع الاخلاق، اور کریم النفس شخص تھا اس نے اُن تمام سخت قوانین کو جو اس سے قبل رائج تھے منسوخ کر دیا علاوہ اس کے ٹیکس اور خراج کے ناقابل برداشت رقوم معاف کر کے ملک میں عام طور سے امن و سکون پیدا کر دیا اور تمام وہ جاگیریں جو امراء

[1] زینت المجالس (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۵۱۰ — [2] زینت المجالس (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۵۱۱ —

[3] فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۸ (نولکشور)

دربار کے لئے پہلے مقرر تھیں بدستور بحال رکھیں، اس کا عہد جو سترہ سال تک رہا نہایت خوشحالی کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے جب تک وہ بادشاہ رہا کسی جگہ نقص امن نہیں ہوا اور رعایا نے اس کے عدل و انصاف، رحم و کرم سے فایدہ اٹھا کر نہایت مطمئن زندگی بسر کی۔[1]

خاندان غزنوی میں بہرام شاہ بھی خاص صفات کا بادشاہ تھا اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے ذوقِ علم کا ثبوت دینا شروع کیا۔ اس نے علم و فضل کی اسدرجہ قدر کی اور ترقی ادب (لٹریچر) میں اسقدر فیاضی اور عالی حوصلگی سے کام لیا کہ لوگ محمود کے زمانہ کو بھول گئے۔ شیخ نظامی اور سید حسن غزنوی جو مشہور شعرا و حکما میں شمار کئے جاتے ہیں بہرام ہی کے دربار کے جوہر تابندہ تھے۔ بہرام نے مختلف کتابیں غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرائیں اور ان ہی میں سے ایک کلیلہ دمنہ بھی تھی۔ عہد قدیم میں یہ کتاب اور شطرنج ہندوستان کے کسی راجہ نے نوشیرواں شاہ فارس کے پاس بھیجی تھی اور اس کے وزیر بزرجمہر نے اس کتاب کا ترجمہ سنسکرت سے پہلوی زبان میں کیا تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں ابن المقنع نے اس کتاب کو عربی زبان میں منتقل کیا اور اس عربی نسخہ سے بہرام نے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ چونکہ اس ترجمہ میں عربی الفاظ کثرت سے پائے جاتے تھے اس لئے بعد کو سلطان حسین مرزا خوارزمی کے عہد میں مولانا حسین واعظ کاشفی نے پھر اس کو مرتب کیا اور اس کے اشکال دور کر کے اس کا نام انوار سہیلی رکھا۔[2]

الغرض محمود کی نیک نیتی کا یہ اثر تھا کہ تقریباً غزنوی خاندان کے تمام فرمانروا محمود کی کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل تھے یہاں تک کہ آخری فرمانروا خسرو ملک بھی حد درجہ فیاض، شریف الطبع اور حلیم تھا۔[3]

---

[1] طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۸۰۷ — [2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰ (نولکشور) — [3] طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۸۱۷۔

ہندوستان سنہ ۴۱۳ھ (سنہ ۱۰۲۲ع) میں

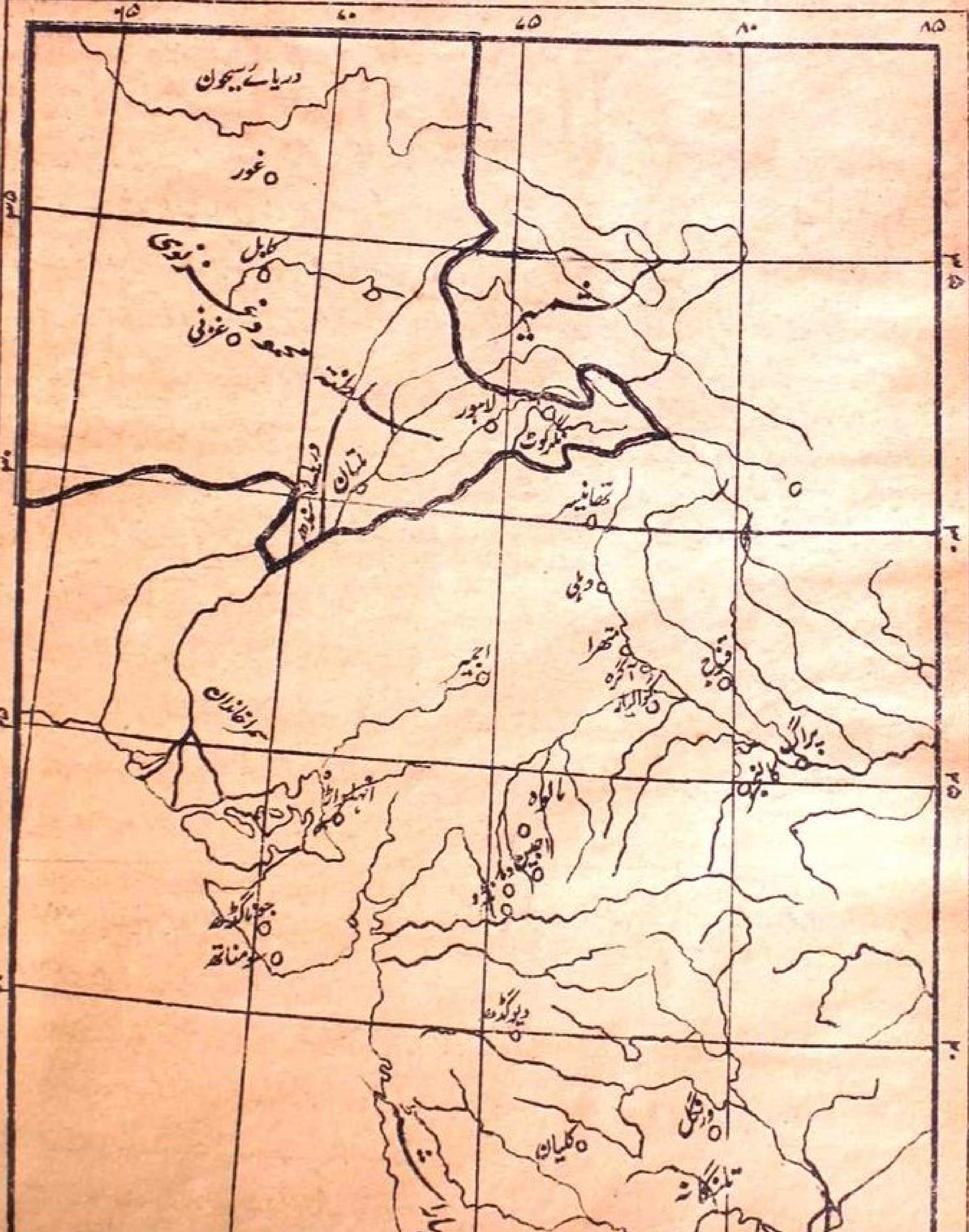

مسئلۂ خلافت و امامت

(آزاد خیال شیعہ کے قلم سے)

"نگار" کی بساط بحث پر اس مسئلہ کو ہوئے ڈھائی برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے سب سے آخر میں گزشتہ جنوری کے پرچہ میں میرا مبسوط مقالہ اس موضوع پر شایع ہوا تھا جس کے بعد نگار کیطرف سے علمائے اہلسنت کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، اس سلسلہ میں دو مضمون شایع ہوئے ایک جناب ابوسعید بزمی ایم۔اے کا جو اس موضوع پر اس سے پہلے بھی "ہرنام" کے ابتدائی مضمون کے جواب میں خامہ فرسائی فرما چکے تھے اور دوسرا مضمون "م۔ح" کا ہے جو نسبتہً طولانی ہے اور بعد کو شایع ہوا ہے۔

جس شخص نے نگار میں اس بحث کا شروع سے مطالعہ کیا ہو اور ہرنام صاحب کے ابتدائی مضامین، نگار کا محاکمہ اور ادارتی تبصرہ، اور آزاد خیال شیعہ کا شایع شدہ مضمون پڑھا ہو اور اس کے بعد ان دونوں آخری مضمونوں کو دیکھے وہ اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس بحث کا جو معیار آزاد خیال شیعہ کے مضمون تک قایم رہا ہے وہ ان آخری مضامین سے مختلف ہے جناب بزمی صاحب کا مضمون تو مغز و استدلال کے اعتبار ہی سے اسقدر ہلکا ہے کہ اُسے نگار کے معیار پر منطبق نہ ہونا چاہئے تھا لیکن "م۔ح" کا مضمون تو مناظرانہ تعریضات غیر متعلق الزامات اور فریق مخالف کے خلاف بیجا نکتہ چینیوں اور تشنیعات نیز درشت و ناگوار تعبیرات سے اس درجہ مملو ہے کہ وہ "نگار" کے بجائے "النجم" کے صفحات پر ظاہر ہوا ہوتا تو بجا اور مناسب تھا۔

سابقہ مقالات کا متین پہلو اس درجہ وزن رکھتا ہے کہ اُس کا اقرار و اعتراف جناب "م ح" کو بھی حسب ذیل الفاظ میں کرنا پڑا ہے۔

"سب سے پہلی بار اس مشہور مختلف فیہ مسئلہ میں "سنجیدگی" کے ساتھ نگار ہی کے صفحات پر بحث جاری ہوئی ہے اور جتنے بھی اس میں حصہ لیا متانت نگاری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔"

لیکن خود موصوف نے اپنے اس مضمون میں اس اُصول کی کہاں تک پابندی کی ہے اس کے لئے حسب ذیل اقتباسات کافی ہیں:۔

"حکومت الٰہیہ کے بارے میں کیوں رسمی مہمل شرایط بیان کی جاتی ہیں کہ خلیفہ صرف امام ہی ہو سکتا ہے اور امام صرف خاندان نبوت کے افراد ہو سکتے ہیں ——— کیونکر اسے کوئی عقل والا انسان باور کر سکتا ہے"

"ایک امام صاحب کو غار میں رہنے کا حکم دیا گیا جن کا وجود و عدم برابر ہے ——— اس قسم کے معتقدات اسلام کے ساتھ مذاق و استہزاء کے مرادف ہیں۔"

"ولکنی اقول لکم لاتکادون تفقہون حدیثا"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایک آزاد خیال انسان کے لئے یہ علمی فریب کاری کہاں تک روا قرار دیجا سکتی ہے"۔ "صاحب تبصرہ نے یا تو یہ سمجھا ہی نہیں کہ "نص قطعی" کسے کہتے ہیں یا دیدہ و دانستہ جل دینے کی کوشش کی ہے"۔ "میں بتاؤں گا کہ اس آیت سے استدلال میں کس قدر فریب سے کام لیا گیا ہے"۔ "دلیل کی قطعیت تو اسی حرکت ناشائستہ کے باعث سوخت ہوگئی"۔ "تہذیب مانع ہوتی ہے ورنہ میں کہتا کہ بڑی خیانت و بددیانتی سے کام لیا گیا ہے"۔ (تہذیب مانع ہوتی ہے۔ کا فقرہ خود احساس بدتہذیبی کا آئینہ دار ہے جس سے معلوم نہیں جرم سنگین ہوتا ہے یا سبک) — "محض فریب دینے اور ناواقف کو گمراہ کرنے کے لئے دو درجن کتابوں کے نام نقل کر دئے کہ ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے چاہے دو جعلی ہی کیوں نہو، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ روایت قطعی جھوٹی اور جعلی ہے، اس کی صحت کا ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جا سکتا"۔ (ان فقرات میں انتہائی غیظ و غضب اور غصہ صاف ظاہر ہے جو چیز سنجیدگی بحث کے لئے سم قاتل ہے) — "کیا قرآن میں یہ لغویت ہو سکتی ہے"۔ "مان لو کہ اس سے حضرت علی کی خلافت کا ثبوت ملتا ہے لیکن (ع)" یہ تو سوچو کہ فلک ٹوٹ پڑے گا کس پر"۔ "آیت کے شان نزول میں غدیر خم کی روایت اختراع کی گئی نتیجہ یہ رہا جو سامنے ہے اور اب میں بجز اس کے کیا لکھوں (ع)" در کفر ہم ثابت نہ زنار را رسوا مکن"۔ "استدلال کی ماہیت پر غور کرو جس میں خدا اور رسول کے ساتھ کس قدر گستاخیاں ہیں اور اسلام کے ساتھ کیسا کھلا ہوا تمسخر ہے"۔ "افسوس نام زہرا بردن و دین یہودی داشتن"۔ "جو ہر لطیف سے بہرہ مند اشخاص اُن کی استدلالی حیثیت کو ذرہ برابر بھی وقعت نہیں دیکھتے، ہٹ دھرمی اور کجروی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اس کا معاملہ صرف خدا پر ہے"۔ "ادعائے باطل کے اثبات کے لئے جب دلایل و حجج کی دنیا میں قدم رکھا گیا تو ہر ہر قدم پر بیکسی نے فریاد کی اور ہر ہر گام پر تہی مایگی نے مرثیہ پڑھا درایت نے دامن تھاما اور عقل نے ہاتھ پکڑ لیا غرض بیچارگی کی جسقدر مایوسیاں ہو سکتی ہیں وہ خود خرمن دلایل کے حق میں برق و شرر ثابت ہوئیں"۔ "خلافت علی — بعض مفسدین کا اختراعی مسئلہ ہے اور اسقدر مہلک و خطرناک کہ اس کی بدولت قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے"۔

یہ اقتباسات سنجیدہ طبقہ کے غور و سکون کے لمحوں کے لئے سامنے ہیں۔ یہ اس بحث کا حسرت خیز انجام ہے جس میں متانت نگاری کو سنگ اساسی قرار دیا گیا تھا۔ ان اقتباسات کے متوازی الفاظ و تعبیرات اس کے پہلے کے مضامین میں ڈھونڈھنے سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔ موجودہ اقتباسات کی اسپرٹ کا جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے گفتگو کم از کم "آپ" سے "تم" کے درجہ تک پہونچ گئی ہے اور "تو" کا درجہ بہت قریب ہے — عام افراد کی افتاد طبع کے مطابق اور عام اُصول مناظرہ کے موافق جہاں "کلوخ" و "سنگ" کا تبادلہ آئینی حیثیت سے منصفانہ قرار دیا گیا ہے اور "البادی اظلم" کا عام سارٹیفکٹ اس کی صفائی میں دیدیا گیا ہے اگر میں بھی اس مضمون کا حقیقتاً جواب لکھوں تو پھر اصولاً حضرت نیاز کو بھی شکوہ و فریاد کا حق ہوگا اور نہ مضمون کے ایسے اجزاء پر قلم نسخ پھیرنے کا۔ مگر میں خود اس طریقہ تحریر کو نہ پسند کرتا ہوں اور نہ اثبات مطلب کے سلسلہ میں مفید اور حقیقتاً ذاتی طور سے اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں جسے مدیر نگار نے اپنے ایک نوٹ میں بایں الفاظ روشن کیا ہے کہ "گالی کا جواب گالی سے دینا برا نہیں لیکن اسی وقت جب ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ سب سے پہلے جس نے گالی دی تھی اس نے کوئی اچھا کام کیا تھا"۔

اس لئے مجھ سے اس امر کی توقع نہ کرنا چاہئے کہ میں اپنے زیر تحریر مقالہ میں کسی ایسی بات کا جواب دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس طرح کی ضرورت جبھی پیش آ سکتی تھی جب میرا استدلالی پہلو کسی طرح کمزور ہوتا لیکن جبکہ مجھے اپنی حقانیت پر اعتماد ہے اور استدلال کی طاقت پر پورا بھروسا تو اس طرح کا انداز تحریر اختیار کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

غرض یہ ہے اس مضمون کی **پہلی کمزوری** جو بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری بات غیر متعلقہ مباحث کا چھیڑنا یہ بھی عام فن مناظرہ کا دلچسپ کرتب ہے، اس سے مقصود یہ ہوا کرتا ہے کہ مخاطب کو ان اجنبی مباحث میں اُلجھا کر اصل بحث میں گفتگو سے باز رکھا جائے۔ اس کا ارتکاب بھی زیادہ تر اسوقت کیا جاتا ہے جب اصل موضوع میں اپنی وسعت بیان اور طاقت استدلال پر اعتماد نہ ہو، یہ جوہر اس مضمون میں کافی درخشاں ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سوائے چند مسئلوں کے تمام وہ الزامات جو فرقۂ شیعہ کے اوپر مختلف مسائل میں عاید کئے جایا کرتے ہیں، اس مقالہ میں مندرج ہیں مثلاً بداء، انکار ختم نبوت، فتنۂ ابن سبا، تحریف قرآن۔ غور کیا جائے تو یہی ا نی گنی چند باتیں ہیں جن کے الفاظ بدل بدل کر رٹ لگانے میں "النجم" کی ساری عمر ختم ہوئی۔ ایک تو فرقۂ شیعہ پر ان میں سے اکثر الزامات کا عاید کرنا ہی بالکل غلط ہے کیونکہ بداء کے مسئلہ میں احادیث اور علماء شیعہ کے اقوال دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ وہ اسے بمعنے لغوی "ظہر لہ مالم یظہر" حضرت احدیت کے لئے غیر ممکن سمجھتے ہیں جس چیز کو وہ بداء کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ اہلسنت کے متفقہ احادیث و روایات میں بھی موجود ہے اور قرآن میں بھی مندرج ہے یہ اور بات ہے کہ اہلسنت اسکو بداء نہ کہیں کسی اور لفظ سے اسکو یاد کریں پھر ایسے تعبیری اختلاف کی بنیاد پر یہ حق کہاں پیدا ہوتا ہے کہ شیعوں کی نسبت اس خلاف واقعہ اظہار سے کام لیا جائے کہ وہ "بداء" بہ معنے لغوی کے قائل ہیں۔ اسی طرح ختم نبوت کے مسئلہ میں بھی جمہور شیعہ متفق ہیں اور وہ ہرگز اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتے کہ ائمہ نبی تھے یا رسول اللہ سے بالکل مساوی تھے پھر اس چیز کو پیش کرنے اور اسپر زور قلم صرف کرنے سے حاصل۔

ابن سبا یہودی کے عقاید سے شیعیت کا ماخوذ ہونا یہ بھی ایک ایسی بے بنیاد روایت ہے جس کا درایت سے کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے۔ قاعدہ ہے کہ کسی مذہب کے افراد اس اپنے پیشرو کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں جو اُن کے عقاید کا اصلی بانی ہو، یہی علامت ہوتی ہے جس سے کسی فرقہ کے لوگ اپنے پیشرو کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن ابن سبا کو ہمیشہ شیعہ کافر، ملعون، مطرود و مردود لکھا کئے اور کہتے رہے۔ پھر اسکے کیا معنی کہ شیعی عقاید کا بانی ابن سبا کو قرار دیا جائے۔

اس کے برخلاف عبد اللہ بن سلام اور کعب الاحبار نو مسلم یہودیوں کے روایات کو اہلسنت سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور عہد فاروقی بعد خلافت کے اندر ان کو وہ عزت حاصل تھی کہ بہت سے صحابۂ کبار کو شاید وہ عزت حاصل نہ تھی اسی کا نتیجہ ہے کہ آیات قرآنی کی تفسیر میں جہاں تک قصص کا تعلق ہے ان لوگوں کے بیان کردہ روایات (اسرائیلیات) کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ اسلام کے پاکیزہ روایات یہودیوں کے مزعومہ خرافات میں ملکر گم ہو گئے ہیں یہاں تک کہ اس کا اثر شرعی احکام پر بھی پڑا چنانچہ روز عاشورہ کے روزہ کی تشریع یہودیت ہی کے زیر اثر پایۂ تکمیل کو پہونچی اور عقاید پر بھی، چنانچہ یہود کا عقیدہ ہے کہ ید اللہ مغلولۃ یعنی خدا جو کچھ قضا و قدر کرنا تھا کر چکا اور اب اس کے ہاتھ بالکل بندھے ہیں کسی طرح کی کارگذاری کا موقع باقی نہیں ہے۔ اہلسنت کے اندر انکار "بداء" کی صورت سے ظاہر ہوا۔

مورخانہ تحقیق و تفتیش اور واقعات کی فلسفیانہ تحلیل اس کا سبب یہ بتلاتی ہے کہ خود حضرت عمر کو مدینہ میں آنے کے بعد یہودیوں

کے مقدس روایات کے ساتھ خاص شغف ہو گیا تھا جس کا مظاہرہ رسالتمآب کے سامنے تک ہوا اور حضرت کو تنبیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت سے اجازت مانگی کہ میں یہود کے احادیث کو لکھا کروں کیونکہ میں سنتا ہوں تو وہ مجھے بہت پسند آتے ہیں حضرت نے فرمایا "کیا تم لوگ اسی طرح گمراہ ہونا چاہتے ہو جس طرح یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے"[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپ آنحضرت صلعم کے پاس ایک کتاب لائے جسے آپ نے بعض اہل کتاب سے حاصل کیا تھا تو حضرت غضبناک ہوئے اور فرمایا "تم لوگ ضرور اسی طرح گمراہ ہو گے جس طرح یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے"[2] تیسری روایت میں یہاں تک ہے کہ آپ حضرت کے پاس توریت کا ایک نسخہ لیکر آئے اور بڑے ذوق و شوق سے کہا کہ "یہ توریت کا نسخہ ہے" حضرت نے سکوت فرمایا آپ نے اُسے پڑھنا شروع کر دیا اور رسالتمآب کا چہرہ متغیر ہونے لگا لیکن آپ کو کوئی توجہ نہیں ہوئی حضرت ابوبکر نے فرمایا "اے خدا تجھے غارت کرے تو دیکھتا نہیں کہ رسالتمآب کے چہرہ کا کیا عالم ہے"[3] ـــ بہت ممکن ہے کہ رسول اللہ کی تنبیہ کا اُسوقت آپ پر حقیقی اثر ہوا ہو مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ کی دلچسپی یہود کے لٹریچر کے ساتھ برابر قائم رہی جس کا پورا مظاہرہ آپ کے دور حکومت میں ہوا اور کعب الاحبار کے روایات کو آپ کی بدولت وہ اہمیت حاصل ہو گئی کہ وہ احادیث کی ہم پلہ سمجھ لی گئیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ "فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون"[4] کی شرح میں اسلامی تفاسیر علمائے اہل کتاب کی طرف رجوع کا فتوےٰ دے رہے ہیں[5] جس کی رد شیعوں کے امام محمد باقر نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "اگر یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کریں تو وہ اپنے مذہب کی دعوت دینگے مسلمانوں کو صحیح راستہ کب بتلائیں گے"۔ ان حقایق کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک بجا ہے کہ شیعیت یہود سے ماخوذ ہے اور سنیت اس طرح نہیں ہے؟ کیا اس کے لئے رجال کشی کا ایک مجہول الاسم نقل و قول اور مخالفین شیعہ کی طرف منسوب شدہ مزعومہ ثبوت کے لئے کافی ہو سکتا ہے جبکہ خود کشی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ "روی عن الضعفاء کثیرا" انھوں نے ضعیف اشخاص سے بہت روایات نقل کئے ہیں اور ان کی کتاب رجال کی نسبت معلوم ہے "ان فیہ اغلاط کثیرۃ" یہ کہ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں[6]۔

اسی طرح تحریف قرآن کے متعلق جمہور شیعہ کا یہ عقیدہ بار بار روشنی میں آچکا ہے کہ وہ اس میں کمی زیادتی کے قایل نہیں ہیں اور قائلین تحریف بعض اخباری علماء ہیں جو شیعوں میں "اہل حدیث" کی حیثیت رکھتے ہیں اور محققین کے زمرہ میں نہیں شامل ہیں۔

جمہور شیعہ کی طرف تحریف قرآن کی نسبت یہ ایک ایسا غلط تخیل ہے جس کی غلطی کا احساس بعض انصاف شیوہ محقق علمائے اہل سنت نے بھی کیا ہے چنانچہ علامہ مہاجر شیخ رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں اس سلسلہ میں متقدمین و متاخرین علمائے شیعہ کے اقوال نقل کرنے کے بعد صاف تحریر کیا ہے کہ:۔ "فظہر ان المذہب المحقق عند علماء الفرقۃ الامامیۃ الاثنی عشریۃ ان القرآن الذی انزل اللہ علی نبیہ ھو ما بین الدفتین وھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک"۔ "گذشتہ تصریحات سے ظاہر ہوا کہ تحقیقی مسلک علمائے فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کا یہی ہے کہ قرآن جسے خدا نے اپنے نبی پر نازل کیا ہے وہ یہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان موجود ہے اور وہ وہی ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اصل میں اس سے زیادہ نہیں ہے"۔

پھر لکھا ہے:۔ "والشرذمۃ القلیلۃ منہم التی قالت بوقوع التغییر فقولہم مردود عندھم ولا اعتداد بہ فیما بینہم"۔ "ایک بہت چھوٹی جماعت ان میں سے جو تغیر واقع ہونے کی قائل ہے ان کا قول علمائے شیعہ کے نزدیک ناقابل قبول ہے اور لائق اعتبار نہیں ہے"[7]

عصر حاضر کے مشہور امیر البیان کاتب الشرق امیر شکیب ارسلان نے بھی لکھا ہے:۔ "ان بعض الغلاۃ من الشیعۃ لا جمہورھم یزعمون ان القرآن الکریم ایضاً حذف منہ واضیف الیہ"۔ "بعض اشخاص غلاۃ شیعہ میں نہ جمہور اس کے قائل ہیں کہ قرآن کریم میں بھی کمی و زیادتی ہوئی ہے"[8]

---

[1] مشکوۃ مطبوعہ اصح المطابع صفحہ ۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ۔ [2] کنز العمال مطبوعہ حیدرآباد جلد ۱ صفحہ ۱۵۔ [3] مشکوۃ مطبوعہ اصح المطابع صفحہ ۳۲۔ [4] سورہ انبیاء پ ۱۷۔ [5] لباب التاویل خازن ج ۴ صفحہ ۲۳۴۔ معالم التنزیل بغوی برحاشیہ تفسیر خازن صفحہ مذکورہ۔ [6] مستدرک الوسایل ج ۳ ص ۵۲۹۔ [7] اظہار الحق ج ۲ ص ۸۹۔ [8] مقدمہ کتاب النقد التحلیلی لکتاب الادب الجاہلی الاستاد محمد احمد الغمراوی مطبوعہ قاہرہ ص ۳۱۔

جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ کا رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" جو امامیہ مشن لکھنؤ سے شایع ہوا ہے اس باب میں سند قطعی ہے اور شاید اسی رسالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ:- "تمام جمہور شیعہ موجودہ قرآن مجید کو کامل اور اکمل اور صحیح مانتے ہیں چنانچہ میں نے لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب کی ایک واضح کتاب موجودہ ترتیب کی تائید میں پڑھی ہے جو اُردو زبان میں ہے اور اس کے مصنف بھی موجود ہیں اور وہ کتاب بھی موجود ہے"[1]

اس حقیقت کی موجودگی میں اس مسئلہ کو اُٹھانا اور فصل الخطاب کی عبارت کو جس کے مصنف خود اہلحدیث میں سے تھے اور مجتہد نہیں تھے اپنا مستند قرار دینا یا بعض روایات سے جن کی سند و دلالت شیعوں کے نزدیک تسلیم نہیں ہے تمسک کرنا صرف مناظرانہ سخن پروری ہے حالانکہ خود اہلسنت کے روایات سے قرآن رسالتمآب کے زمانہ میں جمع نہیں ہوا تھا اور وہ مجموعی طور پر اسوقت کسی کو یاد بھی نہیں تھا اور اس میں ایسی آیتیں بھی موجود ہیں جو متواتر نہیں ہیں بلکہ صرف کسی ایک صحابی کے پاس تھیں اور اس کے اعتماد پر لکھی گئی ہیں[2]۔ اور بہت آیتیں شاہدین عادلین کی گواہی سے درج کی گئیں[3]۔ اور کسی ایک صحابی کی بیان کی ہوئی آیت اسوقت تک درج نہ کی جاتی تھی جب تک کوئی دوسری گواہی نہ مل جائے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن تمام صحابہ میں سے ہر ایک کے بیان کردہ آیات قرآن میں درج نہیں ہیں اس لئے ان صحابہ کے ذاتی رائے میں یہ قرآن ناقص ہی قرار پاتا ہوگا[4]۔ صحابہ کرام نے رسالتمآب کے بعد اپنی اپنی یادداشت پر قرآن کی ترتیب دی لیکن ان صحابہ کے جمع کردہ مصاحف ترتیب کے لحاظ سے بالکل مختلف تھے[5]۔ قرآنی آیات میں بعض صحابہ ایسے اضافہ کرتے تھے جو موجودہ قرآن میں موجود نہیں ہیں[6]۔ اور اکثر کلمات میں صحابہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے یعنی کوئی کچھ پڑھتا تھا اور کوئی اُس کے خلاف کچھ اور[7]۔

حضرت عثمان نے ان تمام مختلف مصاحف اور قرأتوں کو جمع کرکے ان میں ایک کو اختیار کرکے باقی سب قرآنوں اور صحفوں کو جلوا دیا۔ اور باوجودیکہ پہلی مرتبہ جمع قرآن میں پوری کاوش ہو چکی تھی لیکن اس موقع پر پھر جمع قرآن کے وقت بعض آیتوں کی کمی کا پتہ چلا جو ایک صحابی کے اعتماد پر لکھی گئیں[8]۔ اس کے علاوہ الفاظ میں بعض غلطیاں تھیں جنھیں درست کیا گیا[9]۔ بعض جگہ کی آیتوں کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص شخص کے پاس ہیں اور وہ شہر میں موجود نہیں ہے تو ان آیتوں کی جگہ چھوڑ دی جاتی تھی کہ جب وہ شخص واپس آئے تو اس سے پوچھ کر لکھی جائیں[10]۔ نسخہ اصل اجزائے قرآنی کا جو ام المومنین حفصہ کے پاس موجود تھا حضرت عثمان نے منگوا کر پانی سے دھلوا ڈالا[11]۔ ام المومنین عایشہ کے نزدیک اس قرآن میں کتابت کی غلطیاں ہیں[12] نیز اس کے الفاظ میں تحریف ہوئی ہے ابن عباس اور سعید بن جبیر بھی اسی کے قایل تھے[13]۔ نیز یہ کہ اس میں حضرت عثمان کے ہاتھوں تغیر و تبدل ہوا ہے[14] اور قرآن کا کثیر حصہ حضرت عثمان کو نہ مل سکا[15] اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہمیں سب قرآن مل گیا کیونکہ اس کا کثیر حصہ تلف ہو چکا ہے[16]

اب ان روایات کی موجودگی میں کیا یہ کہنے میں کسی طرح کی شرمندگی نہ ہونا چاہئے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور اہل سنت نہیں ہیں، اگر صرف روایات ہی کا موجود ہونا عقیدۂ تحریف کی دلیل ہے تو اہل سنت بھی تحریف کے معتقد ہیں اور اگر اعتقاد پر مبنی ہے تو شیعہ بھی تحریف قرآن کے عقیدہ سے بالکل بری ہیں اور اس کے جمہور کی طرف اس اعتقاد کی نسبت ہرگز درست نہیں ہے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان تمام الزامات کو فرقہ شیعہ کے بارے میں صحیح مان لیا جائے تو بھی اس کا نفس مسئلہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ بحث خلافت امیر المومنین سے ہے۔ فرض کر لیجئے کہ شیعوں کا عقیدہ بداء کے بارے میں غلط ہے ائمہ کو مساوی رسول سمجھنے میں باطل

---

[1] منادی دہلی، ۲۸ اگست سنہ ۱۹۳۶ء۔ [2] صحیح بخاری مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی صفحہ ۷۴۵۔ [3] اتقان ج ۱ ص ۶۰ مطبوعہ مصر۔ [4] اتقان ج ۱ ص ۵۹۔ [5] اتقان ج ۱ ص ۶۲۔ [6] صحیح بخاری (مناقب ابن مسعود) مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی صفحہ ۵۳۲ و باب من القی لہ وسادہ ص ۹۱۹۔ [7] بخاری کرزن پریس ص ۷۴۵ و تفسیر جامع البیان طبری مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۰۔ [8] بخاری صفحہ ۷۴۶۔ [9] اعجاز القرآن رافعی مطبوعہ مصر ص ۴۶۔ [10] جامع البیان طبری جلد ۱ صفحہ ۲۱۔ [11] جامع البیان صفحہ ۲۰۔ [12] اتقان مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۸۳۔ [13] اتقان ج ۱ ص ۱۸۴۔ [14] اتقان ج ۲ ص ۲۵۔ [15] اتقان ج ۲ ص ۲۵۔ [16] اتقان صفحہ مذکورہ

تحریفِ قرآن کے بارے میں ناقابلِ قبول لیکن پھر بھی اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ امیر المومنین رسول کے خلیفہ بلافصل ہونے کے مستحق نہیں تھے اور عقیدۂ امامت غلط ہے۔ جبکہ نگار کے بحث کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک ہندو "سرنام" نے اس حقیقت پر تبصرہ کیا اور ایک وسیع الخیال انسان مدیر نگار نے اس پر محاکمہ لکھا اور ایک ایسے آزاد خیال شیعہ نے اس پر اظہارِ خیال کیا جو خلافت امیر المومنین کے مسئلہ میں باقی گیارہ اماموں کی امامت کو بھی معرضِ بحث میں لانے پر آمادہ نہیں ہے اور غیبتِ مہدی موعود ایسے مسئلہ کی تصدیق کی ذمہ داری تک اپنے سر نہیں لیتا تو بتائیے اس جگہ شیعوں کے دیگر صحیح یا غلط عقاید کو جو مختلف فیہ ہیں محلِ بحث میں لانے سے فائدہ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ شیعی تبصرہ نگار یا ہندو محقق ان تمام شیعی عقاید کو واقعی غلط سمجھتا ہو لیکن پھر بھی اس حقیقت کو مانتا ہو کہ رسول اللہ نے حضرت علی کو اپنے بعد کے لئے خلافت کے واسطے نامزد کیا۔

مسئلۂ خلافت وامامت کی بحث میں جو ایک مخصوص موضوع ہے ان مباحث کا چھیڑنا ہرگز ہرگز اپنے موضوع بحث کی کوئی صحیح خدمت نہیں قرار پا سکتی، بلکہ یہ شبہ پیدا کرنے کا موجب ہے کہ اصل موضوع میں اپنی استدلالی بے مایگی کا احساس تھا اس بنا پر ان غیر متعلقہ مباحث کو بیچ میں لایا گیا۔

تیسری کمزوری، مناظرانہ تعریضات پر مشتمل ہونا۔ یہ بھی اس مضمون میں موجود ہے، چنانچہ عصمت پر بحث کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"چونکہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بہت کم پائے جاتے ہیں اسلئے میں ان کی کتابوں سے رسول کے سہو و نسیان کی بابت کوئی ثبوت نہ پا سکا۔" مجھے اس تعریض کے سلسلہ میں افسوس کے ساتھ یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ شیعوں کی کتابوں میں رسول اللہ کی نسبت ایسے حالات ہرگز نہیں پائے جاتے کہ:۔

"رسول اللہ قبل بعثت خود بھی اصنام کی قربانی کے ذبیحہ کو کھاتے تھے اور اپنے مہمانوں کو بھی پیش کرتے تھے جس پر بعض مہمانوں نے (جو موحد تھے) عذر کیا کہ ہم اصنام کے ذبائح کا استعمال نہیں کر سکتے" (بخاری مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۲۸ھ جلد ۲ صفحہ ۲۰۶ و ۲۰۷) "آنحضرت کے پاس بعثت کے موقعہ پر فرشتہ آیا تو آپ ڈر گئے اور بدحواسی کی باتیں کرنے لگے اور کسی طرح یہ نہ سمجھے کہ آپ مبعوث برسالت کئے گئے ہیں یہاں تک کہ آپ نے اپنی زوجہ حضرت خدیجہ سے آکر فرمایا اب مجھے اپنی جان کی خیر معلوم نہیں ہوتی" (بخاری جلد ۱ صفحہ ۳) "رسول اللہ نے مشرکین کے خوش کرنے کے لئے اس بات کی تمنا کی کہ کچھ آیات ان کی مرضی کے مطابق بھی نازل ہو جائیں اور شیطان نے اس سلسلہ میں بتوں کی تعریف کی آیتیں آپ کی زبان پر جاری کر دیں جنھیں آپ نے قرآنی آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا اور سب نے سنا" (تفسیر طبری مطبوعہ مصر جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۱ – ۱۳۴ – جلالین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ صفحہ ۲۸۲ – کشاف مطبوعہ مطبع شرقیہ مصر سنہ ۱۳۰۸ھ جلد ۲ – صفحہ ۶۵) "رسول اللہ نے عرب کی ایک عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ سنکر اُسے مدینہ سے باہر ایک جگہ بلوا بھیجا اور اس سے اپنے مطلب کا اظہار کیا تو وہ خدا کی دُہائی دینے لگی" (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ سنہ ۱۳۲۸ھ ج ۴ – ص ۲۸) – "آپ نے جونیہ کو مدینہ کے باہر ایک باغ میں بلوایا جہاں وہ اپنی دایہ کے ساتھ آئی آپ نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنا نفس آپ کو ہبہ کرے تو اس نے کہا کہ ایک شاہزادی کی شان یہ نہیں ہے کہ ایک بازاری آدمی کو اپنا نفس ہبہ کر دے آپ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ دہائی دینے لگی (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ سنہ ۱۳۲۸ھ ج ۴ ص ۱۰۹)۔ "آپ نے کعبہ کی تعمیر کے موقع پر اپنی لنگی کھول کر اپنے کاندھوں پر رکھ لی اور برہنہ ہوگئے تو غش کھا کر گر پڑے اس کے بعد آپ کبھی برہنہ نہیں ہوئے" (بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۲)۔

"آنحضرت قرآن کی بہت سی آیتوں کو بھول گئے جو بعض صحابہ کے پڑھنے سے آپ کو یاد آئیں (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ ج ۳ ص ۱۵۵) حضرت نے منافق کے جنازہ کی نماز پڑھائی جس پر حضرت عمر نے آپ کا دامن پکڑ کر کھینچا کہ آپ نماز نہ پڑھائیے مگر رسول اللہ نے سماعت نہ کی آخر قرآن کی آیت حضرت عمر کی رائے کے موافق نازل ہوئی (بخاری مطبوعہ مصر ج ۳ ص ۹۲ – ۹۳) – آپ اپنی بیوی حضرت عائشہ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے حبشیوں کا ناچ دکھلاتے تھے (بخاری ج ۱ ص ۶۳)

رسول اللہ روزہ کی حالت میں حضرت عایشہ کے بوسہ لیتے تھے (بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۹۲ وغیرہ وغیرہ) اور ایسے بہت سے حالات جن سے "رنگیلا رسول" ایسی رسوائے عالم کتاب طیار ہوگئی جس کا جواب مسلمانوں کی جانب سے اس کے مصنف کو سزا موت دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بے شک شیعوں کی کتابیں رسول اللہ کے اس طرح کے حالات سے خالی ہیں۔

چوتھی کمزوری یہ ہے کہ اس مضمون کو ان تنقیحات کا پابند بنا کر نہیں لکھا گیا۔ ہے جو جناب مدیر نگار نے سوالات کی صورت سے قایم کئے تھے اور جن کی پابندی کے ساتھ "آزاد خیال شیعہ" نے جواب تحریر کیا تھا۔ معاملہ فہمی اور تحقیق پسندی کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ انہی تنقیحات کی بنا پر بحث کی جاتی لیکن یہ صورت بحث کو محدود بناتی تھی اس لئے بزمی صاحب نے بھی سہولت اسی میں سمجھی کہ خود مستقل تنقیحات قایم کرکے ان پر گفتگو کریں اور "م ح" صاحب نے بھی فلاح و نجاح کا رمز اسی میں مضمر خیال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے مقالہ کے اکثر اجزاء بالکل نظر انداز کر دئے گئے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔

مجھے چونکہ بزمی صاحب اور "م ح" دونوں بزرگواروں کے ارشادات پر نظر ڈالنا ہے اس لئے میں ان دونوں مقالوں سے باعتبار مجموعی جو مباحث پیدا ہوتے ہیں انھیں تنقیحات کی صورت سے درج کرتا ہوں اور پھر ان پر ترتیب وار تبصرہ کروں گا۔

تنقیحات (۱) "عصمت انبیا" زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہونا چاہئے یا اس میں تفریق کی گنجایش ہے۔ (۲) نظام خلافت کے متعلق "عقل عمومی" یا "حاسہ اجتماعیہ" کا تقاضا کیا ہے اور کیا شیعی اُصول اُسکے خلاف اور سُنّی اُصول اسکے مطابق ہے۔ (۳) استحقاق خلافت کے شرائط کیا ہیں، اور کیا وہ خلفائے ثلثہ میں مجتمع تھے اور حضرت علی میں مفقود۔ (۴) آیات سے استدلال کا معیار اور اخبار و احادیث کا درجہ۔ (۵) حضرت علی کی رائے خلفائے ثلثہ کے بارے میں۔ (۶) سُنّی شیعہ اختلاف میں سیاسی اغراض کی کارفرمائی۔ (۷) کیا نفرت و عناد کی اسپرٹ شیعی مذہب کی وہ خصوصیت ہے جو اسکے اصلاحی یا الہامی ہونے کے خلاف ہے۔

تنقیح اول

عصمت انبیاء میں تعمیم و تخصیص

نیاز صاحب نے اپنے محاکمہ میں اس کا اقرار کرتے ہوئے کہ "رسول اللہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیر خلیفہ قرار پائیں" یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ رسول سے اس بارے میں خطاء اجتہادی ممکن ہے انھوں نے عصمت کے مفہوم کو گناہوں سے محفوظ ہونے میں محدود قرار دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسانی کمزوری ہے جو بھول چوک اور اجتہادی غلطی ہوا کرتی ہے اس سے رسول بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

میں نے اپنے تبصرہ میں جو اس محاکمہ سے متعلق تھا بالکل عقلی حیثیت سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول کا جس طرح گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے اسی طرح انھیں اس طرح کی غلطیوں سے بھی محفوظ ہونا چاہئے۔

میں نے واضح کیا تھا کہ دنیا کے ہر شعبہ میں جس طرح کی عصمت ڈھونڈھی جاتی ہے وہ یہی عصمت ہے اور اس طرح اسی کو رسول میں مکمل طور پر ہونا چاہئے۔ آخر میں میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو لوگ رسول سے خطاء اجتہادی کو ممکن قرار دیتے ہیں وہ بھی اس بات کے قایل ہیں کہ خدا رسول کو اس غلطی پر برقرار نہیں رہنے دیتا بلکہ اصلاح کر دیتا ہے اس لئے اگر خلافت علی بن ابیطالب کے متعلق رسول کی ذاتی رائے بھی تھی تو خدا کو اس کی اصلاح کرنا چاہئے تھی نہ کہ رسول کی اس خطاء اجتہادی کی اپنی جانب سے اور تقویت کی جائے۔

بزمی صاحب نے تقریباً میری اس بحث سے بالکل اتفاق کیا ہے چنانچہ انھوں نے مدیر نگار کی رائے کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:۔ "ممکن ہے یہ دلیل صحیح ہو لیکن اسے موجودہ بحث سے متعلق کرنا میرے نزدیک صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انبیاء سے بھول چوک ہو سکتی

تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ کسی ایسے اہم مسئلہ میں بھی انبیاء سے مسلسل غلطی ممکن ہے جس کا تعلق مذہب کی اساس سے ہو۔ اور جس غلطی کی وجہ سے ملت کا شیرازہ منتشر ہو جائے، تلواریں نیام سے کھنچ جائیں اور ابدالآباد تک کے لئے ایک نہ ختم ہونے والا افتراق و انتشار کھڑا ہو جائے۔"

جناب م ح کا بھی شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں میری بحث کی کامیابی کا اعتراف کیا ہے لیکن پھر بھی ایک پہلو افتراق کا نکالکر خود اظہار خیال فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں :- "اخفار حقیقت ہوگا اگر میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ اس مسئلہ پر صاحب تبصرہ نے معقولیت کے ساتھ بحث کرنے میں بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ ذاتی طور سے مجھے ان خیالات سے چنداں اتفاق نہیں ہے اور میں اس مسئلہ میں ایک حد تک نیاز صاحب کے نظریہ کی تائید کروں گا۔"

"درحقیقت اس مسئلہ میں الفاظ کی نزاکت کے باعث التباس پیدا ہو گیا ہے صرف دو چیزیں ہیں گناہ اور خطاء اجتہادی بھول چوک کو بھی اسی خطاء میں داخل سمجھا گیا ہے حالانکہ یہ ایک علٰحدہ امر ہے۔ گناہ کی بابت محاکمہ اور تبصرہ دونوں میں بالاتفاق اعتراف کیا گیا ہے کہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں میرے نزدیک بھی یہ درست ہے خطاء اجتہادی اور بھول چوک میں اختلاف ہے۔ نیاز صاحب کے نزدیک انبیاء سے خطاء اجتہادی کا وقوع و صدور ممکن ہے اور بھول چوک بھی منافی عصمت نہیں صاحب تبصرہ کو اس سے اختلاف ہے وہ خطاء اجتہادی کو ہی ناممکن الوقوع سمجھتے ہیں (میں ناممکن کا اسی معنی میں استعمال کر رہا ہوں جو صاحب تبصرہ نے بیان کئے ہیں) ان کے پاس اس کے لئے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر نبی سے امکان خطاء و نسیان اور اس کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے شریعت سے اطمینان و اعتبار ساقط ہو جاتا ہے اور پھر یہ سارا بنا بنایا گھروندا دم کے دم میں ڈھیر نظر آئے گا۔ حالانکہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

رسول کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو خالق سے وابستگی کی صورت میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو بہ حیثیت اُسکے بندہ ہونے کے بندوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ خالق سے اُس کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الٰہیہ کو صحیح طریقہ سے حاصل کرکے باحسن وجوہ اس کو بندوں تک پہونچا دے اسی حیثیت کا اصطلاحی نام رسالت ہے۔ لیکن اس رسالت کے مسئلہ میں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ رسول کے لئے دو امر ضروری ہیں اول اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح یعنے احکام الٰہیہ کو اچھی طرح سمجھ کر لینا اور پھر اس کی صحیح طریقہ پر نشر و اشاعت کرنا۔

دوسری حیثیت نبی کی وہ ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان اور جملہ لوازمات انسانیہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے اس حیثیت کو بشریت کہتے ہیں اس امر کے واضح ہونے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ عصمت نبی کی کس حیثیت کے لئے ضروری ہے آیا رسالت اور بشریت دونوں کے لئے یا صرف رسالت کیلئے میرے خیال میں رسالت کے لئے عصمت ضروری ہے اور اس کا اعتراف سب کو ہے وہ گناہ نہیں کر سکتا وہ خدا سے غلط احکام نہیں حاصل کر سکتا اور نہ اس کو غلط طریقہ سے وہ دوسروں تک پہونچانے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ البتہ بشریت کے لئے میرے نزدیک عصمت ضروری نہیں ہے۔ یعنے نبی سے کوئی ذاتی امور کہ جو اسی حیات دنیوی یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں کبھی لغزش ہو جائے تو اس کا کوئی مضر اثر عصمت رسالت پر نہیں مرتب ہوگا ٹھیک اسی طرح جیسا کہ صاحب تبصرہ نے قابل وکیل اور حاذق طبیب کی تمثیل پیش کی ہے، بے شک ماہر قانون داں وہی سمجھا جائے گا جو پیروی مقدمات کے بارے میں غلطی کرتا ہی نہ ہو یا غلطی ہو جاتی ہو لیکن کم از کم طبیب حاذق کے لئے ضروری ہے کہ وہ تشخیص امراض و تجویز علاج میں خطا نہ کرتا ہو یا بہت کم کرتا ہو۔ یقیناً کم کی قید ہم اپنی انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں اگر خدا کسی طبیب حاذق کو معین کرے تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ایسا طبیب کم از کم بھی غلطی نہیں کر سکتا تشخیص امراض میں نہ تجویز علاج میں لیکن ایسے طبیب کے لئے یہ تو ضروری نہیں قرار دیا جائیگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں غلط روی سے معصوم ہو جہاں تک اسکی حذاقت طبابت کا تعلق ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی قدم جادہ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا باوجود اسکے وہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں اگر لغزش کر جائے تو اس سے اُس کی حذاقت طبابت پر کوئی حرف نہیں آسکتا ہے اس تقریر سے میرا صرف یہ مقصد ہے کہ انسان کے لئے کسی امر واحد میں کمال اس کو مستلزم نہیں کہ وہ جملہ کمالات کا حامل ہو ٹھیک اسی طرح رسالت کا مسئلہ ہے۔ رسول خدا سے احکام حاصل کرتا ہے اور بندوں تک پہونچاتا ہے اس کے لئے عصمت لازم و مسلم ہے اور اس عصمت پر کوئی دھبہ نہ آسکے گا اگر وہ اپنے دنیاوی امور بشریت میں کوئی لغزش کر جائے، بشریت کی بار بار قید کا

اضافہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ کہیں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ نبی اخلاقی غلطی مثلاً کذب و سرقہ وغیرہ کا ارتکاب کر سکتا ہے واضح رہے کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے اخلاقی غلطی تو گناہ کے حدود میں داخل ہے اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ امر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نبی معصوم رہتا ہے۔

اہلسنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے جس کو میں اوپر پیش کر چکا۔

ان خیالات کا جائزہ لینے میں مجھے اندیشہ ہے کہ بعض ان مطالب کے اعادہ کی ضرورت پڑے جو گزشتہ مقالہ میں توضیح کے ساتھ لکھے جا چکے اسلئے ناظرین سے پرزور استدعا کرتا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ اس مقالہ کے اس حصہ کو غور سے ملاحظہ فرمالیں شاید بعض ایسے نکات کی طرف خود اُن کا ذہن منتقل ہو جائے جو اس بحث میں مفید نتیجہ بر آمد کر سکتے ہیں۔

حقیقتاً لائق مضمون نگار نے مدیر نگار کے نظریہ کی تائید نہیں کی ہے بلکہ ایک بین بین راستہ اختیار کرنا چاہا ہے جو مدیر نگار اور آزاد خیال شیعہ دونوں کے مسلک سے علیحدہ ہے مدیر نگار گناہ اور خطاء اجتہادی میں تفریق کرتے تھے پہلی صورت کو نبی کے لئے غیر ممکن اور دوسری صورت کو قابل وقوع قرار دیتے تھے انھوں نے خطاء اجتہادی یا بھول چوک کو خود لوازم انسانیت سے بتایا تھا اسی لئے وہ نبی کی انسانی حیثیت کو جواز وقوع خطاء و نسیان کی سند بتا رہے تھے۔

آزاد خیال شیعہ نے جو کچھ لکھا تھا وہ اُن کے مقابلہ میں اس امر کو ثابت کر دینے کے لئے کافی تھا کہ جس طرح ایک نبی کو گناہ سے محفوظ ہونا چاہئے اسی طرح خطاء اجتہادی سے بھی اور یہ دکھلایا تھا کہ خطاء اجتہادی کا عدم وقوع یا غیر ممکن ہونا رسول کی انسانی حیثیت میں کسی نقص کا باعث نہیں ہے بلکہ اسی انسانی حیثیت کے کمال کا نتیجہ ہے۔ جناب م ح خطاء اجتہادی کے بارے میں زندگی کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے تفریق کر رہے ہیں وہ مسائل شرعیہ اور احکام مذہبیہ میں جو رسالت کی حیثیت سے متعلق ہیں خطاء اجتہادی کو غیر ممکن بتاتے لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو رسول کی انسانی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اس کو ممکن قرار دے رہے ہیں۔ یہ مسلک ممکن ہے ظاہری حیثیت سے خوش آیند یا دل کو لگتا ہوا معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ استدلالی و عقلی حیثیت سے وہ اس سے زیادہ کمزور ہے جتنا کہ نفی مطلق یعنے خطاء اجتہادی کو کلیتہً رسول کے لئے ممکن قرار دینے کا مسلک۔

رسالت اور انسانیت بے شک دو مختلف حیثیتیں ہیں لیکن چونکہ ان دونوں کا اجتماع ایک شخص میں ہوتا ہے جسے کہتے ہیں رسول اس لئے اس شخص کی انسانیت کا معیار وہ قائم ہونا چاہئے جو اس کی رسالت کے درجہ کے منافی نہ ہو۔ چونکہ ایک پست انسان جو بہت سے اُن نقائص و عیوب میں مبتلا ہو جنھیں کمال انسانیت کی صورت میں نہ ہونا چاہئے بظاہر یہ استحقاق نہیں رکھتا کہ اُسے رسالت کا ایسا ذمہ دارانہ منصب عطا کر دیا جائے اس لئے رسول کی انسانیت اس درجہ کی ماننا پڑے گی جو ان نقایص سے بلند ہو۔ جبکہ خطاء اور غلطی ایک انسان کے نقایص میں ضرور داخل ہے اور اسی لئے ایک رسول کے لئے مدیر نگار کو بھی اُسے ”بہت کم“ قرار دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور اس کی کمی اسی انسانیت کے درجہ کے کمال کا نتیجہ ہے جو رسول کے لئے ہر انسان ماننے پر مجبور ہے اور یہ بات مضمون نگار نے تسلیم کی ہے کہ ”کم“ کی قید ہم انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں۔ اگر خدا کسی کو عہدہ عطا کرے تو یقیناً وہ عہدہ دار ”کم سے کم“ کبھی غلطی نہیں کر سکتا ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول کو ”کم از کم“ غلطی بھی نہ کرنا چاہئے ورنہ یہ اس کے درجۂ انسانی کا نقص ہو گا جو اس کی رسالت کے شایان نہیں ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ رسول کی ذات میں ”مفہوم منطقی“ کے لحاظ سے اگرچہ رسالت اور انسانیت دو مختلف حیثیتیں ہیں لیکن رسالت کے مفہوم کو ”مرسل الیہم“ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ان کے انسانی زندگی ہی کے شعبوں سے متعلق ہے کیونکہ اُن میں علاوہ انسانیت کے اور کوئی حیثیت نہیں ہے یعنے رسالت کا مفاد ان تمام انسانوں کی انسانیت ہی کی اصلاح ہے۔ اس لئے رسول کی انسانی زندگی ہی کے حالات اقوال و افعال ان تمام اشخاص کے لئے نمونہ بن سکتے ہیں۔

اب اگر رسول اپنی عام زندگی کے حالات میں عام اشخاص ہی کے مانند ہوئے اور ان میں کوئی بلندی حاصل نہ ہوئی تو اگرچہ وہ رسالت کی حیثیت سے کوئی مخصوص بات رکھتے بھی ہوں تو اُسے عام اشخاص پر حجت نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ وہ تو انسانی ہی زندگی کے حامل ہیں اور رسول کی پیروی انسانی ہی زندگی کے شعبوں میں کر سکتے ہیں۔ جبکہ ان شعبوں میں رسول سے غلطیاں ممکن ہوئیں اور بے راہ روی کا احتمال پیدا ہوا تو مفاد رسالت رخصت ہو گیا اور رسول کی ذات انسانی زندگی کے شعبوں میں رہنمائی سے قاصر رہی۔

اس بات میں قابل وکیل اور حاذق طبیب کی تمثیل درست نہیں ہے اس بنا پر کہ قابل وکیل اور حاذق طبیب کا کام صرف کسی ایک شعبہ سے متعلق ہے

اور رسالت زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہوتی ہے۔

بے شک چونکہ قابل وکیل اور حاذق طبیب کی نسبت مضمون نگار نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر اُسے خدا مقرر کریگا تو وہ اس شعبہ میں "کم سے کم" بھی غلطی نہیں کرسکتا اور اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا لہٰذا اس تمثیل کا نتیجہ یہ برآمد کرنا چاہئے کہ چونکہ رسالت زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے اور وہ خدا کی جانب سے ہوتی ہے اس لئے رسول سے کسی شعبۂ زندگی میں غلطی نہیں ہوسکتی اور اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ کہا جاتا ہو کہ "رسول کے لئے دو امر ضروری ہیں اول اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح" لیکن یہ امر نظر انداز ہوگیا کہ نشر کے دو طریقہ ہیں ایک قول۔ دوسرے عمل، اور رسول کی تمام زندگی منقسم ہے انہی ابواب پر۔ جب انہیں صحت ضروری ہوئی تو اب آخر غلطی قدم کہاں رکھیگی۔

اس صورت میں کہ جب مذہب اور شریعت میں فرق قرار دیا جائے یعنے مذہب نام اُن عقیدت مندانہ مظاہرات کا ہو جو بندہ کو اپنے خدا سے وابستہ کرتے ہیں۔ اور شریعت قوانین اجتماعی و معاشرتی کا جنھیں مدیر نگار ایسے بہت سے روشن خیال افراد اسلام کے قابل تبدیلی احکام میں داخل سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک شعبہ تقسیم کیا جائے سیاسیات کا جو جمعیت اسلامیہ کے داخلی و خارجی انتظامات و تعلقات سے متعلق ہے جس کے ایک مستقل چیز ہونے کا ترشح بھی جناب نیاز کے مختلف تحریرات اور نیز موجودہ بعض مضامین کے رجحانات سے ہوتا ہے۔

اس صورت میں بے شک رسول کے لئے متعدد حیثیتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ وہ عقاید و اُصول مذہب کے پہونچانے کی حیثیت سے ایک مبلّغ ہیں۔ قوانین اجتماعی و معاشرتی کے اعتبار سے ایک مقنن اور سیاسیات کے اعتبار سے ایک حاکم و منتظم۔

لیکن بہر حال حیثیتیں تمام اُن کی رسالت ہی کے اندر مضمر ہیں یعنے منجانب اللہ ہی ہیں۔ اسی لئے اگرچہ دوسری دونوں قسموں کے قوانین و احکام کو رسول کے بعد آنے والے اوقات و حالات میں کبھی قابل تبدیلی بھی خیال کیا جائے لیکن اس کا شاید کوئی بھی قایل نہیں ہے کہ اگر رسول کی حیات میں کوئی دوسرا شخص کوئی قانونی حکم نافذ کرے تو وہ رسول کے حکم کے مقابلہ میں قابل عمل ہوگا یا کوئی دوسرا شخص رسول کو مقہور و مغلوب بنا کر مسلمانوں پر تسلط حاصل کرنا چاہے تو اُس کا یہ فعل صحیح و جائز ہوگا۔

تیسری حیثیت رسول کی کم از کم وہ ہے جیسے طالوت کو خدا نے بادشاہ مقرر کیا جس کا تذکرہ قرآن میں ہے:۔ (قال لہم نبیہم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا) اور جس کو مضمون نگار نے بھی اپنے اسی مقالہ میں درج کیا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ طالوت کو صرف وہی حیثیت حاصل تھی اور رسول کو اس کے ساتھ دو حیثیتیں اور بھی حاصل ہیں۔ ایک تبلیغ عقاید کی اور دوسرے اجرائے احکام کی۔

اب چونکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ خدا جس عہدہ پر کسی کو مقرر کرے گا وہ کم از کم اپنے شعبہ میں غلطیوں سے ضرور بری ہوگا لہٰذا جب رسول، خدا کی طرف سے مبلغ عقاید ہیں تو عقاید کے بارے میں غلطی کے مرتکب نہیں ہوسکتے اور جب احکام شرعیہ کے مقنن ہیں تو شرعی احکام میں غلطی نہیں کرسکتے اور جب خدا ہی کی طرف سے ایک سیاسی فرمانروا یعنے بادشاہ ہیں تو سیاسیات میں بھی اُنکا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔

اس طرح اگر خلافت کے مسئلہ کو سیاسی چیز بھی مانا جائے تب بھی اُس میں غلطی کا امکان رسول سے نہیں ہے اور یہی اس بحث کی اصلی بنیاد ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر شعبوں کی تفریق خطا اجتہادی اور غلطی میں، فایدہ بخش ہوسکتی ہے تو گناہ کے لئے کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ رسول گناہ بالکل نہیں کرسکتا بالکل اُسی طرح جیسے وہاں مثال پیش کی گئی ہے، بے شک ایک حاذق طبیب کا علاج اُس وقت نہ کرنا چاہئے جب وہ جان بوجھ کر نسخہ غلط لکھتا ہو یا تشخیص مرض میں کوتاہی کرتا ہو اور ایک قابل وکیل کی طرف اُس وقت رجوع نہ کیجائے جب وہ پیروی میں عمداً خرابی کر رہا ہو اور موکل کو نقصان پہونچا دیتا ہو لیکن اگر ایسا نہیں ہے۔ وہ پیروی مقدمات میں کوئی خرابی نہ کرتا ہو۔ تشخیص امراض و تجویز علاج میں کسی کوتاہی یا ضرر رسانی کا ارتکاب نہ کرتا ہو لیکن اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ ایک گناہگار انسان ہو۔ وہ بہت سے اخلاقی معاصی کا مرتکب ہو تو اس سے اُسکی وکالت یا طبابت پر تو حرف نہیں آسکتا۔ اسی طرح جبکہ ایک نبی کے لئے از بس ضروری ہے اخذ صحیح اور نشر صحیح تو اُس کی صداقت کا معیار یہی ہونا چاہئے کہ وہ اخذ و نشر میں تقصیر و کوتاہی اور غلط بیانی سے کام نہ لیتا ہو لیکن اپنے ذاتی امور میں جو اسی حیات دنیویہ یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق

رکھتے ہیں اس میں اگر کبھی گناہ ہو جائے تو اُس کا کوئی مضر اثر عصمت رسالت پر مرتب نہیں ہونا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ گناہ چونکہ ارادی و اختیاری چیز ہے اس لئے اس میں تو یہ تفریق ممکن بھی ہے کہ کوئی انسان ایک شعبہ میں گناہ کا مرتکب ہو اور دوسرے میں نہ ہو لیکن خطاء اجتہادی یا سہو و نسیان میں اس تفریق کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

بھول چوک اور غلطی کوئی ارادی فعل نہیں ہے جس کا ارتکاب و عدم ارتکاب اور اُس کے دائرہ کا تعین کسی کے اختیار سے متعلق ہو بلکہ وہ تو حقیقۃً بعض انسانی طاقتوں کے کمال کا ایک سلبی نتیجہ ہے جو اُن طاقت کی کمی اور زیادتی کی صورت میں اسی اعتبار سے مرتب ہوتا ہے۔

انسان کا ایک جوہر ہے اصابت رائے، اس کا نتیجہ ہے خطاء اجتہادی کا نہ ہونا۔ ایک صفت ہے تحفظ و تذکر، اس کا نتیجہ ہے نسیان و سہو سے محفوظ رہنا۔ اب اگر اصابت رائے کی طاقت انسان میں مفقود ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگا اور ہر بات میں خطاء اجتہادی کرے گا اور اگر یہ طاقت موجود ہے تو جس درجہ پر وہ مکمل ہوگی اُتنی ہی خطاء اجتہادی کم ہوگی اور بالکل کامل ہونے کی صورت میں وہ خطا بالکل نہ ہوگی۔

اسی طرح تحفظ و تذکر جتنا زیادہ ہوگا اُتنا ہی سہو و نسیان کم ہوگا اور جب یہ طاقت مکمل ہوگی تو سہو و نسیان معدوم ہو جائے گا ــــ اب اگر ایک شخص ایسا ہے کہ اُس کی اصابت رائے یا تحفظ طاقت ایک متوسط درجہ پر نقص و کمال کے درمیانی حدود میں ہے تو اُس سے اُسی تناسب سے خطاء اجتہادی اور سہو و نسیان کا امکان ہے اور اُس کا وقوع ہر شعبہ میں ہو سکتا ہے ــــ اس میں یہ گارنٹی ہرگز لی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ اس شعبہ میں خطا اور بھول میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اس شعبہ میں نہیں ــــ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اس خطا اور غلطی میں معذور ہوگا کیونکہ اختیاری طور پر نہیں ہے لیکن اُسے پابند بنانے کے کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ جیسے مجتہد، چونکہ وہ غیر معصوم ہے اس لئے احکام شرعیہ کے سمجھنے میں بھی اُس سے غلطی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ صواب و خطا دونو صورتوں میں معذور ہو۔ اگر رسول کی بھی یہی صورت ہو تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دنیاوی اُمور میں تو خطا و نسیان میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن امور رسالت میں نہیں۔ یہ تو صرف الفاظ کا ایک سراب منظر ہے جس میں عقلی اعتبار سے حقیقت ہرگز نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول مبعوث ہوتا ہے رسالت کے ساتھ اپنی عمر کی ایک کافی مدت اُسی قوم میں گزارنے کے بعد۔ رسول پر وثوق و اطمینان پیدا ہوتا ہے اس کے ان حالات کی بناء پر جو رسالت کے قبل دیکھے جا چکے ہیں۔ یہی رمز ہے ہر قوم کی طرف رسول خود اُسی قوم میں سے مبعوث کرنے کا۔

حضرت محمد مصطفےٰ جب چالیس سال اپنی عمر کے ختم کر چکے یعنے شباب کا دور جو عام طور پر لاابالیوں اور بے اعتدالیوں کا ہوتا ہے اپنی قوم کی آنکھوں کے سامنے صرف کر کے کہولت کے دور میں قدم رکھ چکے تو مبعوث برسالت ہوئے اس دور میں آپ نے اپنی سچائی اور امانتداری کا وہ سکہ دلوں پر قائم کیا کہ "صادق و امین" کے لقب سے ملقب ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اسکے قبل کے حالات رسول کے صرف انسانی ہی زندگی سے متعلق ہو سکتے ہیں کیونکہ دوسری حیثیت یعنے رسالت تو ابھی حاصل ہی نہیں ہوئی ہے۔ اب اگر رسول کے ذاتی حالات اپنی انفرادی زندگی میں اس کے قبل یہ بتلاتے ہیں کہ وہ سادہ لوح ہے یعنے غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جسے خطاء اجتہادی کہتے ہیں اور تحفظ و تذکر کی طاقت بھی اس میں ناقص ہے جس کی بناء پر سہو و نسیان سے دوچار ہو جاتا ہے تو بھلا اسکے ادعائے رسالت کے ساتھ اس پر وثوق و اطمینان اور بھروسا کیونکر پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ امور رسالت یعنے اخذ و نشر احکام میں غلطی اور سہو و نسیان میں ہرگز مبتلا نہ ہوگا ــــ یہ تو اُسی وقت اعتماد پیدا ہو سکتا ہے جب اس کی زندگی کے عام حالات یہ بتلاتے ہوں کہ اس میں اصابت رائے اور تحفظ کے جوہر کامل طور پر موجود ہیں اس لئے اس کے اقوال و افعال میں اس قسم کا احتمال نہیں پایا جاتا۔

یہ ہے اس بحث کی تحقیقی حیثیت جو بغیر کسی مناظرانہ آویزش کے واقعہ و حقیقت کی آئینہ بردار ہے لیکن افسوس ہے کہ محترم مضمون نگار نے اسی موقع پر مناظرانہ انداز اختیار کر کے حسب ذیل ترادش شروع فرما دی:۔ "تعجب ہے کہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے اپنے مذہب سے ...... اغماض کرتے ہوئے عصمت انبیاء کے مسئلہ میں اسقدر غلو سے کام لیا ہے حالانکہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں عرض کروں کہ مذہب شیعہ میں تو عصمت نہ الوہیت کے لئے ضروری ہے نہ رسالت کے لئے لازم نہ امامت کے لئے واجب" اسکے بعد روایات نقل کئے گئے ہیں جنھیں اس ادعا کے شواہد میں پیش کرنے کے قابل خیال کیا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ کسی مذہب کی طرف کسی عقیدہ کو منسوب کرنے کی سند اسی مذہب کے معتقدین کے تصریحات و بیانات ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسی روایت جو ڈھونڈ نکالی گئی ہو اور اسے اس عقیدہ کی سند قرار دے لیا جائے کیونکہ ممکن ہے اس مذہب کے معتقدین اس روایت پر عامل نہ ہوں اور وہ اسکی کچھ تاویل کرتے ہوں بے شک وہ روایت اُس مذہب کے معتقدین کے خلاف بطور دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ تمہارا عقیدہ مثلاً اس روایت کے خلاف ہے

اس صورت میں جو کچھ وہ معتقدین جواب دیں اس کے سننے کا انتظار کرنا چاہئے جو ممکن ہے صحیح ہو اور ممکن ہے غلط۔ لیکن اس روایت کے مفاد کو اس مذہب والوں کی جانب بطور عقیدہ منسوب کرنے کا حق کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر یہ ہے کہ شیعہ ہمیشہ خلافت حضرت علی کے دلائل سنی احادیث و روایات سے پیش کرتے ہیں جیسا کہ اس بحث میں بزم آرام صاحب کی جانب سے ایسا کیا گیا اور ہم نے بھی اپنے گزشتہ مقالہ میں اس طرح کے استنادات کئے لیکن کیا ہم یہاں پر یہ صورت بھی اختیار کر سکتے تھے کہ ہم مذہب سنی کی طرف یہ امر منسوب کر دیں کہ وہ حضرت علی کو خلیفہ بلافصل مانتے ہیں اور حضرات خلفائے ثلثہ کو خلیفہ ناحق قرار دیتے ہیں اسلئے کہ انکے یہاں حسب ذیل روایات موجود ہیں

اگر ہم ایسا کرتے تو یقیناً ایک کھلے ہوئے بہتان افترا اور صریح جھوٹ کے مرتکب تھے جس کے لئے اگر ہم فریق مخالف سے "معاف کیا جائے" کے الفاظ میں معافی کی درخواست بھی کرتے تو حق و انصاف کی بارگاہ سے وہ قابل معافی جرم نہ تھا۔

خدا سے غلطی کے وقوع کے لئے بدار کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور خود ہی اسکے معنی لکھے ہیں "ظہر لہ مالم یظہر" (یعنی جو بات معلوم نہ تھی وہ معلوم ہو جائے) لیکن اسکے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ شیعہ اس معنی سے بدار کو خدا کی ذات کے لئے ہرگز جائز نہیں سمجھتے ہیں ملاحظہ ہوں بعض تصریحات

(۱) شیخ صدوق محمد ابن بابویہ قمی کتاب التوحید میں لکھتے ہیں:-

ليس البداء كما يظنه جهال الناس بانه بداء ندامة تعالى الله عن ذلك علواً كبيراً۔

بدار اس طرح نہیں ہے جس طرح ناواقف افراد خیال کرتے ہیں کہ وہ پشیمانی کا نتیجہ ہو خدا کی ذات اس سے بہت بلند و برتر ہے۔

اور شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی نے کتاب الغیبہ میں بدار کی روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:-

والوجه في هذه الاخبار ما قدمناه من تغير المصلحة فيه واقتضائها تاخير الامر الى وقت آخر على ما بيناه دون ظهور الامر له تعالى فانا لا نقول به ولا نجوزه تعالى من ذلك علواً كبيرا

ان احادیث کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں کہ مصلحت کے بدلنے کے ساتھ احکام میں تبدیلی ہوتی ہے نہ یہ کہ خدا کو جو بات معلوم نہ تھی وہ معلوم ہوئی ہو اسکے نہ ہم قائل ہیں اور نہ جائز سمجھتے ہیں خدا کی ذات اس سے بہت بزرگ و برتر ہے

ہندوستان میں مذہب شیعہ کے سب سے بڑے مجتہد مولانا السید دلدار علی طاب ثراہ غفرانمآب تھے انھوں نے اپنی مشہور کتاب عماد الاسلام میں اسکو نہایت وضاحت سے لکھا ہے:

البداء ممدوداً في اللغة بمعنى ظهور راى لم يكن يقال بدا له في هذا الامر بداء اى نشأ له فيه راى كما ذكره الجوهري فلذا يشكل القول بذلك في جناب الحق تعالى لاستلزامه حدوث علمه تعالى بشى بعد جهله وهذا محال ولهذا شنع كثير من المخالفين على الامامية في ذلك نظراً الى ظاهر اللفظ من غير تحقيق مرامهم ونقول في الجواب وبالله التوفيق ان تشنيعات المخالفين علينا اما باعتبار المعنى الظاهر للفظ البداء كما هو الظاهر واما باعتبار ان لفظ البداء لم يطلق في الشرع على علمه وغيره تعالى واما باعتبار عدم صحة المعنى المجازي بالنسبة اليه تعالى اما التشنيع باعتبار الاول فمدفوع بان احداً من علماء الامامية لم يذهب اليه كيف وقد نطقت اخبار الائمة عليهم السلام واقوال قدماء الامامية على خلافه۔

بدار الف ممدودہ کے ساتھ لغت میں اسکے معنی ہیں ایک ایسی رائے کا ظاہر ہونا جو پہلے ظاہر نہ تھی یہ معنی بدار کے صحاح جوہری میں مذکور ہیں اور یہ وہ معنی ہیں جن کے لحاظ سے بدار کی نسبت خدا وند عالم کی طرف دشوار ہے کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ خدا کا علم حادث ہو اور وہ اس سے پہلے ناواقف ہو۔ اسی بنا پر اکثر مخالفین نے اس فرقہ امامیہ کے خلاف طعن و تشنیع سے کام لیا ہے اس لئے کہ انھوں نے صرف اس لفظ کے ظاہری معنی کا لحاظ کیا اور اصلی مقصود کی تحقیق نہیں کی۔ جواب ان کا یہ ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض ہم پر یا تو لفظ بدار کے ظاہری معنی کے اعتبار سے ہے اور بظاہر حقیقت یہی ہے اور یا اس اعتبار سے ہے کہ شرع میں لفظ بدا کا (چاہے وہ کسی دوسرے معنے سے ہو) خدا کے علم یا اس کے فعل کے بارے میں اطلاق نہیں ہوا ہے اور یا اس لحاظ سے ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی بھی خدا کے حق میں درست نہیں ہیں۔ اگر پہلی صورت کے لحاظ سے اعتراض ہے تو وہ بالکل غلط ہے کیونکہ کوئی شخص علماء امامیہ میں سے اس کا قائل نہیں ہے اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے احادیث اور متقدمین علماء شیعہ کے اقوال کے خلاف ظاہر کر رہے ہیں۔

ان تصریحات کے باوجود کیا یہ امانت داری ہے کہ شیخ صدوق کی عبارت کی جو بداء کے ثبوت میں بہ تشریح کی جاتی ہے ان الفاظ میں کہ:-

"نعوذ باللہ من ذالک خدا سے جہل کے باعث غلطی ہوئی اور اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ "اس سے عصمت الوہیت باطل ہوئی"۔

شیعی فرقہ کی معتبر احادیث یہ ہیں۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں:-

من زعم ان اللہ عزوجل یبدو لہ فی شیء لم یعلمہ امس فابرء منہ

جو شخص گمان کرے کہ خدا کی رائے میں تبدیلی رہتی ہے اس طرح کہ اسے کسی شے کا علم حاصل ہو جاتا ہے جو پہلے حاصل نہ تھا اس سے میں برأت کرتا ہوں۔

دوسری حدیث میں آپ ہی کا ارشاد ہے:-

کل امر یریدہ اللہ فھو فی علمہ قبل ان یصنعہ ولیس شیء یبدو لہ الا وقد کان فی علمہ ان اللہ لایبدو لہ من جھل

جس امر کا خدا ارادہ کرتا ہے وہ اسکے علم میں ہوتا ہے اس کام کے کرنے سے پہلے اور کوئی تغیر وہ کا نما میں نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ اسکے علم میں پہلے سے ہوتا ہے بے شک خدا کو بداء جہالت کی وجہ نہیں حاصل ہوتا

تیسری حدیث

مابدا اللہ فی شیء الا کان فی علمہ قبل ان یبدو لہ

خدا کے مقرر کردہ نظام میں کسی شے کی نسبت تغیر نہیں ہوتا مگر وہ اسکے علم میں ہوتا ہے اس تغیر کرنے سے پہلے

چوتھی حدیث امام رضا کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:-

من قال بان اللہ تعالیٰ لا یعلم الشیء الا بعد کونہ فقد کفر

جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ خدا کو شے کا علم نہیں ہوتا جب تک وہ شے موجود نہ ہو جائے وہ کافر ہے

اس قسم کے روایات مسانید احادیث و اخبار میں بہت ہیں۔

اب کیا یہ حقیقت پرورانہ شیوہ ہے کہ ان تمام اقوال علماء اور ان متعدد احادیث کو پس پشت ڈالتے ہوئے کسی ایک ایسی مجہول السند روایت کے مضمون کو فرقہ شیعہ کا عقیدہ بنا دیا جائے جو فرقہ شیعہ میں ہرگز درخور قبول نہیں ہے ——— اتنا ہم نے صرف ایک حقیقت کی پردہ کشائی کے لئے لکھنا ضروری سمجھا ورنہ موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں کیونکہ بعقیدہ اہلسنت خدا فاعل مطلق ہے "لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون" کی بناء پر اس کے افعال میں وہ پابندیاں عاید نہیں ہیں جو بندوں پر عاید کی جاسکتی ہیں اس لئے بندوں کے لئے ظلم۔ فعل قبیح۔ کذب وغیرہ ناجائز ہیں لیکن خدا کے لئے یہ تمام باتیں جائز الوقوع ہیں۔ اور عدالت۔ انصاف۔ سچائی۔ راست کرداری وغیرہ کچھ ضروری نہیں ہے حالانکہ ترک فرائض اور اس قسم کے قبائح سے انبیاء معصوم ہوتے ہیں ——— بلکہ جبکہ قبائح اور اختیاری بدکرداریوں سے انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود خدا کی عصمت ضروری نہیں ہے تو اگر نادانی کی غلطی سے خدا کی عصمت (نعوذ باللہ) باطل بھی ہو جائے تو اسکا اثر عصمت رسالت پر کیا پڑسکا جو محل کلام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرقہ شیعہ وہ ہے جو خدا کو ان قبائح کے صحت و جواز سے بھی بری سمجھتا ہے اور جہالت و غفلت وغیرہ کے نقائص سے بھی اسکی ذات کو بالاتر قرار دیتا ہے ——— اب رہا انبیاء کی عصمت کا مسئلہ تو اس کے لئے بھی علمائے شیعہ کے اقوال ملاحظہ فرمائیے:-

شیخ صدوق اپنے اعتقادیہ میں لکھتے ہیں:-

ان اعتقادنا فی الانبیاء والرسل والائمۃ والملائکۃ صلوات اللہ علیھم انھم معصومون مطھرون من کل دنس وانھم لا یذنبون ذنبا صغیرا ولا کبیرا ولا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون ومن نفی عنھم العصمۃ فی شیء من احوالھم فقد جھلھم واعتقادنا فیھم انھم موصوفون بالکمال والتمام والعلم من اوائل امورھم الی اواخرھا لا یوصفون فی شیء من احوالھم بنقص ولا جھل۔

ہمارا اعتقاد انبیاء مرسلین ائمہ اور ملائکہ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی اخلاقی پستی سے معصوم اور پاک ہیں اور یہ کہ وہ کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں کرتے اور کسی حکم خدا کی مخالفت ان سے نہیں ہوتی اور جو انکے فرائض ہوتے ہیں انھیں بجا لاتے ہیں اور جو ان سے کسی حالت میں بھی عصمت کی نفی کرے وہ ان کے مرتبہ سے حقیقتاً واقف نہیں ہے۔ اور ہمارا اعتقاد ان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ تمام کمالات سے متصف ہوتے ہیں اپنے ابتدائے امر سے آخر تک کسی وقت کسی نقص اور جہالت سے متصف نہیں ہوتے

علامہ حلی کشف الحق میں تحریر فرماتے ہیں:-

ذھب الامامیۃ کافۃ الی ان الانبیاء معصومون

فرقہ امامیہ تمام و کمال اس بات کا قائل ہوا ہے کہ انبیاء صغائر و کبائر

عن الصغائر والکبائر منزھون عن المعاصی قبل النبوۃ وبعدھا علی سبیل العمد والنسیان وعن کل رذیلۃ ومنقصۃ وما تدل علی الخسۃ والضعۃ۔

سب گناہوں سے معصوم ہیں، اور معاصی سے بری ہیں نبوت کے قبل بھی اور بعد بھی عمداً اور سہواً اور بری ہیں ہر سیئت اخلاقی نقص سے اور ان چیزوں سے جو نفس کی سبکی اور حقارت کا پتہ دیتی ہیں۔

علامہ مجلسی نے بحار میں لکھا ہے:۔

ان العصمۃ فیہا اختارہ اصحابنا من تنزیہ الانبیاء والائمہ علیہم السلام عن کل ذنب ودناءۃ ومنقصۃ قبل النبوۃ وبعدھا قول ائمتنا سلام اللہ علیہم بذلک المعلوم لنا قطعاً باجماع اصحابنا رضوان اللہ علیہم مع تائیدہ بالنصوص المتظافرۃ حتی صار ذلک من قبیل الضروریات فی مذھب الامامیۃ

سب سے بڑا مستند اس مسلک کا جو ہمارے فرقہ کے علماء نے اختیار کیا ہے کہ انبیاء، ائمہ ہر گناہ اور نقص سے بری ہوتے ہیں قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی ہمارے ائمہ علیہم السلام کے اقوال ہیں جو ہمیں اپنے علماء کے متفقہ بیانات سے معلوم ہوئے ہیں اور اسکے ساتھ وہ نصوص جو کثرت کے ساتھ موجود ہیں یہاں تک کہ فرقہ امامیہ کے ضروریات مذہب میں داخل ہو گیا ہے۔

جناب غفرانمآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ نے عماد الاسلام میں اسکی تشریح اس طرح بیان فرمائی ہے کہ وہ معاصی و نقائص جن سے عصمت محل گفتگو قرار پا سکتی ہے بیس قسم کے ہو سکتے ہیں:۔ (۱) وہ معصیت جو منافی تبلیغ ہے یعنے غلط بیانی کرنا امور تبلیغ میں عمداً بعد بعثت — (۲) ایسی ہی صورت مگر عمداً نہیں سہواً — (۳) یہی صورت قبل بعثت — (۴) یہی صورت بعد بعثت — (۵) کفر بعد بعثت عمداً — (۶) کفر بعد بعثت سہواً — (۷) کفر قبل بعثت عمداً — (۸) کفر قبل بعثت سہواً — (۹) گناہ کبیرہ بعد بعثت عمداً — (۱۰) سہواً (۱۱) گناہ کبیرہ قبل بعثت عمداً — (۱۲) سہواً — (۱۳) گناہ صغیرہ جو عام طور پر سبکی کا باعث ہو بعد بعثت عمداً — (۱۴) سہواً — (۱۵) ایسا گناہ قبل تبلیغ عمداً — (۱۶) سہواً — (۱۷) گناہ صغیرہ جو عمومی سبکی کا باعث نہیں ہے بعد بعثت عمداً — (۱۸) سہواً — (۱۹) ایسا گناہ قبل تبلیغ عمداً (۲۰) سہواً — ان اقسام کے درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

نذھب معاشر الامامیۃ ان العصمۃ فی الانبیاء والاوصیاء تجب بکل من تلک الاحتمالات۔

فرقہ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء و اوصیاء کا ان تمام صورتوں سے معصوم ہونا ضروری ہے۔

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنے کا حق اپنے لئے قرار دیا گیا ہے کہ فرقہ شیعہ میں انبیاء و مرسلین کے لئے عصمت ضروری نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں اس قسم کی بکثرت تصریحات ملتی ہیں جن سے انبیاء کی غلطی و غلط فہمی، اور لغزش و خطاء اجتہادی کا ثبوت ملتا ہے"۔

لطف یہ ہے کہ اس کے لئے جو شواہد ذکر کئے گئے ہیں اُن میں۔ حضرت موسیٰ کا قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارون پر خفا ہونا اور سختی کے ساتھ پیش آنا، حضرت خضر و موسیٰ کا واقعہ اور موسیٰ کی بے صبری وغیرہ وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآن مجید کو بھی مخصوص حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں داخل سمجھا گیا، اور آخر میں لکھا ہے کہ:۔ "یہ دیگر انبیاء کے متعلق حضرات شیعہ کے مذہبی معتقدات ہیں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کا اعتقاد شیعوں سے مخصوص ہے اور اہل سنت اُن کے معتقد نہیں ہیں، حالانکہ اس کے بعد پورا زور اس بات پر صرف کیا جائے گا کہ شیعہ قرآن کو محرف جانتے ہیں اور اُس پر ایمان نہیں رکھتے۔

یہ "یک بام و دو ہوا" کا مضمون کیا صرف مناظرانہ ہنر آفرینی نہیں ہے اور اس کو کیا حقیقت پروری سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے؟!

حقیقت امر یہ ہے کہ اگر عقلی حیثیت سے انبیاء کے لئے عصمت ضروری ثابت ہو گئی تو جتنے آیات و احادیث کچھ ایسے مضامین پر مشتمل ہوں جن سے ظاہری طور پر انبیاء کی عصمت کو دھچکا لگتا ہو ان کی تاویل کے لئے اہلسنت بھی مجبور ہیں (اگر وہ عصمت کو کوئی ضروری چیز سمجھتے ہوں جیسا کہ آج صاحب مدعی ہیں) اور شیعہ بھی، جیسے خدا کے جسم و جسمانیات سے منزہ ہونے کے عقیدہ کی بنا پر الرحمن علی العرش استوی — جاء ربک والملک صفاً صفاً بل یداہ مبسوطتان — ان السموات والارض مطویات بیمینہ — الی ربھا ناظرۃ وغیرہ وغیرہ آیات کی تاویل لازم ہے۔

پھر جس طرح ان آیات کی بنا پر مسلمانوں کی جانب عموماً اس عقیدہ کا انتساب صحیح نہیں ہے کہ وہ خدا کو اعضاء و جوارح سے مرکب اور مجسم مانتے ہیں، اسی طرح ان آیات قرآنی یا احادیث سے شیعوں کی طرف اس عقیدہ کی نسبت درست نہیں ہے کہ وہ انبیاء کو معصوم نہیں بلکہ خطاکار سمجھتے ہیں۔

روایات جو اس سلسلہ میں وارد ہوں وہ اگر بلحاظ سند غیر معتبر ہوں تو قصہ پاک ہے اور اگر معتبر ہوں تو اُن کی صورت بھی وہی ہے جو آیات قرآن کی۔

ماریہ قبطیہ والی روایت درصورت صحت سند حقیقتہً "علم غیب" کے مسئلہ سے مربوط ہے، چونکہ شریعت کے احکام اسباب ظاہری پر مبنی ہیں اس لئے اُن قرائن و شہادات کی بنا پر جو اُس قبطی کے خلاف مہیا ہو گئے تھے رسول کا حکم قتل دینا بالکل درست تھا اور حقیقت امر کے ظاہری طور پر منکشف ہونے کے بعد قتل سے باز رہنا بھی بالکل صحیح ―― علم غیب کے معتقد یہ کہتے ہیں کہ رسول کو بھی اس حقیقت کا علم تھا لیکن دوسرے لوگوں پر واقعہ کے انکشاف اور اُن کی نکتہ چینیوں اور غلط بدگمانیوں کے رفع کرنے کے لئے اس قسم کا حکم ضروری تھا جس کا نتیجہ وہی ہوا جس کا رسول کو پہلے سے علم تھا اور اسی لئے آپ نے شکر خدا ادا کیا۔

جناب امیر نے اپنی رائے میں خود تبدیلی کبھی نہیں فرمائی لیکن وہ لوگ جو آپ کی ہدایت سے منحرف تھے اُن کو مجبور اپنی رائے کا پابند بنانے کی مصلحت نہ تھی اور داخلی جنگ کا اندیشہ تھا اس لئے آپ نے اپنی رائے کے تسلیم کرانے پر اصرار نہیں کیا اور "ہذا جزاء من ترک العقدة" کا فقرہ اُنہی سے متعلق تھا چنانچہ اُنہی سے مخاطب ہو کر آپ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا:۔

امرتکم امری بمنعرج اللوی فلم تستبینوا النصح الا ضحی الغد

یہ آپ کی اصابت رائے کا ایک مکمل ثبوت تھا جسے غلطی سے خطاء اجتہادی کے ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے ―― تعجب ہے کہ م ح صاحب نے اپنے یہاں کے روایات و اقوال سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ "اہلسنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے"

لیکن ذرا ملاحظہ ہو شرح مسلّم الثبوت اصل اول باب النسخ مطبوعہ نولکشور صفحہ ۷۵ — ۲۷۴ سطر ۱ — ۳ میں ہے:۔

ولا تصغ الی قول من یقول ان الانبیاء کیف یخطئون فی احکام اللہ تعالیٰ فان ھذا القول صدر من شیاطین اھل البدعة کالروافض وغیرھم الم ترا اھل الحق من السنة والجماعة القامعین البدعة کثرھم اللہ تعالیٰ یجوزون علی الانبیاء الخطاء کما ظھر فی اساری بدر من سید العالم

اُس شخص کی بات ہرگز نہ سنو جو یہ کہتا ہو کہ انبیاء احکام خدا میں غلطی نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ یہ قول ظاہر ہوا ہے شیاطین اہل بدعت، رافضی وغیرہ فرقوں سے، اور اہل حق یعنی اہلسنت و جماعت جو بدعت کے اکھاڑنے والے ہیں (خدا اُن کی تعداد کو زیادہ کرے) وہ انبیاء سے غلطی کو جائز سمجھتے ہیں جیسا کہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں سرور کائنات سے غلطی واقع ہوئی۔

اب دیکھئے کہ بیچارے شیعوں پر گالیاں پڑ رہی ہیں، کس لئے؟ کہ وہ انبیاء کو غلطی سے محفوظ جانتے ہیں۔ اور اُن کے مقابل میں اہلسنت و جماعت کا مذہب کیا بتایا جا رہا ہے؟ یہ کہ احکام خدا میں بھی انبیاء سے غلطی ہو سکتی ہے ―― کیا اس کے بعد بھی کسی کو شرم دامنگیر نہ ہونا چاہئے یہ کہتے ہوئے کہ شیعہ انبیاء کو معصوم نہیں سمجھتے اور اہلسنت احکام خدا میں انبیاء کو معصوم سمجھتے ہیں؟ ―― کیا رسالت کی حیثیت میں قرآن کی تبلیغ داخل نہیں ہے؟ اور کیا اسلام میں شرک اور ستائش اصنام سے بڑھ کر کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ لیکن مذکورہ سابق حوالوں کے ساتھ اہلسنت کی وہ روایت دیکھو جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ نے جان لیا کہ قریش مجھ سے بگڑے ہوئے ہیں تو آپ کو آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی قرآن کی آیت ایسی اُترے جس کی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اس بر وقت تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک دن قریش کے مجمع میں سورۂ "والنجم" نازل ہوئی، آپ اُس کو پڑھنے لگے اور اس آیت تک پہونچے کہ (افرأیتم اللات والعزّیٰ ومناة الثالثة الاخریٰ) تو یکایک شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دئے کہ (تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ) یعنی (یہ بت بزرگان بلند مرتبہ میں سے ہیں، ان کی شفاعت کی یقیناً امید رکھنا چاہئے) ―― یہ سُن کر تمام مشرکین سجدہ میں گر گئے اور خوش ہوئے کہ محمد اب ہمارے دین پر آ گئے۔

کیا اس کے بعد یہ حق ہے کہ کسی غیر مستند روایت کی بنا پر شیعوں کی جانب یہ عقیدہ منسوب کیا جائے کہ وہ انبیاء و مرسلین کے لئے خطاء اجتہادی یا سہو و نسیان کو جائز سمجھتے ہیں اور انھیں معصوم نہیں سمجھتے لیکن اہلسنت انبیاء کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے روایات اہلسنت کے یہاں نہایت کثرت سے ہیں سہو کے بارے میں خود رسول اللہ کا نماز کی رکعتوں میں غلطی کرنا اور ذوالشمالین یا ذوالیدین کا ٹوکنا بخاری میں موجود ہے، اور خطاء اجتہادی کی بھی بہت سی روایتیں ہیں جن میں احکام شرعیہ کی مثال بھی موجود ہے لیکن اس سب کے نقل کرنے سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ مضمون نگار کے اس غلط طریقہ استدلال کو روشن کر دیں جو اُنھوں نے شیعوں کے خلاف اختیار کیا ہے ―― کیونکہ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ مذہب اہلسنت عموماً انبیاء کو معصوم نہیں سمجھتا کیونکہ بہت ممکن ہے اُن میں سے بعض محققین ان تمام روایات کو سند کے اعتبار سے ناقابل قبول قرار دیتے ہوں یا اس کی کوئی تاویل کرتے ہوں

بحث کے آخر میں پھر کر مضمون نگار اُسی نقطہ پر آ گئے ہیں جو ہم نے اپنے تبصرہ میں اس بحث کے آخر میں درج کیا تھا کہ اہل سنت کا یہ خیال ہے کہ انبیائ سے اس قسم کی لغزشیں ہو جاتی ہیں تو اُن کو اُس غلطی پر قایم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ اللہ کسی صورت سے متنبہ کر دیتا ہے۔

نتیجہ کیا ہوا "کوہ کندن و کاہ برآوردن" وہی جو ہم نے اپنے تبصرہ میں لکھا تھا کہ خلافت کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ حضرت رسول نے خطاء اجتہادی کی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اُن کو اس غلطی پر باقی نہ رہنے دیا جاتا۔ بلکہ اُس غلطی پر متنبہ کر دیا جاتا اور جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ رسول نے جو کچھ چاہا تھا وہ بالکل صحیح تھا اور خدا کی مرضی کے مطابق۔

پھر جب نتیجہ یہی رہا تو مضمون نگار کو اس حصہ پر زور قلم صرف کرنے سے کیا "تہجین مذہب شیعہ" کے شوق پورا ہونے کے سوا کوئی علمی و تحقیقی فایدہ بھی ہوا؟!

دوسری تنقیح

نظام خلافت کے متعلق "عقل عمومی" یا "حاسۂ اجتماعیہ" کا تقاضہ کیا ہے اور کیا شیعی اُصول اسکے خلاف اور سنی اُصول اسکے مطابق ہے

اس تنقیح کی تمام و کمال نشو و نما بزمی صاحب کے مضمون سے ہے جس میں یہ دعوی یا "محاکمہ" کیا گیا ہے کہ:۔

(۱) رسول اکرم نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انکی وفات کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں اور پھر یہ سلسلہ "شاہان خود مختار" کی طرح نسلاً بعد نسلٍ قایم رہے۔

(۲) حضرت علی کی "الوہی امامت" کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع یا جعلی یا خود ساختہ ہیں یا اس کا مفہوم حقیقۃً وہ نہیں ہے جو "الوہی امامت" کی تائید کرتا ہو اور جس کے ماتحت خلافت کے حقدار صرف علی اور آل علی قرار پائیں۔

اسی دعوے کی تائید میں ایک مبسوط بحث کی گئی ہے جس سے مندرجۂ بالا تنقیح پیدا ہوئی۔

چونکہ بزمی صاحب کے مضمون کے جواب میں اخبار "اسد" کی متعدد اشاعتوں میں ایک غیر مکمل مضمون "ایک شیعہ صاحب کے قلم سے" شایع ہوا ہے اور اس مضمون میں اس حصۂ بحث کے متعلق بہت سی سوچنے اور سمجھنے کی باتیں مندرج ہیں اسلئے ناظرین نگار کی اطلاع کے لئے اتنا جزو اس مضمون کا یہاں نقل کیا جاتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ مجھ کو کہنا ہے وہ میں کہوں گا۔

"بزمی صاحب نے اپنے دعوے یا "محاکمہ" کی تائید کرتے ہوئے پہلے چار تنقیحیں قایم فرمائی ہیں اور ان کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے نتائج مرتب فرمائے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔ (۱) تمام مذاہب عالم اور بالخصوص اسلام کا یہ دعوی ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر بسنے والے انسان کی دینی اور اخروی صلاح فلاح کا پیغام لیکر آیا ہے اور ایک ایسا پروگرام خدا کی طرف سے لیکر آیا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیوی و اُخروی ہر اعتبار سے نشو و ارتقا کے اعلےٰ مدارج تک پہونچ سکتا ہے۔ (۲) کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی و معاشرتی اور ملی تمام جایز حقوق کی مکمل نگہداشت کرتا ہو اور کسی مذہب کا معیار صداقت یہی ہے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا کوئی حق غصب نہوتا ہو۔ (۳) کوئی ایسا مذہب الہامی نہیں ہو سکتا جو معمورۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کے لئے یکساں مفید اور قابل عمل نہو اور جس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جایز مطالبہ اور خواہش پر ضرب لگتی ہو۔ (۴) کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا جس کا کوئی اہم ترین بنیادی فیصلہ دنیا کے عقل عمومی کے خلاف ہو اور دنیا کے بسنے والوں کو ان کے کسی جایز حق سے محروم کرنا چاہتا ہو۔

مذکورہ تنقیحات اور ان کی تشریح میں چار صفحے نگار کے پُر کئے گئے ہیں حالانکہ غور کیا جائے تو صرف دو جملے ہیں جنھیں مکرّر سہ کرر لفظیں بدلکر تنقیحات کی صورت سے دہرایا گیا ہے۔ (۱) یہ کہ مذہب کو تمام افراد انسانی کے صلاح و فلاح کا ذمہ دار ہونا چاہئے اور کسی کی حق تلفی اس سے نہوتی ہو۔

(۲) مذہب کا کوئی فیصلہ دنیا کی عقل عمومی کے خلاف نہ ہو۔

عقل عمومی سے وہ معمولی فہم و فراست مراد لی گئی ہے جس سے انسان روزمرہ کے کاروبار میں کام لیتا ہے اور جس کے ذریعہ سے بہت سی صداقتوں کو پہچانتا ہے ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں مثلاً سچ بولنا اچھا ہے انسان کا قتل کرنا وحشیانہ فعل ہے جھوٹ بولنا بری بات ہے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک اس بحث کا "مفہومی" پہلو ہے اس میں کسی کو اختلاف کی کہاں گنجایش ہے لیکن اس کا وقوعی پہلو انتہائی تاریک اور مایوس کن ہے ۔ مذہب ہر انسان کی دینوی اور اُخروی صلاح و فلاح کا پیغام لیکر آیا ہے لیکن یہ صلاح و فلاح کس کے نقطۂ نظر سے ہے؟ کیا خود عام انسانوں کے نقطۂ نظر سے؟ مگر دشواری تو یہ ہے کہ مفاد عامہ اور صلاح خلق کی تعیین میں خود انسانی نظریے بدلتے رہتے ہیں ۔ اور بوقت واحد بھی سب کبھی ایک نقطہ پر مجتمع نہیں ہوتے

"کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جایز مطالبہ اور خواہش پر ضرب نہ لگتی ہو"

بہت ٹھیک مگر اس صحیح اور جایز کی تشخیص کون کریگا؟ خود جذبات کی ہوا میں اُڑنے والے افراد جن میں سے ہر ایک اپنے مطالبہ اور خواہش کو صحیح اور جایز ہی بتلاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی ناجائز اور غیر صحیح کیوں نہ ہو ۔

"دنیا کے بسنے والوں کو ان کے کسی جایز حق سے محروم نہ کرنا چاہتا ہو"

ضرور مگر جایز حق کی حد بندی کس طرح ہو ۔

"برہنہ کلب" کا ہر ممبر عریاں حالت میں بازاروں شاہراہوں اور عام تفریح گاہوں میں پھرنے کو اپنا جایز حق بتلاتا ہے ۔ صنف نازک کا کتنا بڑا طبقہ مردوں کی طرح طلاق کے معاملہ میں صاحب اختیار ہونے کو اپنا جایز حق بتلاتا ہے ایک فریق جو سرمایہ دار ہے اپنے روپیہ کی منفعت لینے سود لینے کو اپنا جایز حق تصور کر رہا ہے مانی اور مزدک کے پیرو اموال کے ساتھ صنف اناث میں تمام افراد کو مشترک قرار دیتے ہوئے ان سے بہرہ ور ہونے کا حق ہر شخص کو عطا کرتے ہیں اشتراکی جماعت ملکیت و میراث کے تمام احکام کو معمورہ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لئے غیر مفید اور عوام کے حقوق پر ضرب کاری سمجھتی ہے لطف یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے نقطۂ نظر کو "عقل عمومی" یا "بقول مدیر نگار" "حاسۂ اجتماعیہ" کے مطابق قرار دیتا ہے عریاں پسند طبقہ عریانی کو عقلی حیثیت سے مفید اور ضروری قرار دیتا ہے اشتراکیت پرور گروہ اپنے معتقدات کو عقل عمومی کے عین مطابق دکھلاتا ہے ۔ اب اگر دنیا کی ہر جماعت اور ہر خیال کے مطابق اس کے جایز مطالبہ کے حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور حقوق عطا کئے جائیں تو دنیا میں کسی قانون اور نظام کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا اور مذہب کی تو اینٹ سے اینٹ بج جائے گی ۔ "صحیح اور جایز" کی تشخیص اگر عام افراد انسانی کے جذبات ہی پر چھوڑ دیجائے تو مذہب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ مذہب تو درحقیقت انسانی افراد اور اقوام کے مطالبات و توقعات میں جائز اور صحیح کی حد بندی کے لئے آیا ہے اس کی حد بندیاں خود انسانی طبایع پر ایک بار گراں ہیں اور اس لئے ان کے حق آزادی اور مطالبۂ حریت پر ضرب کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ "عقل عمومی" یا "حاسۂ اجتماعیہ" کی مطابقت کا دعویٰ بہت آسان ہے لیکن اس کی واقعی تشخیص بہت مشکل ہے ۔ سوشلزم نیشنلزم کمیونزم وغیرہ وغیرہ تمام نظریے عقل عمومی ہی کی بنیاد پر اختیار کئے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا حامی اپنے ہی مسلک کو "حاسۂ اجتماعیہ" کے مطابق سمجھتا ہے اور بتلاتا ہے ۔ یورپ میں تعدد ازدواج جس بری نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے ایک عیسائی سے پوچھئے تو وہ متعدد شادیاں کرنے کو بالکل عقل عمومی کے خلاف بتلائے گا جبکہ ایک مسلمان پورے طور پر اسکی حمایت کرتے ہوئے عقلی حیثیت سے اسکو ضروری قرار دیگا ۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ یہ تمام مختلف راستے سب ہی صحیح نہیں ہیں ۔ دنیا میں اکثریت کے ساتھ کسی خاص ہوا کا چلنا کبھی "عقل عمومی" کا معیار نہیں ہے ۔ قرآن مجید میں اس کو لطیف پیرایہ میں اس طرح ظاہر کر دیا ہے کہ "لو تبعت اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ" (یعنے) اہل زمین کی اکثریت کی اگر پیروی کرو تو تمھیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دیگی ۔ انسانی طبایع و حالات میں جزر و مد ہوتا ہے ایک وقت میں جو مسلک اکثر افراد یا جمہور خلق کا ہے دوسرے وقت وہی اقلیت کا ہو جاتا ہے اور اس کے خلاف مسلک اکثریت کی تائید حاصل کر لیتا ہے ۔ پھر اگر اکثریت ہی کو معیار حقانیت سمجھا جائے تو چاہئے کہ دونوں متضاد مسلک برحق ہوں کیونکہ ہر ایک کو بجائے خود اکثریت کی تائید حاصل ہے یا یہ کہا جائے کہ خود نقطۂ حقیقت اختلاف نظریات کے بدلتا رہتا ہے یعنے جب اکثریت اس مسلک کے موافق ہو تو وہ حق ہے اور جب اس مسلک کے موافق نہ ہو تو بالکل غلط ہے حق ایک ہے اور وہ بدلتا نہیں ہے مثال کے طور پر ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس سے پہلے دنیا میں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا عام ہوا یہی چل رہی تھی اور دنیا اسی راستہ کی سالک تھی لہذا یہ سمجھنا چاہئے کہ "عقل عمومی" اور "حاسہ اجتماعیہ" اسی کو صحیح سمجھ رہے تھے اس کے بعد انقلاب ہوا اور دنیا کا نقطۂ نظر بدلا جس کے بعد مختلف نظریات پیدا ہوگئے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس مسلک کا غلبہ دنیا میں آج ہے یہ سو برس کے بعد بھی اسی صورت سے رہیگا ۔ ہسپانیہ میں اشتراکیت کے خلاف جد و جہد جاری ہے ، جس کا نتیجہ کامیابی سے قریب معلوم ہوتا ہے ۔ روس میں خود اہل ملک کے اندر اس نظام کے خلاف سازشیں ہوتی

بھی ہیں اور اشتراکیوں کی زندگی اسی طرح ہر لحظہ خطرہ میں ہے جس طرح مسولینی اور ہٹلر کی - وہاں بہت سے وہ قدم پیچھے ہٹائے جا چکے ہیں جو اس کے پہلے آگے بڑھائے گئے تھے — اس کے معنے یہ ہیں کہ انسانی نظام زندگی کی بنا اس اجتماعی نظام سے بھی نہیں ہے بلکہ یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس رنگ پر دنیا آج جا رہی ہے یہی "عقل عمومی" کا اصلی تقاضا اور "حاسۂ اجتماعیہ" کا حقیقی مطالبہ ہے — اس وقت تو خود مذہب کے خلاف جو عام ہوا چل رہی ہے اس کی بنا پر خود مذہب ہی کو "عقل عمومی" کے خلاف سمجھا جا رہا ہے — خدا کو ایک ذی شعور و ارادہ قادر و فاعل مختار ہستی کی حیثیت سے ماننے میں دنیا کو عذر ہے وہ اس کی طرف سے وحی اور بعثت انبیاء کے کوئی معنے نہیں سمجھتی تو منصوب من اللہ ہونے کا کیا مفہوم اس کے ذہن میں آ سکتا ہے — اگر اسی طرح کے "عقل عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کی بنیاد پر گفتگو کرنا منظور رہے تو امامت کے مسئلہ تک نوبت ہی نہ پہونچے گی۔ مذہب اور اس کا عقیدۂ الوہیت اور نبوت سب ہی غائب ہو جائیگا اور اسی لئے شاید "آزاد خیال شیعہ" نے اپنے مقالہ میں مدیر نگار کو مخاطب کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "اب اس بحث نے جو صورت اختیار کر لی ہے وہ مذہبی و اعتقادی ہے جس کے دلایل و اصول کا بہت کچھ تعلق مابعد الطبیعاتی مبادی کے ساتھ ہو - لہذا اس بحث کا جو فیصلہ کیا جائے وہ انہی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں"۔

اپنی طول طویل تمہید یا چار تنقیحات کی تشریح کے بعد برزمی صاحب نے جو سنگ بنیاد اپنی آیندہ بحث کا رکھا ہے وہ انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ "اب آپ حضرت علی کی "الوہی خلافت" کے عقیدہ پر غور کیجئے، دیکھئے "الوہی خلافت" کا مطلب یہ ہے کہ "خداوند کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریم کے بعد انکے داماد حضرت علی خلیفہ ہوں اور علی کے بعد ان کی اولاد میں سے کسی کو یہ منصب جلیل تفویض کیا جائے اور اسی طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے — (برزمی صاحب فرماتے ہیں) اب اگر آپ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقاید مستنبط ہوتے ہیں:- (۱) خلافت و امامت علی کی نسل کے لئے مخصوص ہے — (۲) خلیفہ (یا امام) کی وفات پر اس کی جانشینی کے لئے پیش رو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں پیش رو کا کوئی قریب ترین عزیز ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہان خود مختار کے یہاں ولیعہدی کے لئے - (۳) اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی سند کا مستحق قرار نہیں پا سکتا — (۴) دنیا کے تمام مسلمان حضرت علی کی نسل کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں — (۵) چونکہ رسول کے بعد علی اور ان کی اولاد ہی خلافت و امامت کی حقدار ہے اور وہی "اولوالامر" آقا اور مولا ہیں اس لئے روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کے لئے یہ فرض ہے کہ وہ ابدالآباد تک آل نبی کے ہر اشارہ پر بلاچون و چرا سر تسلیم خم کرتا رہے — (۶) اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ بلکہ علی کی اولاد میں سے ولیعہدی کے مروجہ اصول کے بموجب کسی "حقدار" کو مسند خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائے گا — یہ ہے وہ استنباط اور امامت کے بارے میں عقیدۂ اہل تشیع کی تحلیل و تشریح جو برزمی صاحب کی نکتہ رس نگاہ کی مرہون منت ہے۔ لیکن کیا وہ حقیقت واقعہ کے مطابق ہے؟ — سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ذی علم انسان کو اپنے مسلک و خیال کی حمایت میں اس کی جرأت کیسے ہوتی ہے کہ وہ اپنی عبارت آرائی سے دوسرے فریق کے عقاید کو بھی غلط صورت میں پیش کرے، اور توڑ مروڑ کر ایسا نظریہ اس کی طرف منسوب کرے جس کا مصنف وہ خود ہے اور پھر اس کی رد میں صفحے کے صفحے سیاہ کر کے غلط اندیش افراد کو یہ رائے قایم کرنے کی دعوت دے کہ فریق مخالف کا جواب ہو گیا اور اس کے عقیدہ کی عمارت مسمار ہو گئی — "معیار امامت" کو جو کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے "تعیین اشخاص" کے ساتھ جو خصوصی دلائل کا جزئی نتیجہ ہے مخلوط کر دینا ایک ایسی مناظرانہ تدلیس اور فریب کاری ہے جو سنجیدگی اور انصاف کی طرف سے انتہائی نفرت و ملامت کی مستحق ہے — "الوہی خلافت" کا مطلب ہرگز "شخصیت پرستی" نہیں ہے جس میں اوصاف سے کوئی بحث نہ ہو — خلیفہ یا امام کے لئے اصولی حیثیت سے ہرگز یہ ضروری نہیں قرار دیا گیا ہے کہ وہ پیش رو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں ان کا کوئی قریب ترین عزیز ہو — امامت کے بنیادی شرائط میں ہرگز نہیں ہے کہ وہ آل علی میں سے کسی کے لئے عام مسلمانوں کی جانب سے قرار دیجائے اور نہ بحیثیت "علی کی اولاد" ہونے کے کسی کو بھی سادات میں سے یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ خلافت و امامت کا حقدار بنے اور اولوالامر آقا اور مولا ہونے کا دعوے کرے اور ہرگز یہ درست نہیں ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو اور پھر بھی وہ جانشینی کا مستحق نہیں ہے کہ وہ علی کی اولاد ہی میں سے ولیعہدی کے مروجہ اصول کے موافق کسی کو مسند خلافت پر متمکن کیا جائے گا۔

ان میں سے کوئی ایک بات بھی ذرہ بھر اصلیت نہیں رکھتی اور نہ اُسے شیعی عقیدۂ خلافت سے کوئی واسطہ ہے۔ شیعوں کا اساسی عقیدہ خلافت و امامت کے بارے میں صاف طور پر حسب ذیل ہے (۱) امام جانشین رسولؐ ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس سے رسول کی وفات کے بعد حفاظت شریعت اور اصلاح خلائق کا مقصد پورے طور سے حاصل ہو سکے اور خود اُسکی غلط اندیشی، غلط بیانی یا غلط کاری سے فساد خلق کا اندیشہ نہ ہو اور یہ اُسی وقت ہوگا کہ جب وہ معصوم ہو۔ (۲) امام وہی ہوگا جو اپنے زمانہ کے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا اور سب سے زیادہ عالم علوم حقیقیہ، خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں افضل و اکمل ہو (۳) ایک ایسی ہستی کی تشخیص جو معصوم ہونے کے ساتھ تمام افراد مسلمین سے افضل و اکمل ہو عام افراد انسانی کے دسترس سے باہر ہے، نیز عام افراد کا فیصلہ پورے طور پر رو رعایت اور جانبداری سے الگ بھی نہیں ہوا کرتا اور اُس میں خود غرضی اور مطلب برآری کے لحاظ کا موقع ہے اسلئے امام یعنے جانشین رسول کا انتخاب براہ راست خدا سے متعلق ہونا چاہئے اور امام وہی ہوگا جسکو خدا مقرر کرے (۴) چونکہ خداوندی منشا کے معلوم ہونے کا ذریعہ عام انسانوں کو سوائے سفیر الٰہی یعنے پیغمبر کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے اسلئے امام یعنے جانشین رسول کی تعیین نص رسول ہی سے ہو سکتی ہے اور اس امام کے بعد پھر دوسرے امام کی تعیین بھی یا اُسی رسول کے نص سے ہوگی یا اُس امام کے بیان سے جو رسول کی جانب سے مامور تھا کیونکہ یہ نص بھی بواسطۂ رسول خدا تک منتہی ہوتی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس معیار اور اصول اساسی میں کہیں کسی خاندان کسی جماعت کسی قوم و قبیلہ کی تخصیص ہے؟ حقیقت پروری کا واقعی تقاضا یہ ہے کہ عقلی و اصولی بنیادوں پر صرف اسی معیار اور اصول کی صحت کو جانچا جائے اور دیکھا جائے کہ آیا یہ اصول درست ہے یا اسکے خلاف جماعت کا بنیادی عقیدہ جس کا تجزیہ کرنے پر مندرجۂ ذیل ضمنی عقائد مستنبط ہوتے ہیں۔ (۱) خلافت یا امامت یعنی جانشینی رسول کے مسئلہ کا خدا اور رسول سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ عام افراد کے اختیارات امتیازی سے متعلق ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ و جانشین رسول منتخب کر لیں (۲) خلیفہ کا انتخاب اجماع سے ہوتا ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے مجتمع ہوں اور کوئی ”آل ورلڈ مسلم کانفرنس“ ہو اور اسمیں یہ مسئلہ طے پاسکے بلکہ اگر کسی ایک اسلامی مرکز کے لوگوں نے مجتمع ہو کر کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا اور اسکی بیعت ہو گئی تو وہ خلیفہ سمجھ لیا جائیگا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی قسمت اس سے وابستہ ہو جائیگی۔ (۳) دوسری صورت یہ بھی ہے کہ ایک منتخبہ کمیٹی چند آدمیوں کی جو کسی جلسۂ عام میں منتخب بھی نہ ہوئی ہو بلکہ کسی ایک شخص نے بنائی ہو وہ مجتمع ہو کر کثرت رائے سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دے تو بھی تمام مسلمانوں کا خلیفہ ہو جائیگا۔ (۴) تیسری صورت یہ بھی ہے کہ سابق خلیفہ جو معصوم بھی نہیں ہے وہ کسی کو اپنی زندگی کے ذریعہ سے معین کر جائے تو وہ بھی خلیفۃ الرسول بن جائیگا اور تمام مسلمانوں کو اس کی اطاعت لازم ہوگی۔ (۵) چوتھی شکل یہ کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو لیکن ایک شخص کسی طرح اقتدار حاصل کر لے اور بزور شمشیر دوسروں سے سر تسلیم خم کرالے تو وہ بھی خلیفۂ رسول قرار پا جائیگا۔ (۶) خلیفۂ رسول کیلئے معصوم ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کوئی زانی اور شرابخوار بھی قہر و غلبہ حاصل کر لے تو وہ پیغمبر خدا کا جانشین سمجھا جائیگا اور اسکی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہوگی۔ اب اسکا فیصلہ ارباب عقل کے ہاتھ ہے کہ کیا یہی عقائد ”عقل عمومی“ کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے موافق ہیں؟ کیا انہی عقائد کو مان لینے سے تمام معمورۂ ارض کے بسنے والے تمام انسانوں کے انفرادی، معاشی اور تمدنی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت ہو سکیگی؟ کیا اسی طرح مفاد اسلامی حاصل ہونگے اور جانشینی رسول کا اصلی مقصد پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیگا؟ کیا اسطرح شریعت اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں میں روح اسلامیت کی صحیح تربیت ہو سکیگی۔

یہ ہے پورا وہ تبصرہ جو فاضل صاحب علم شیعہ نے اس بحث کے متعلق کیا ہے اور اس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ بہت سے نکات اس تبصرہ میں اس طرح تشریح کے ساتھ درج ہو گئے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنا ممکن ہے اور نہ ضرورت باقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیعی مذہب کے عقیدۂ امامت کی تشریح میں تو صاحب مضمون نے بے اعتدالی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ اُسکے نقد و ایراد کے سلسلہ میں مذکورۂ بالا تبصرہ کے الفاظ ذرا تیز ہو گئے ہیں جو کم از کم میرے مذاق طبیعت کے خلاف ہیں لیکن پھر بھی جو کچھ جواب میں لکھا گیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شیعوں کی طرف یہ منسوب کرنا کہ وہ اس میں خصوص خاندان کی شرط لگاتے ہیں ویسا ہی ہے جیسے مسلمانوں پر یہ ایراد عائد کیا جائے کہ وہ ختم نبوت کو قوم عرب اور اس میں خصوص اہل مکہ اور ان میں خاص قبیلہ قریش اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ بنی ہاشم اور پھر وہ بھی فرزند عبداللہ کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں اور تمام دنیا کے لوگوں کو شرق و غرب عالم میں اس نعمت سے محروم کرتے ہیں جو تمام اہل عالم کے حقوق پر ایک کاری ضرب ہے اور اسلئے ”عقل عمومی“ اور ”حاسۂ اجتماعیہ“ کے بالکل خلاف ہے۔ شیعی اور سنی مسلک میں خط فاصل یہ ہے کہ شیعہ تعیین امام کا صرف ایک طریقہ قرار دیتے ہیں اور وہ نص یعنے استخلاف ہے جو ذرا مشکل ہے کہ اسی لئے اہلسنت کی جانب سے اس مسلک کی پوری نکتہ چینی اور ابطال کی کوشش اور اس امر کے اثبات کی جد و جہد کہ یہ مسلک ”عقل عمومی“ کے خلاف ہے اس وقت جائز بھی جا سکتی تھی جب اہلسنت اس طریقہ کو غلط سمجھتے ہوتے اور حجت نہ جانتے لیکن جبکہ یہ طریقہ باتفاق اہلسنت بھی ایک ذریعہ تعیین امام کا ہے جس کے بعد عام مسلمانوں کو کوئی اختیار انتخاب و اظہار رائے کا باقی نہیں رہ جاتا تو پھر اس مسلک کے خلاف اتنی عرق ریزی اور اس امر کی کاوش کہ وہ کسی طرح ”عقل عمومی“ کے خلاف ثابت ہو جائے اثبات حقیقت کے لحاظ سے کون سی مستحسن سعی مشکور سمجھی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ مذہب اہلسنت کی جانب سے اُس کی ہمت افزائی یہ کہکر کی جائے (اقتلونی و مالکا واقتلوا مالکا معی) اور شکریہ اس طرح ادا کیا جائے

شکر است بار قیبان دامن کشان گذشتی گو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد۔ ملاحظہ ہوں علمائے اہلسنت کے تصریحات جو اس مسئلہ سے متعلق ہیں۔

(۱) شرح مواقف (مطبع نول کشور لکھنؤ) صفحہ ۷۳۲

المقصد الثالث فیما یثبت بہ الامامۃ فان الشخص بمجرد صلاحہ للامامۃ وجمعہ شرائطہا لا یصیر اماما بل لا بد فی ذلک من امر آخر وانہا تثبت بالنص من الرسول ومن الامام السابق بالاجماع

تیسرا مقصد (بحث امامت کا) اُن طریقوں کے بیان میں جن سے امامت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امامت کی لیاقت اور شرائط امامت کے اجتماع سے کوئی امام نہیں ہو جائیگا بلکہ اسکے لئے کچھ اور بھی ضروری ہے۔ اس کا ایک طریقہ رسول اور سابق امام کی نص ہے۔ دوسرا طریقہ

وتثبت ایضاً ببیعة اهل الحل والعقد عند اهل السنة والجماعة والمعتزلة والصالحیة من الزیدیة خلافاً للشیعة ای اکثرهم قالوا لاطریق الا النص۔

اجماع درست ہے اور دوسری صورت اہل حل وعقد کا بیعت کرنا، یہ اہلسنت وجماعت اور معتزلہ اور فرقہ زیدیہ کی جماعت صالحیہ کا مسلک ہے لیکن شیعوں کی اکثریت اس کے مخالف ہے وہ کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ نہیں۔

(۲) صواعق محرقہ - ابن حجر کی مطبوعہ مصر ص۵

الامامة تثبت اما بنص من الامام علی استخلاف واحد من اهلها واما بعقدها من اهل الحل والعقد لمن عقدت له من اهلها واما بغیر ذلک کما هو مبین فی محلہ۔

امامت ثابت ہوتی ہے یا تو امام وقت کے نص سے کسی قابل شخص کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے کے ساتھ اور یا اہل حل وعقد کے مقرر کرنے سے کسی لائق شخص کو اور یا دیگر طریقوں سے جو اپنے محل پر بیان ہوئے ہیں۔

(۳) معالم اصول الدین - امام فخر الدین رازی جو مصر میں محصل امام رازی کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے اس میں ہے (الباب العاشر فی الامامة) کا مسئلہ ۱۲ حسب ذیل ہے (ص۱۵۸)

اجمعت الامة علی انه یجوز اثبات الامامة بالنص وهل یجوز بالاختیار ام لا قال اهل السنة والمعتزلة یجوز وقالت الاثنا عشریة لایجوز الا بالنص۔

تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ امامت نص کے ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے لیکن عام افراد کے انتخاب کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے یا نہیں، اہلسنت ومعتزلہ قائل ہیں کہ ہو سکتی ہے اور فرقہ اثنا عشریہ قائل ہے کہ بغیر نص کے نہیں ہو سکتی۔

(۴) ابطال الباطل میں لکھا ہے:-

انما یثبت بالنص من الرسول ومن الامام السابق بالاجماع ویثبت ایضاً ببیعة اهل الحل والعقد عند اهل السنة والجماعة والمعتزلة والصالحیة من الزیدیة خلافاً للامامیة من الشیعة فانهم قالوا لاطریق الا النص

امامت رسول اور گذشتہ امام کے نص سے اجماعاً ثابت ہوتی ہے اور اہل حل وعقد کی بیعت سے بھی اہلسنت وجماعت اور معتزلہ اور زیدیہ صالحیہ کے نزدیک ثابت ہو جاتی ہے لیکن فرقہ شیعہ امامیہ اس کا مخالف ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ نہیں ہے

مذکورہ بالا عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ شیعوں کا مقررہ طریقہ (نص) انکے نزدیک متفق علیہ ہے جو کچھ اختلاف ہے وہ دوسرے طریقوں میں ہے۔ پھر ابطال نص ثابت کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ شیعوں کے مقررہ طریقہ کو عقل عمومی کے یا جائز اجماعیہ کے خلاف قرار دیا جائے۔ شیعوں کا مقررہ طریقہ تو اس درجہ عقل عمومی کے مطابق اور دل کو لگتا ہوا ہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکر کی خلافت کے قائل ہیں وہ بھی دل سے متمنی ہیں کہ انکی خلافت اس طریقہ پر درست ثابت ہو جائے اور اس کی کوشش بھی کرتے ہیں چاہے وہ ناکام ہوں۔

تصدیق کے لئے ملاحظہ ہو شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی کی کتاب "منہاج السنة" (مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۲۱ھ) ج ۱ ص ۱۳۴

ذهبت طوائف من اهل السنة الی ان امامة ابی بکر ثبتت بالنص والنزاع فی ذلک معروف فی مذهب احمد وغیره من الائمة وقد ذکر القاضی ابو یعلی وغیره فی ذلک روایتین عن الامام احمد احداهما انها ثبتت بالاختیار قال وبهذا قال جماعة من اهل الحدیث والمعتزلة والاشعریة وهذا اختیار القاضی ابی یعلی وغیره والثانیة انها ثبتت بالنص الخفی والاشارة قال وبهذا قال الحسن البصری وجماعة من اهل الحدیث وبکر ابن بنت عبد الواحد والبیهسیة من الخوارج وقال شیخه ابو عبد الله بن حامد فاما الدلیل علی استحقاق ابی بکر الخلافة دون غیره من اهل البیت والصحابة فمن کتاب الله وسنة نبیه قال وقد اختلف اصحابنا فی الخلافة هل اخذت من حیث النص او الاستدلال فذهب طائفة من اصحابنا الی ان ذلک بالنص وانه صلی الله تعالی علیه وسلم ذکر ذلک نصاً وقطع البیان علی عینه حتماً ومن اصحابنا من قال ان ذلک بالاستدلال الجلی۔

اہلسنت کی بہت سی جماعتیں اس کی قائل ہیں کہ حضرت ابوبکر کی امامت بذریعہ نص ثابت ہوئی ہے اور اس مسئلہ میں امام احمد اور دوسرے علماء کے درمیان اختلاف مشہور ہے اور قاضی ابو یعلی وغیرہ نے اس بارے میں دو روایتیں امام احمد سے نقل کی ہیں ایک یہ کہ آپ کی امامت صحابہ کے انتخاب سے ثابت ہوئی ہے اور اسکی قائل ہوئی ہے ایک جماعت اہل الحدیث میں سے اور معتزلہ اور اشاعرہ اور یہی مسلک ہے قاضی ابو یعلی وغیرہ کا اور دوسرے یہ کہ وہ نص خفی اور اشارہ سے ثابت ہوئی ہے اور اس کے قائل ہوئے ہیں حسن بصری اور ایک جماعت اہل الحدیث میں سے اور بکر ابن بنت عبد الواحد اور فرقہ خوارج میں بیہسیہ اسکے قائل ہیں اور شیخ ابو عبد اللہ بن حامد نے کہا ہے کہ اس امر کی دلیل کہ خلافت کے مستحق ابوبکر تھے اور دوسرے اہل بیت اور صحابہ نہیں تھے قرآن اور سنت دونوں سے ہے انھوں نے کہا کہ ہمارے علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ خلافت نص سے ثابت ہے یا استدلال سے ایک جماعت ہمارے اصحاب میں سے اسکی قائل ہے کہ وہ نص سے ثابت ہے اور یہ کہ حضرت نے اسکو بطور نص بیان فرمایا اور مخصوص حضرت ابوبکر کی قطعی طور پر تعیین فرمائی اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ استدلال کے ذریعہ سے ثابت ہوا ہے۔

اسکے بعد مختلف روایات اپنے طرق سے اور اس طرح کے استدلالات ذکر کیے ہیں جن سے کسی نہ کسی طرح ثابت ہو جائے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت نص رسول سے تعلق رکھتی تھی جن میں سب سے زیادہ اہم اور قابل لحاظ یہ استدلال ہے کہ خلیفہ کا اطلاق اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک پیش رو شخص نے خود جانشین بنایا ہو اور چونکہ تمام صحابہ نے باجماع حضرت ابوبکر کو خلیفہ رسول کے نام سے یاد کیا اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی جانب سے انکے متعلق نص ہو چکی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عقل عمومی بھی اسی طریقہ کو صحیح بھی

ہے جو شیعون نے خلافت کے لئے مقرر کیا ہے اور جسکی بنیاد پر وہ حضرت علی کی خلافت کے مدعی ہیں۔ شیعہ فرقہ کا عقیدہ اس بنا پر کہ اس میں خاندان پرستی کی بو پائی جاتی ہے "عقل عمومی" کیخلاف بتلایا جا رہا ہے حالانکہ وہ حقیقۃً نص اصول پر مبنی ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اس میں بحیثیت اصول سابق قرابت کا کوئی پہلو ملحوظ نہیں ہے۔ یعنے اگر رسول کا نص و استخلاف کسی اجنبی شخص کے متعلق مستند طریقہ سے ثابت ہو جائے تو شیعہ عقیدہ کے لحاظ سے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کیلئے موجود ہیں اور اس کا لحاظ ہرگز نہیں کرینگے کہ وہ اجنبی شخص ہے اور غیر متعلق ہے۔ لیکن اہلسنت جو نص کے پابند نہیں ہیں اور عام افراد کو خلیفہ کے انتخاب کا حق دیتے ہیں انھون نے جس صورت سے ذمہ قبیلہ کی پابندی عائد کی ہے اُسے سوائے "خاندان پرستی" کے اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اہلسنت خلافت کے لئے قبیلۂ "قریش" میں سے ہونے کی شرط قرار دیتے ہیں۔ چونکہ "م ح" صاحب نے اس کمزوری کو محسوس فرمایا ہے اسلئے انھون نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ "اہلسنت خلافت کو کسی گروہ میں محدود نہیں رکھتے" یہ دفع دخل کیا ہے کہ "جن لوگون نے اہلسنت کے نظریہ کو محدود دیکھا غلط سمجھا ہے۔"

اور فٹ نوٹ میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ اہلسنت کے نزدیک خلافت کو صرف قریش کیلئے مختص سمجھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ الائمۃ من قریش ضرور وارد ہوا ہے لیکن یہ فرمان رسول اُس وقت کے حالات اور ماحول کے لحاظ سے تھا کہ اُس وقت طاقت و قوت کے اعتبار سے قریش ہی کا ایک ایسا قبیلہ تھا جو اور قبائل سے غیر معمولی امتیاز رکھتا تھا۔ اسی لئے امامت و خلافت کا اُس کو مستحق قرار دیا ورنہ اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قریش میں امامت و خلافت منحصر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس زمانہ میں ترکی کی بے پناہ عسکری طاقت کو دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ خلافت کا مستحق ترکی ہے، اس کے یہ معنی نہ ہون گے کہ ترکی ابدالآباد کیلئے خلافت کا مستحق ہو گیا۔" ممکن تھا کہ "م ح" صاحب اس رائے کو اپنے ذاتی اجتہاد کے طور پر درج فرماتے لیکن انھون نے ایسا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے ذاتی خیال کو جمہور اہلسنت کے سر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ جانے دیجئے اس کو کہ انکا ذاتی اجتہاد درست ہے یا نہیں اور انھون نے جو تاویل فرمائی ہے وہ "الائمۃ من قریش" کے الفاظ کے ساتھ (جس میں "ائمہ" جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے نہ "الامام" جس کے معنی یہ کہے جا سکتے کہ مرے بعد "الامام" قریش ہی سے ہونا چاہئے) سازگار رہتی ہے یا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھون نے اہلسنت کی طرف اس عقیدہ کی نسبت جو دی ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ اسکے لئے ملاحظہ ہون علمائے اہل سنت کے تصریحات:-

(۱) علامہ ابن حزم نے کتاب الفصل فی الملل والنحل میں لکھا ہے:-

اختلف القائلون بان الامامة لا تكون الا فی صلبية قريش فقالت طائفة هی جائزة فی جميع ولد فهر بن مالك بن النضر وهذا قول اهل السنة وجمهور المرجئة وبعض المعتزلة وقالت طائفة لا تجوز الخلافة الا فی ولد العباس بن عبد المطلب هم الراوندية وقالت طائفة لا تجوز الخلافة الا فی ولد علی بن ابی طالب

دو جماعتیں جو امامت کو نسل قریش میں منحصر سمجھتے ہیں اُن میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ وہ فہر بن مالک بن نضر کی تمام اولاد میں جائز ہے۔ یہ قول ہے اہلسنت اور تمام مرجئہ اور بعض معتزلہ کا اور ایک جماعت کہتی ہے کہ خلافت عباس بن عبد المطلب کی اولاد میں منحصر ہے۔ یہ راوندیہ ہیں اور تیسری جماعت اس کی قائل ہے کہ خلافت اولاد علی بن ابیطالب میں منحصر ہے۔

(۲) شرح مواقف (مطبوعہ نولکشور) صفحہ ۷۲۲، میں شرائط امامت میں لکھا ہے:-

ان يكون قرشيا اشترطه الاشاعرة والجبائيان ومنعه الخوارج وبعض المعتزلة۔

امام کو قرشی ہونا چاہئے، اس شرط کو معتبر قرار دیا ہے اشاعرہ نے اور فرقہ معتزلہ میں سے جبائیان نے اور خوارج اور بعض معتزلہ اسکے خلاف ہیں

معلوم ہونا چاہئے کہ اہلسنت تمامتر اشاعرہ ہی ہیں جن کا یہ مذہب ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) ابطال الباطل میں لکھا ہے:-

شروط الامام الذی هو اهل للامامة ومستحقها ان يكون مجتهدا فی الاصول والفروع ليقوم بامر الدين ذا رأی وبصارة بتدبير الحرب وترتيب الجيوش شجاعا قوی القلب ليقوی علی الذب عن الحوزة عدلا لئلا يجور فان الفاسق ربما يصرف الاموال فی اغراض نفسه والعدل عندنا من لم يباشر الكبائر ولم يصر علی الصغائر عاقلا ليصلح للتصرفات الشرعية بالغا لقصور عقل الصبی ذكرا اذ النساء ناقصات العقل والدين حرا قرشيا فمن جمع هذه الصفات فهو اهل للامامة الزعامة الكبری۔

شرائط امام کے جو امامت کا اہل اور مستحق ہوتا ہے یہ ہیں کہ وہ اصول اور فروع دونون میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہو تاکہ دینی امور کا انصرام کر سکے جنگ کے تدابیر اور افواج کی ترتیب میں صائب الرائے اور باخبر ہو بہادر و قوی دل ہو تاکہ مرکز اسلام سے مدافعت پر قادر ہو۔ عادل ہو تاکہ جور و ظلم نہ کرے اسلئے کہ فاسق اگر ہوگا تو ممکن ہے مسلمانون کے مال کو اپنے نفسانی اغراض میں صرف کر دے اور عادل ہمارے نزدیک وہ ہے جس نے کبائر کا ارتکاب نہ کیا ہو اور صغائر پر اصرار نہ کرتا ہو۔ عاقل ہو تاکہ تصرفات شرعیہ کے قابل ہو سکے۔ بالغ ہو کیونکہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے مرد ہو کیونکہ عورتیں عقل اور دین دونون میں ناقص درجہ رکھتی ہیں آزاد ہو قرشی ہو جس شخص میں یہ تمام صفتیں جمع ہون وہ امامت اور ریاست عامہ کا مستحق ہے۔

(۴) شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج السنہ (ج ۱ صفحہ ۱۴۱) میں لکھتے ہیں۔

اما کون الخلافۃ فی قریش فلما کان ھذا من شرعہ و دینہ کانت النصوص بذلک معروفۃ منقولۃ ماثورۃ۔

خلافت قریش میں منحصر ہونا چونکہ رسول اللہ کی شریعت اور دین کا ایک جزو تھا اسلئے نصوص اس بارے میں مشہور و معروف اور سب کے زبان زد تھے۔

(۵) نجم الدین نسفی نے عقائد میں لکھا ہے۔

یکون من قریش ولا یجوز من غیرھم ولا یختص ببنی ھاشم واولاد علی کرم اللہ وجھہ۔

امام قریش میں سے ہوگا اور کسی دوسرے قبیلے سے امام کا ہونا جائز نہیں ہے اور بنی ہاشم یا اولاد علی بن ابیطالب سے مخصوص نہیں ہے۔

(۶) شرح عقائد نسفی میں ہے۔

یشترط ان یکون الامام قرشیا بقولہ الائمۃ من قریش ھذا وان کان خبر واحد لکن لما رواہ ابوبکر محتجا بہ علی الانصار ولم ینکرہ احد فصار مجمعا علیہ لم یخالف فیہ الا الخوارج وبعض المعتزلۃ۔

شرط ہے کہ امام قرشی ہو کیونکہ آنحضرت نے فرمایا ائمہ قریش ہی سے ہونگے اور یہ اگرچہ خبر واحد ہے لیکن چونکہ اسے حضرت ابوبکر نے انصار کے مقابلہ میں استدلال میں پیش کیا اور کسی نے انکار نہیں کیا اس لحاظ سے اجماعی حیثیت حاصل کرلی اور کوئی اس کا مخالف نہیں ہے سوائے خوارج اور بعض معتزلہ کے۔

معلوم ہوا کہ اہلسنت اس امر پر متفق ہیں کہ امامت کے لئے قبیلہ قریش سے ہونا ضروری ہے اور اس کو رسول اللہ ہی کیجانب منسوب کیا گیا ہے کہ آپ نے ہمیشہ کیلئے امامت کو اس قبیلہ میں جس سے آپ خود تھے منحصر قرار دیا ہے۔ اب دیکھئے کہ شیعی نقطۂ نظر میں اور اس مسلک میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ شیعہ رسول اللہ کیجانب سے مخصوص اشخاص کو منصوص سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ چونکہ امامت کا معیار عصمت کے ساتھ وابستہ ہے اور عصمت امر باطنی ہے لہذا جن حضرات کے متعلق رسول تنصیص کریں یہ معلوم ہوگا کہ عصمت کی صفت ان ہی میں موجود تھی اور کسی میں نہیں۔ اب اگر رسول اللہ نے اپنی اولادوں میں سے ایسے افراد کو نامزد کیا تو آنا رسول پر ایمان لانے کی بناء پر کم از کم حسن ظن سے کام لیا جائے کہ آپ نے صرف اپنی اولاد ہونے کی بنیاد پر ان لوگوں کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ان میں آپ کو وحی الٰہی ایسے اوصاف کی موجودگی کا علم ہے جو ان کو خلافت کا مستحق بنانے کا سبب ہیں۔ لیکن جبکہ رسول اللہ کیجانب سے کچھ اشخاص نامزد نہ ہوں بلکہ افراد کا انتخاب ہمیشہ امت والوں کی جانب سے ہو لیکن پھر بھی رسول اللہ کی جانب سے یہ پابندی عائد ہوجائے کہ امام ہمیشہ اسی قبیلے سے منتخب کیا جائے جس سے میں خود ہوں اسے سوائے نسلی امتیاز اور قبیلہ برادری کے کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اب جناب برنی صاحب کی "عقل عمومی" اور نیاز صاحب کے "ضمانۂ اجتماعیہ" سے انصاف و صداقت کا واسطہ دیکر یہ سوال ہے کہ کیا یہ صورت کسی طرح روح جمہوریت کے مطابق ہے اور کیا اس سے اسلام کے اصول مساوات پر کوئی ضرب نہیں لگتی۔ جناب برنی صاحب کے لب و لہجہ اور انداز میں اہلسنت کے اس عقیدہ پر غور کیجئے تو اس کا "مطلب یہ ہے کہ رسول کریم نے یہ فیصلہ کردیا تھا کہ آپ کے بعد آپ ہی کے قبیلۂ قریش میں سے کوئی خلیفہ منتخب کیا جائے اور اسکے بعد بھی ان میں ہی سے کسی کو یہ منصب جلیل تفویض کیا جائے اور اسیطرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے"۔ اب اگر آپ اس عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط کرسکتے ہیں۔ (۱) خلافت و امامت صرف قریش کے قبیلہ کے لئے مخصوص ہے۔ (۲) خلیفہ یا امام کی وفات کے بعد اسکی جانشینی کے لئے بھی قریش ہی کا کوئی آدمی ڈھونڈھا جائیگا (۳) اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہوجائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی مسند کا مستحق قرار نہیں پاسکتا (۴) دنیا کے تمام مسلمان قبیلۂ قریش کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ (۵) اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع متقی باخدا مدبر عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائیگا بلکہ قبیلۂ قریش میں سے کسی حقدار کو مسند خلافت و امامت پر متمکن کردیا جائیگا۔ اب دیکھئے کہ یہ عقائد "عقل عمومی" کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے مخالف ہیں یا نہیں اور اس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب پڑتی ہے یا نہیں اور یہ عقیدہ دنیا کے بسنے والوں کو ان کے کسی حق سے محروم کرنے کا موجب تو نہیں ہے۔ ان عقائد کا منشاء یہ ہے کہ بانی اسلام کی خواہش یہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد مسلمانان عالم پر ان کا قبیلہ تا قیام قیامت سلطان مطلق کی حیثیت سے حکمرانی کرے اور انکے قبیلہ کے افراد کے ہوتے ہوئے روئے زمین کا کوئی مسلمان مسند خلافت کا امیدوار نہ ہوسکے۔ اب برنی صاحب کے غور کرنے کی چیز ہے کہ مذکورہ بالا استحقاق کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد کیا اسکا صاف مطلب نہیں ہوتا کہ اسلام دنیا میں بغیر کسی حق کے مطلق العنانی اور ناجائز نسلی امتیاز کو قائم کرنا چاہتا ہے کیا یہ ویسا نہ ہوگا جیسے آج ہٹلر یہ طے کردے کہ "مجھے خدا کیطرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ میں اور میرے بعد میرا قبیلہ ابدالآباد تک جرمن قوم پر فرمانروائی کرے"۔ برنی صاحب کا خیال ہے کہ اگر کوئی آج ڈکٹیٹر اس طرح کا اعلان کرے تو ابھی "نگار" کا دوسرا پرچہ شائع بھی نہ ہونے پائیگا کہ اخبارات میں موٹے موٹے حروف سے لکھی ہوئی یہ سرخی پڑھ لیں گے کہ "یورپ کے ایک مخبوط الحواس ڈکٹیٹر کی لاش دریائے رائن کے سپرد کردی گئی"۔ اب برنی صاحب کو اقرار کرنا چاہئے کہ اہل سنت بھی خلافت کے عقیدہ کو جس نوع سے مانتے ہیں وہ نہ صرف انسانیت کے نقطۂ نظر سے ناقابل قبول ہے بلکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو انسان کے قوائے عمل کی صحیح نشو و نما ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔ کردار اور گفتار کی آزادی ابدالآباد تک کیلئے معدوم ہوجائے انسانوں کے باہمی امتیاز و افتراق کی ابدی

خلیجیں حائل ہو جائیں ذہنی استعداد اور معاشرتی تفوق و برتری کی وہ مکروہ فضا پیدا ہو جائے جو انسانیت کو رفتہ رفتہ ہندوؤں جیسی ذات پات کے تصور سے قریب تر کر دے۔ انسانی عقل و فکر پر پہرے بیٹھ جائیں اور دنیا کے بسنے والے خدائے واحد کے علاوہ بہت سے ایسے بتوں کی پرستش کرنے لگیں جن کو پاش پاش کرنے کی کوشش آج دنیا کے ہر گوشہ میں کی جا رہی ہے۔

چونکہ زیدی صاحب کا یہ بانگ دہل یہ اعلان ہے کہ میں ایمان و ضمیر کی پوری صداقت و بیباکی کے ساتھ رب جلیل کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ان نتائج تک پہنچنے میں فرقہ وارانہ عصبیت و تنگ نظری سے کنارہ کش ہو کر غور کرنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی شیعہ کے گھرانے میں پیدا ہوتا تب بھی غور کرنے کے بعد میرا عقیدہ یہی ہوتا جو پیش کیا گیا۔ خیر موصوف کسی شیعہ کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے لیکن اہل تسنن کے خانوادہ میں پیدا ہوئے ہیں، انہیں اہلسنت کے عقیدہ خلافت کی اس بھیانک تصویر سے جو انہی کے الفاظ کے آئینہ میں دکھلائی گئی ہے اس کا کافی موقع حاصل ہے کہ وہ مذہب اہلسنت سے کنارہ کشی اختیار کریں اور کسی ایسے مذہب کو اختیار کریں جو اس طرح کی باتوں سے پاک و صاف ہو۔

ممکن ہے آجکل کے روشن خیال اصحاب جو طبقہ علماء سے کافی بدظن ہیں یہ خیال کریں کہ یہ بعد کے علماء کی کارستانی تھی کہ انھوں نے مذہب اہلسنت میں اس طرح کی چیز داخل کر دی لیکن شروع شروع جب اہلسنت کی متعقدہ خلافت کی بنیاد پڑی تو وہ بالکل جمہوریت کے اصول کے مطابق تھی اسلئے ذرا چلئے تاریخ کے اوراق الٹ کر وفات نبی کے بعد کا دور سامنے لائیں اور سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کی داغ بیل ڈالے جانے کے منظر کی سیر کریں۔ شیخ المہاجرین حضرت ابوبکر اور جناب عمر بن الخطاب کی پرزور تقریروں کا مطالعہ کریں جنھیں کہ ان دونوں بزرگواروں نے جو اس خلافت کا سنگ بنیاد رکھنے والے تھے اس خلافت کو کن اصولوں پر مبنی کیا تھا۔ میرے سامنے ہے تاریخ طبری (ج ۳ صفحہ ۲۰۷ — ۲۰۹)

رسول اللہ کی وفات ہوتی ہے انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قرارداد ہوتی ہے کہ سعد بن عبادہ خلافت کے لئے مقرر کئے جائیں حضرت عمر کو خبر پہنچتی ہے کہ جو ابھی وفات نبی کے غم میں اتنے بدحواس اور از خود رفتہ تھے کہ مسجد میں تلوار کھینچے ہوئے ٹہل رہے تھے کہ جو شخص کہیگا کہ رسول اللہ نے انتقال کیا اس کا سر اڑا دونگا وہ اس خبر کو سنتے ہی آتے ہیں کاشانہ رسالت کی جانب جہاں رسول اللہ کی تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا ہے حضرت ابوبکر کو بلوا بھیجتے ہیں وہ عذر کرتے ہیں کہ میں یہاں مصروف ہوں تو کہلوایا جاتا ہے کہ یہاں ایک غضب ہو گیا آپ کا آنا ضروری ہے۔ حضرت ابوبکر باہر آتے ہیں جناب عمر کہتے ہیں کہ آپ کو نہیں خبر انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنا دیں حضرت ابوبکر اس خبر کو سن کر اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ اندر جا کر علی ابن ابیطالب کو اطلاع تو کر دیں جب دنیا کا قاعدہ ہے کہ کسی میت کی تجہیز و تکفین سے بغیر ضرورت کوئی شخص علیحدہ ہونا چاہتا ہے تو اسکے وارث سے جا کر اپنا عذر بیان کرتا ہے اور رخصت چاہتا ہے ممکن تھا کہ جناب علی بن ابیطالب سے اس کا تذکرہ کیا جاتا تو وہ بھی اپنی کوئی رائے اس اہم مسئلہ کے متعلق ظاہر کرتے۔ جب کہ ان حضرات کو آپ کی اصابت رائے پر اعتماد تھا کہ اپنی خلافت کے دور میں بڑے بڑے اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے تھے اور آپکی ہدایات پر کاربند ہوتے تھے مگر اس وقت اسکی ضرورت نہیں سمجھی گئی یا کسی حیثیت سے صرف خیال کیا گیا۔ بہرحال حضرت ابوبکر بھی سیدھے حضرت عمر کے ساتھ ہو لئے۔ راستہ میں ابو عبیدہ جراح ملگئے انہیں بھی اپنے ہمراہ لیا اور یہ تینوں بزرگوار سقیفہ بنی ساعدہ پہونچے۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے دل ہی دل میں ایک تقریر مرتب کر لی تھی اور کچھ پوائنٹس سوچ لئے تھے مگر حضرت ابوبکر نے مجھے تقریر سے روک دیا اور کہا کہ مجھے تقریر کرنے دو پھر جو بولنا آپ نے جو تقریر فرمائی تو جتنے پوائنٹس میرے ذہن میں تھے وہ سب اور کچھ اضافہ کے ساتھ آپ نے پیش فرمائے۔ صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کیلئے پہلے سے نہ کوئی اصول مقرر تھا نہ خاص اسکیم سوچی گئی تھی بس جو کچھ تقریر سے ظاہر ہوا اور جس بات پر اس جلسہ کی کارروائی کا اختتام ہوا وہی خلافت کا دستور العمل ہے اور وہی نظام ہے دل تو چاہتا ہے کہ اس تقریر میں کچھ اسلامی جمہوریت پسندی کا بیان ہوتا کہ اصول مساوات کو روشن کیا جاتا اور یہ کہا جاتا کہ یہ مسئلہ تمام مسلمانوں کے مفاد سے متعلق ہے کسی جماعتی استبداد سے کام نہ لو اور اتنی جلدبازی نہ کرو بلکہ اس کا انتظار کرو کہ رسول اللہ کی تجہیز و تکفین ہو جائے پھر تمام مسلمانوں کو اطلاع دو پھر ہم تم ملکر متفقہ مشورہ سے کوئی متحدہ فیصلہ کریں گے اور کسی خاص شخص جو اس منصب کا اہل ہو معین کریں گے اور ابھی تو بنی ہاشم جو خاص رسول اللہ کے دل و جگر ہیں وہ رسول کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہیں کتنا ظلم ہے کہ ان کو شریک مشورہ بھی نہ کیا جائے اور ہم لوگ خود غرضی سے کام لیکر بطور خود اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیں۔ یقیناً اس طرح کی تقریر ایسی نہ ہوتی جو اس مجمع پر اثر انداز نہ ہو جبکہ خود وہاں میں کسی حد تک قبائلی اختلافات دلوں میں کارفرما تھا یعنے قبیلہ اوس کے لوگوں کو یہ ناگوار تھا کہ سعد بن عبادہ جو رئیس قبیلہ خزرج ہیں وہ خلافت کے لئے مقرر ہوں یہی وہ چیز تھی جو بالآخر انصار کی ناکامیابی کا باعث ہوئی اور یہی کش دونوں بھی رونما ہوئی یعنی قبیلہ اوس کے افراد اسکی تائید کرتے خصوصاً جب کہ وہ ایک بات بالکل "عقل عمومی" اور "حاسہ اجتماعیہ" کے موافق تھی۔

لیکن حضرت ابوبکر نے جو اس موقع پر تقریر فرمائی وہ ملاحظہ ہو آپ نے بعد حمد و ثناء کے کہا۔

ان اللہ بعث محمداً رسولا الی خلقہ وشہیداً علی امتہ لیعبدوا اللہ ویوحدوہ وھم یعبدون من دونہ اٰلہۃ شتی ویزعمون انھا لھم عندہ شافعۃ ولھم نافعۃ وانما ھی من حجر منحوت وخشب منجور ثم قرأ (ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ وقالوا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی) فعظم علی العرب ان یترکوا دین ابائھم فخص اللہ المہاجرین الاولین من قومہ بتصدیقہ والایمان بہ والمواساۃ لہ والصبر

اللہ تعالےٰ نے مبعوث کیا حضرت محمد مصطفےٰ کو رسول بنا کر اپنے خلق کیطرف اور گواہ بنا کر اپنی امت پر تاکہ وہ خدا کی عبادت کریں اور اس کی توحید اختیار کریں اور یہ لوگ اسکے پہلے مختلف خداؤں کی عبادت کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ اصنام ان کی شفاعت کریں گے اور ان کو فائدہ پہونچائیں گے حالانکہ وہ تراشے ہوئے پتھروں اور لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی (یہ لوگ عبادت کرتے ہیں خدا کو چھوڑ کر ان چیزوں کی جو انھیں نہ نقصان پہونچاتی ہیں اور نہ فائدہ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفاعت کرنیوالے ہیں اللہ کے یہاں اور کہتے ہیں کہ ہم انکی عبادت اسلئے

من على شدة اذى قومهم لهم وتكذيبهم اياهم وكل الناس لهم مخالف زار عليهم فلم يستوحشوا لقلة عددهم وشنف الناس لهم واجماع قومهم عليهم فهم اول من عبد الله فى الارض وآمن بالله وبالرسول وهم اولياؤه وعشيرته واحق الناس بهذا الامر من بعده ولا ينازعهم ذلك الا ظالم وانتم يا معشر الانصار من لا ينكر فضلهم فى الدين ولا سابقتهم العظيمة فى الاسلام رضيكم الله انصاراً لدينه ورسوله وجعل اليكم هجرته وفيكم جلة ازواجه واصحابه فليس بعد المهاجرين الاولين عندنا احد بمنزلتكم فنحن الامراء وانتم الوزراء لا تفتاتون بمشورة ولا تقضى دونكم الامور

عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے یہاں تقرب کا باعث ہیں) رسول کی بعثت کے بعد عرب پر بہت گراں گذرا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو ترک کریں تو خدا نے مخصوص کیا مہاجرین اولین کو جو رسول کی قوم سے ساتھ آپ کی تصدیق اور ایمان اور غمخواری اور صبر کے ساتھ ان تکلیفوں پر جو خود ان کی قوم والے ان کو پہونچاتے تھے اور تمام لوگ انکے مخالف تھے اور انکی ذلت کے درپے تھے لیکن یہ لوگ گھبراتے نہیں اپنی تعداد کے کم ہونے سے اور لوگوں کی مخالفت سے اور متفق ہوجانے سے یہی لوگ سب سے پہلے عبادت کرنیوالے ہیں خدا کی زمین پر اور سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں خدا اور رسول پر اور یہ رسول کے عزیز ہیں اور ان کے قبیلے کے ہیں اور تمام لوگوں سے زیادہ ان کے بعد اس منصب کے اہل ہیں جو ان سے اس بارے میں نزاع کریگا وہ ظالم ہوگا۔ اور تم لوگ اے جماعت انصار وہ ہو کہ تمہاری دینی فضیلت اور اسلام میں تمہارے تقدم کا انکار نہیں ہوسکتا۔ تم کو خدا نے منتخب کیا اپنے دین اور رسول کی نصرت کیلئے اور تمہاری طرف انکی ہجرت قرار دی اور تم ہی میں سے اکثر انکے ازواج اور اصحاب ہیں لہذا مہاجرین اولین کے بعد ہمارے نزدیک کوئی تمہارے مرتبہ کا نہیں ہے لہذا ہم حاکم ہوں اور تم لوگ وزیر بغیر تمہارے مشورے کے کوئی کام نہ ہوگا اور ہم معاملات کو بغیر تمہارے طے نہیں کریں گے۔

تقریر ختم ہوئی۔ حضرت ابوبکر بیٹھ گئے۔ جناب بن منذر انصاری نے کھڑے ہو کر کہا۔

یا معشر الانصار املکوا علیکم امرکم فان الناس فی فیئکم وظلکم ولن یجترئ مجترئ علی خلافکم ولن یصدر الناس الا عن رایکم انتم اهل العز والثروة واولو العدد والمنعة والتجربة ذوو الباس والنجدة وانما ینظر الناس الی ما تصنعون ولا تختلفوا فیفسد علیکم رایکم وینتقض علیکم امرکم ابی هؤلاء الا ما سمعتم فمنا امیر ومنهم امیر

اے گروہ انصار تم اپنی حکومت کو اپنے قبضہ میں لاؤ کیونکہ یہ لوگ تو تمہارے زیر سایہ ہیں۔ تمہاری مخالفت کی کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی اور بغیر تمہاری رائے کے کوئی بات طے نہیں پاسکتی۔ تم لوگ اہل عزت و ثروت ہو تم کثرت تعداد اور شان و شوکت کے مالک اور آموزدہ کار ہو۔ تم شجاعت و جرأت کا جوہر رکھتے ہو۔ لوگ تمہارے طرز عمل کے نگراں ہونگے۔ بیشک تم میں آپس میں اختلاف نہ پیدا ہونے پائے ورنہ تمہارا کام بگڑ جائیگا اور بات خراب ہوجائے گی یہ لوگ اسی بات پر مصر ہیں جسے تم نے سن لیا لہذا ایک خلیفہ ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔

حضرت عمر نے اس تقریر کو سن کر فرمایا۔

هیهات لا یجتمع اثنان فی قرن والله لا ترضی العرب ان یؤمروکم ونبیها من غیرکم ولکن العرب لا تمتنع ان تولی امرها من کانت النبوة فیهم وولی امورهم منهم ولنا بذلک علی من ابی من العرب الحجة الظاهرة والسلطان المبین من ذا ینازعنا سلطان محمد وامارته ونحن اولیاؤه وعشیرته الا مدل بباطل او متجانف لاثم او متورط فی هلکة۔

اوہ۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ایک وقت میں دو خلیفہ ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس بات پر راضی نہ ہونگے کہ وہ تمہیں اپنا حاکم تسلیم کریں جبکہ پیغمبر انکا دوسری قوم و قبیلے سے ہو لیکن عرب اس بات سے انکار نہیں کریں گے کہ اس قوم و قبیلہ کی امارت تسلیم کریں جس میں پیغمبر ہو کون شخص ہم سے محمد کی سلطنت اور انکی امارت میں نزاع کرسکتا ہے درانحالیکہ ہم انکے عزیز ہیں اور انکے قوم و قبیلے کے ہیں مگر یہ کہ کوئی ناحق کوش ہو یا گناہ کا مرتکب یا ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والا۔

جناب بن المنذر کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں تقریر شروع کی۔

یا معشر الانصار املکوا علی ایدیکم ولا تسمعوا مقالة هذا واصحابه فیذهبوا بنصیبکم من هذا الامر فان ابوا علیکم ما سألتموه فاجلوهم عن هذه البلاد وتولوا علیهم هذه الامور فانتم والله احق بهذا الامر منهم فانه باسیافکم دان لهذا الدین من لم یکن یدین به انا جذیلها المحکک وعذیقها المرجب اما والله لئن شئتم لنعیدنها جذعة

اے گروہ انصار اپنی طاقتوں کو اپنے ہاتھ میں لاؤ اور اس شخص اور اسکے ساتھیوں کی بات سنو جس سے تمہارے حقوق اس منصب میں تلف ہوں اگر یہ لوگ نہ مانیں تو انہیں اس ملک سے باہر نکالدو اور خود اطمینان سے حکومت کرو۔ کیونکہ تم بخدا اس امر کے ان سے زیادہ مستحق ہو کیونکہ تمہاری تلوار سے لوگوں نے اس دین کو اختیار کیا۔ میں تجربہ کار مرد میدان ہوں اور تم کہو تو ابھی ابھی "ہمیں گو و ہمیں میدان"

نتیجے یہ سمجھا گیا کہ موجودہ زمانے کے جلسوں کا منظر سامنے آگیا۔ حضرت عمر نے کہا اس صورت میں خدا تجھے غارت کریگا۔ حباب نے بڑھ کر کہا تجھے کیوں مجھے غارت کریگا۔ ابو عبیدہ نے بیچ بچاؤ کی ٹھانی اور کہا انصار تم نے سب سے پہلے نصرت کی اب تمہیں سب سے پہلے رسول کی تعلیم سے منحرف نہ ہو۔ بشیر بن سعد جو قبیلہ اوس سے تھے اور سعد بن عبادہ کی خلافت کے منصوبہ سے دل میں مخالف و حاسد ہو گئے اور کہنے لگے

یا معشر الانصار انا واللہ لئن کنا اولی فضیلة فی جهاد المشرکین وسابقة فی هذا الدین ما اردنا به الا رضی ربنا وطاعة نبینا والکدح لانفسنا فما ینبغی لنا ان نستطیل علی الناس بذلک ولا نبتغی به من الدنیا عرضا فان اللہ ولی المنة علینا بذلک الا ان محمدا صلی اللہ علیه وسلم من قریش وقومه احق به واولی وایم اللہ لا یرانی اللہ انازعهم هذا الامر ابدا فاتقوا اللہ ولا تخالفوهم ولا تنازعوهم۔

اے گروہ انصار خدا کی قسم اگرچہ ہمیں فضیلت حاصل ہے مشرکین سے جہاد اور دینی خدمات کی مگر ہمارا مقصد اس سے صرف خدا کی خوشنودی اور رسول کی اطاعت اور اپنے نفوس کی اصلاح تھی اس لئے ہمارے لئے ہرگز مناسب نہیں کہ اسکے سبب سے لوگوں پر تفوق کی کوشش کریں اور اپنے خدمات کا دنیاوی فائدہ حاصل کریں۔ آگاہ ہو کہ حضرت محمد مصطفےٰ قریش سے تھے اور انہی کی قوم و قبیلہ کے افراد انکی خلافت کے زیادہ حقدار ہیں۔ خدا کی قسم میں تو اس امر میں ان سے نزاع ہرگز نہیں کرونگا تم لوگ خدا کا خوف کرو اور انکی مخالفت و منازعت سے باز آؤ۔

نتیجے یہ حال درست ہو گیا۔ حضرت ابوبکر نے عمر اور ابو عبیدہ کا نام پیش کیا کہ ان میں سے کسی ایک کی بیعت کیجائے ان دونوں بزرگوں نے حضرت ابوبکر کی سفارش کی۔ بشیر بن سعد نے بڑھ کر انکی بیعت کی اور عمر و ابو عبیدہ نے بھی فوراً بیعت کر لی۔ جلسہ میں برہمی پیدا ہو گئی (رحماء بینہم کا معکوس منظر سامنے آگیا) بعض انصار بشیر بن سعد کو گالیاں دینے لگے ادھر کے لوگ غصہ میں اور بڑھے سعد بن عبادہ لاتوں میں آگئے کسی نے کہا سعد کا خیال کرو پامال نہ کرو۔ حضرت عمر نے کہا اسے قتل کرو خدا اسے قتل کرے اور سرہانے کھڑے ہو کر کہا میرا تو جی چاہتا ہے کہ تجھ کو اپنے پیروں سے اس طرح کچلوں کہ تیری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ سعد حضرت عمر کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں۔ حضرت ابوبکر بڑھ کر چھڑا دیتے ہیں اور حضرت عمر کو سمجھا کر الگ لیجاتے ہیں۔ رسول اللہ کی خلافت پایۂ تکمیل پر پہونچ جاتی ہے۔ افسوس پوری اسکیم اس ہنگامی صورت سے مرتب ہو جاتی ہے جو آجتک شیعہ سنی اختلاف کی اصلی بنیاد ہے۔ ابھی حضرت عمر کو پورے طور سے اطمینان حاصل نہیں تھا کہ جو کارروائی ہم نے کی ہے اسمیں ہم آخر تک کامیاب بھی رہیں گے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ عام بھیڑ یا دھسان ہوتی ہے۔ قبیلہ اسلم کے اعراب جو اطراف مدینہ میں مقیم تھے یہ خبر ہوئی تھی کہ رسول اللہ کی وفات ہو گئی اور ہزاروں آدمیوں کی تعداد میں مدینہ آجاتے ہیں اس طرح کہ انسے گلی راستے مدینہ کے پر ہو جاتے ہیں وہ پوچھتے ہیں کہ خلیفۂ رسول کون ہے اور کوئی کہدیتا ہے کہ حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہو گئے اور وہ آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر کی بیعت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عمر کی مسرت کی انتہا نہیں رہتی خود ان کا ارشاد ہے "ما ھو الا ان رایت اسلم فایقنت بالنصر"۔ جب قبیلہ اسلم کو میں نے دیکھا تو سمجھا کہ فتح و ظفر ہمیں حاصل ہو گئی۔ آپکا یہ سمجھنا بالکل بجا تھا کہ ان ہزاروں آدمیوں کی بیعت کرنے کے بعد اب کتنی ہی معقول دلائل کیساتھ کوئی مخالفت کرتا لیکن انسے باہمی کوئی اس سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا اور اسکے ساتھ ہی یہ کہ جو عرب کے ان قبائل کا جنہوں نے حاکم موجودہ کی اطاعت سے انکار کیا "مرتدین" کے نام سے انکے ساتھ ایک اسلامی فریضہ بناکر ضروری سمجھا گیا۔

بہر حال گذشتہ تقریروں اور انکے نتیجے سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت کو کس اصول پر مبنی قرار دیکر کامیابی حاصل کر لی گئی۔ انصار کے مقابلہ میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ رسول جس قبیلہ سے تھے اسی قبیلہ میں خلافت بھی ہونی چاہئے اور اسکے اوپر اصرار کے ساتھ تکمیل کا پیچ کھلا ہوا تھا یعنی سب کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس زور و زوری اور وقتی دھاندلی سے جو خلافت حاصل ہوئی اسکے ماننے والے آج یہ کہہ رہے ہیں کہ نسلی امتیاز کو معیار خلافت قرار دینا "عقل عمومی" اور "حاسۂ اجتماعیہ" کے خلاف ہے اور وہ اسلام کی روح جمہوریت و مساوات کے منافی ہے۔ انصار کے مقابلہ میں جو دلائل پیش کئے گئے انکی کامیابی کیلئے ضرورت اسی بات کی تھی کہ بنی ہاشم کا کوئی نمائندہ اور خصوصاً حضرت علی ابن ابیطالب اس مجمع میں نہوں۔ ورنہ جتنے دلائل استحقاق امامت میں پیش کئے گئے سب کا نتیجہ معکوس ہو جاتا۔ پہلی دلیل ہے سبقت الی الاسلام والعبادة (فنحن اول من عبد اللہ فی الارض وامن باللہ وبالرسول) حالانکہ اب کہا جاتا ہے کہ دیکھئے نیاز صاحب کا مجلہ اور جلیل الرحمن صاحب اعظمی کا مضمون اس کا مقصود کہ سبقت الی الاسلام کو خلافت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ اگر علی ابن ابیطالب موجود ہوتے تو وہ اسی حیثیت سے اپنے اوپر منطبق کرتے جیسا کہ بعد میں انہوں نے کہا "امنت قبل ان یومن ابوبکر و اسلمت قبل ان یسلم ابوبکر" یعنے میں ایمان لایا قبل اس کے کہ ابوبکر ایمان لائیں اور اسلام لایا قبل اسکے کہ وہ مسلمان ہوں۔ دوسری دلیل قرابت اور عزیزی۔ اسکے لئے ظاہر ہے کہ جس طرح قریش کو انصار کے مقابلہ میں ترجیح حاصل تھی اسی طرح بنی ہاشم کو تمام قبائل قریش کے مقابلہ میں اور ذریت رسول کو تمام بنی ہاشم سے اسی لئے جب حضرت علی کو سقیفہ کے حالات معلوم ہوئے اور یہ سنا کہ قریش نے استدلال پیش کیا کہ ہم شجرۂ الرسول ہیں اسلئے خلافت کا حق ہمکو حاصل ہے تو آپنے فرمایا "تعلقوا بالشجرة واضاعوا الثمرة" درخت کا تو خیال کیا اور میوہ کو ضائع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی روح جمہوریت و مساوات کا خیال مد نظر ہوتا تو خلافت کیلئے انصار کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کیجاتی بلکہ سب سے پہلے یہ مثال قائم ہوتی کہ رسول سے بالکل اجنبیت رکھنے والے غیر قوم و قبیلہ کے شخص کو خلافت کیلئے منتخب کیا جاتا اور خود مہاجرین اپنی پوری طاقت اسکی تائید و حمایت و اتباع و اطاعت میں مبذول کر کے اقوام عالم کو دکھلا دیتے کہ اسلامی خلافت کس جمہوریت و مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ خلافت اگر کسی نص پر مبنی نہیں ہے اور شیعوں کا نقطۂ نظر خلافت کے بارے میں صرف قرابت کے اصول پر مبنی ہے تو اس کا سنگ بنیاد حقیقتہً سقیفہ میں پڑا ہے اور حضرت ابوبکر و عمر اس نظریہ کے سب سے پہلے قائم کرنے والے ہیں جسے آج تمام مسلمانوں کے حقوق پر ضرب کاری کہا جا رہا ہے۔ اسلامی خلافت جمہوری اصول پر مبنی ہونا چاہئے مگر ذرا دیکھئے کہ رسول اللہ کی زندگی میں اسلامی حلقہ کتنا وسیع ہو چکا تھا لیکن اس تمام حلقہ کی کسی طرح کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔ خاص مدینہ میں اور وہ بھی چند آدمیوں کی جانب سے اس مسئلہ کو طے کیا گیا جسکی بنا پر یہ اصول مقرر ہو گیا کہ اگر دو چار آدمی اہل حل و عقد میں سے جمع ہو کر کسی کو خلافت کیلئے نامزد کر دیں تو وہ خلیفۂ رسول مقرر ہو جائیگا جسکے بعد کسی کو اختلاف کا حق نہ ہوگا اور کوئی اختلاف کرے تو وہ "قابل گردن زدنی" ہوگا۔

ملاحظہ شرح مواقف (مطبوعہ نولکشور ص ۳۰۳)

وإذا ثبت حصول الامامة بالاختيار والبيعة فاعلم ان ذلك الحصول لا يفتقر الى الاجماع من جميع اهل الحل والعقد اذ لم يقم عليه اى على هذا الافتقار دليل من العقل والسمع بل الواحد والاثنان من اهل الحل والعقد كاف فى ثبوت الامامة ووجوب الاتباع على اهل الاسلام وذلك يعلمنا ان الصحابة مع صلابتهم فى الدين وشدة محافظتهم على امور الشرع كما هو حقها اكتفوا فى عقد الامامة بذلك من الواحد والاثنين كعقد عمر لابى بكر وعقد عبد الرحمن بن عوف لعثمان رضى الله عنهم ولم يشترطوا فى عقدها اجتماع من فى المدينة من اهل الحل والعقد فضلا من اجماع الامة من علماء امصار الاسلام ومجتهدى جميع اقطارها هذا كما مضى ولم ينكر عليه احد وعليه اى على الاكتفاء بالواحد والاثنين فى عقد الامامة انطوت الاعصار بعدهم الى وقتنا هذا۔

جب ثابت ہو چکا کہ امامت حاصل ہونے کے لئے اختیار اور بیعت ہی ثابت ہوتی ہے تو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے لئے تمام ارباب بست وکشاد کا متفق ہونا ضروری نہیں کیونکہ اس پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک یا دو اہل حل وعقد کا بیعت کرنا کافی ہے اور اس لئے امامت ثابت ہو جائے گی اور اس امام کا اتباع تمام اہل اسلام پر واجب ہو جائے گا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صحابہ نے باوجود مذہبی امور میں سخت ہونے کے اور شرعی احکام کے پورے طور پر پابند ہونے کے امامت کے منعقد ہونے کے لئے ایک یا دو کی قرارداد کو کافی سمجھا جیسے حضرت عمر کا رائے دینا حضرت ابوبکر کے لئے اور عبد الرحمن بن عوف کا منتخب کرنا حضرت عثمان کو اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ خاص مدینے کے تمام اہل حل وعقد جمع ہوں چہ جائیکہ تمام ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کا اور تمام اطراف دنیا کے مجتہدین کا اجماع واتفاق۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور اسی طریقہ پر کہ ایک یا دو کا مقرر کرنا امامت کے لئے کافی سمجھا جائے زمانے گزرتے رہے ان کے بعد سے برابر آج کے دن تک۔

یہی گروہ جمہوری اصول خلافت جس کو تمام افراد اسلام کے حقوق کی رعایت کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے اور جسے عقل عمومی اور حالات اجتماعیہ کے مطابقت کی سند دی جا رہی ہے۔ اچھا حضرت ابوبکر خلیفہ ہو گئے اور مان لیجئے کہ اجماع امت سے ہوئے لیکن ان کے بعد حضرت عمر کی خلافت استخلاف کے ذریعہ سے ثابت ہوئی ہے یعنی حضرت ابوبکر اپنے بعد کے لئے ان کو خلیفہ بنا جاتے ہیں اور ان کا عجیب طریقہ سے اقرار لیا جاتا ہے جس کی مثال شاید دنیا کی تاریخ میں ان کے سوا نہ مل سکے ملاحظہ ہو شرح عقائد نسفی۔

ان ابا بكر لما آيس من حيوته دعا عثمان رضى الله عنه واملى عليه كتاب عهده لعمر فلما كتب ختم الصحيفة واخرجها الى الناس وامرهم ان يبايعوا لمن فى الصحيفة فبايعوا حتى مرت بعلى رضه فقال بايعنا لمن كان فيها وان كان فيها عمر۔

حضرت ابوبکر جب اپنی زندگی سے مایوس ہوئے تو حضرت عثمان کو بلوایا اور ان کو لکھوائی حضرت عمر کی خلافت کی دستاویز جب یہ لکھی جا چکی تو اس کاغذ کو سر بمہر کیا اور اس کاغذ کو لوگوں کے سامنے باہر نکالا اور حکم دیا کہ بیعت کریں اس شخص کی جس کا نام کاغذ کے اندر ہے۔ سب نے اسی طرح بیعت کی جب حضرت علی کے پاس یہ کاغذ آیا تو آپ نے کہا ہم نے بیعت کی اس شخص کی جس کا نام اس میں ہے اگرچہ وہ عمر ہوں۔

خلیفہ کے انتخاب کی آخری حد جس پر اوار خلافت کی جانب سے لوگوں نے بیعت کی۔ تاریخ طبری کو صاف ظاہر کرتی ہے کہ صحابہ حضرت عمر کی ولیعہدی پر راضی نہیں تھے (ملاحظہ ہو طبری جلد ۴) عبد الرحمن بن عوف بیماری کی حالت میں حضرت ابوبکر کے پاس گئے حضرت ابوبکر نے ان سے مخاطب کر کے کہا۔ انی ولیت امرکم خیرکم فی نفسی فکلکم ورم انفه من ذلک یرید ان یکون له الامر دونه میں نے اس شخص کو مقرر کیا جو میرے نزدیک تم سب میں بہتر ہے تو تم میں سے ہر ایک کی ناک پھول گئی اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ خلافت کا منصب اسی کے لئے ہوتا اور عمر کو نہ ملتا۔

آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ کا کسی کو مقرر کرنا تو اصول جمہوریت کے خلاف قرار دیا جائے اور آپ کے مسلمانوں کے حقوق پر عیب نہ آئے... لیکن حضرت ابوبکر کی یہ شاہانہ کارروائی بالکل درست اصول جمہوریت کے مطابق اور عقل عمومی وحالات اجتماعیہ کے مطابق ہو۔ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان کی خلافت کا مسئلہ کس طرح مقرر کیا گیا کہ حضرت عمر نے ایک چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا دی کہ یہ لوگ اپنے میں کسی ایک کو منتخب کریں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام شرق وغرب کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ان چھ آدمیوں کے ہاتھ میں آ گیا اور کسی دوسرے شخص کو کوئی رائے زنی کا حق باقی نہیں رہا۔ چھ آدمی بھی جمہور قوم کے منتخب کئے ہوئے نہیں بلکہ خود خلیفہ نے اپنی مرضی سے منتخب کیا اس میں تمام ذمہ داری انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ اب اسے جانے دیجئے کہ ان افراد کے انتخاب میں کیا مصلحت ملحوظ تھی اور یہ کہ عبد الرحمن بن عوف کو اس کمیٹی کا صدر کس نے قرار دیا تھا اور کمیٹی کی کارروائی میں کیا جانبداری مصلحت عمل میں آئی۔ اس سب کو جانے دیجئے کمیٹی نے انتہائی دیانتداری کے ساتھ بھی فیصلہ کیا ہو لیکن آخر اس فیصلہ میں جمہور قوم کی رائے دہندگی کا حاصل کیا ہوا کیا ان کے حقوق پر ضرب نہیں پڑی اور کیا اس سے ان کی آزادی حریت و ضمیر کو صدمہ نہیں پہنچا اور کیا اس کی سند اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ہے اس اصول خلافت کی تشکیل کی سرگزشت جس کو اصولی حیثیت سے اختلاف رکھنے کی بنیاد پر شیعہ اسلام اور انسانیت کے وسیع احاطہ سے خارج کئے جاتے ہیں اور انہیں عقل عمومی و حالات اجتماعیہ کا مخالف بتلایا جا رہا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ روح حقیقت کی قسم شرف انسانیت کی قسم اور آتی دیانت کی حرمت کی قسم کہ مذہبی تعصبات کو بالکل ہٹا کر ہوتے ایک غیر جانبدار انسان کی حیثیت سے جہاں تک غور کرتا ہوں مجھ کو یہی نظر آتا ہے کہ اگر خلافت کوئی چیز ہے تو شیعہ کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے کہ رسول اللہ نے وحی الہی کی بنا پر اپنے بعد کے لئے خلیفہ کو نامزد کر دیا اور اس کا اظہار فرما دیا جس کے بعد کسی مسلمان کو کوئی ایسا طریقہ انتخاب واختیار کا حق باقی نہیں رہا اور یہی ٹھیک ہے کہ اگر خلافت اس صورت سے نہ ثابت ہو تو پھر حقیقت میں کوئی چیز ہی نہیں ہے بلکہ خوارج کا مسلک ٹھیک ہے کہ جب ضرورت ہو جہاد کا موقع پیش آئے تو وقتی حیثیت سے ایک حاکم مقرر کر لیں اور اس کے آگے نہ خلافت کوئی چیز ہے نہ خلیفہ کو کوئی مذہبی حیثیت حاصل ہے۔

شیعی مذہب کی کتنی غلط تصویر پیش کی گئی ہے ان الفاظ میں کہ "کوئی اتفاقی دیکھنے کی بات دلا اور رسول نیز کے تمام انسانوں پر ابد الآباد تک حکمران ہونے کی حقدار ہے اور آل علی کا یہ حق چاہے کیسا ہی استحقاق ... لیکن ... ان کو نہ تمام مسلمانوں کے سامنے عقیدت واحترام کے ساتھ سر جھکانا ہے۔" یہ صورت گری اس وقت درست ہوتی کہ شیعہ انتخاب واختیار کو حاکم کے سپرد فرما دیں کہ بہر حال آل علی ہی میں سے ہو اسی کی شرط قرار دیتے لیکن چونکہ وہ نص پر مبنی ہے اور اسی لئے جس کے واسطے نص ثابت ہو وہ صرف وہی مستحق خلافت ہے تو اسی کی بنا پر یہ استحقاق نہیں ہو سکتا کہ وہ شمار حکمرانی کرے۔ شیعہ مذہب کی یہ خصوصیت بالکل نمایاں ہے کہ وہ ان بادشاہوں کو نا اہل سمجھتے ہیں اور علوی نژاد بالکل اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے خلفائے بنی امیہ وبنی عباس کو اور کسی مذہبی حیثیت کے اُن کے قائل نہیں ہیں۔

استدلال بے مائیگی کا کتنا حسرتناک مظاہرہ ہے خلافت الٰہیہ کے عقیدہ کے غلط ثابت کرنے کے لئے آغا خان اور نظام سیف الدین کی اور ان کے اتباع کی مثال پیش کرنا اور اس پر یہ دعوی کرنا کہ اگر تمام مسلمان "الوہی خلافت" کے مسئلہ پر ایمان لے آتے تو تمام جالیس کروڑ فرزندان توحید کا یہی عالم ہوتا۔ دنیا کو معلوم ہے کہ "خلافت الٰہیہ" کا عقیدہ شیعہ جماعت کا طرہ امتیاز ہے اور شیعوں کا وہ فرقہ جو دنیا کے ہر حصہ میں بڑی کثرت تعداد کے ساتھ موجود ہے اور اثنا عشریہ کے نام سے موسوم ہے اور جس کے لاکھوں افراد ہندوستان میں موجود ہیں وہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ ہے جو خلافت الٰہیہ کے عقیدہ کو اختیار کرنے کے لوازم میں سے ہے آدمی کی تاریکی کا نظر جو جناب نیاز صاحب نے اظہار کے مطابق آغا خانی یا داؤدی جماعت میں ہے تو موقوف کر اپنے دعوی کے ثبوت میں ... [illegible]

... کیا یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ "الوہی خلافت" کے نتائج کو دکھانے میں آغا خان و ملا سیف الدین کی مثال پیش کی جائے ... [illegible]

براہ راست عقل عمومی اور حالات اجتماعیہ کے مطابق ہے ... [illegible]

... [illegible]

جہاں ... [illegible]

... [illegible]

[illegible]

نغمۂ کارواں

مرزا احمد سہراب کی کتاب "سانگ آف دی کارواں"

سے ماخوذ و مقتبس

ایک رمزیہ داستان جس میں بتایا گیا ہے کہ اختلاف مذاہب کیونکر مٹ سکتا ہے
اور دنیا کا کھویا ہوا امن و سکون حاصل کرنے کی کیا صورت ہے

نیاز فتحپوری

نغمۂ کارواں

افراد:—

نام	خدمت مفوضہ	مسکن
آوارہ گرد	اس داستان کا بیان کرنے والا	کرۂ زمین
تماشا	آوارہ گرد کا رہنما	
معلم کائنات کی روح	عقل و فراست کا مالک	کوکب اعظم
دلارام (عورت)	آزادی کی حامی	زہرہ
جام زر	فلسفی	کوکب الدجاجہ
نسیم	آسمانی پیامبر	کوکب اعظم
صرصر	کائنات کی روح مقدس کا حواری	مریخ
دوست پرست	صلح کا حامی	قنطوروس
حاکم حاکمیاں	سیاروں کا جغرافیہ داں	زحل
آزادپا (عورت)	رقاصہ	دبران
آتشبار	شاعر	مشتری
شہناز نور (عورت)	مغنیہ	نجم الشعری
آہنگ زن	منشی	عطارد
بازدل	ڈرامہ نگار و ممثل	النسر الطایر
جہاں نما	نقاش	اورانوس
تصویرکش	بُت ساز	نپچون
پسند بنا	ماہر فن تعمیرات	منکب الجوزاء
روح افزا	ماہر جمالیات	قلب العقرب
صحت دہ	حکیم	سماک رامح
زور افشاں	پہلوان	سہیل
دربار عدلی	سیاست داں	سماک رامح
علم پرواز	نفسیات داں	عیوق
فراواں طاہر	صدر جمہوریت	کوکب اعظم
افشار شاد	صدر جمہوریہ کی بیوی	״
گورگور	نائب صدر جامعۂ جامعات	״
ظلمانی	آسمانوں کا شیطان	״
دشمن شباب	دُنیا کا دشمن	کرۂ زمین

پہلا باب

(بیداری)

"تماشا" نے نغمۂ کارواں ختم کیا اور اس کی حزیں آواز دور افق میں فنا ہوگئی

قصہ خواں نے اپنی داستان ختم کی اور میر کارواں نے اپنی بانسری علحدہ رکھدی — الاؤ کی روشنی تھکے ہوئے اہل کارواں کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور "وادیِ بہارستان" سنسان تاریکی سے معمور تھی۔ سفر طویل تھا اور موسم گرم، راہ دشوار تھی اور گرد آلود، اس لئے میں تھک کر گر گیا۔ نغمۂ کارواں ابھی تک میرے دماغ میں گونج رہا تھا اور اسی محویت کے عالم میں مجھے نیند آگئی — میں کہتا ہوں کہ "نیند آگئی" حالانکہ میں خواب میں بھی اپنے آپ کو بیدار پاتا تھا — عالم ہوش سے زیادہ بیدار! میرا جسمانی اور روحانی احساس اسوقت دنیاوی علایق سے بالکل آزاد تھا۔ میری آنکھیں اسوقت لاکھوں میل کے فاصلہ کو صاف صاف دیکھ رہی تھیں، میرے کان اُن نظر نہ آنے والے فرشتوں کی پرواز کو سن سکتے تھے جو فضائے محیط میں اُڑ رہے تھے اور میری روح غیر محدود و غیر معلوم کائنات کی وسعت پر الہام کی طرح چھائی جارہی تھی

عجیب بات یہ تھی کہ تماشا بھی اپنی بانسری لئے ہوئے میرے ساتھ تھا

اسنے کہا :۔ "اے ابدیت کے آوارہ گرد سیاح، کدھر کا قصد ہے؟"

میں نے پوچھا :۔ "اور تم کہاں جارہے ہو"

اس نے کہا :۔ "دور، ستاروں کی روشنی کی طرف"

میں نے پوچھا :۔ "کیا تمھیں کوئی رفیق سفر درکار نہیں"

اس نے کہا :۔ "ہے، بشرطیکہ آنکہ دل مضبوط اور ارادہ غیر متزلزل رکھتا ہو"

میں نے جواب دیا :۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے احکام سے سر مو انحراف نہ کروں گا"

تماشا :۔ "مگر یہ سفر معمولی سفر نہیں ہے"

میں :۔ "مجھے معلوم ہے۔ لیکن کیا تم میرے بچپن کے ساتھی نہیں ہو اور کیا میں نے تم پر ہمیشہ بھروسہ نہیں کیا"

وہ :- " نے میرے عزیز دوست، سچ کہتے ہو، اچھا تو آؤ چلیں "

میں :- " تو کیا ہم ان تمام گردش کرنے والے کُروں میں پہونچ سکیں گے "

وہ :- " کیوں نہیں، ہم وہاں ان کُروں کے باشندوں سے گفتگو کرکے، اُن کے اُصول زندگی بھی معلوم کریں گے "

میں :- " تاکہ واپس آکر ہم اپنے ساتھیوں کو بتائیں "

وہ :- " مگر مجھے امید نہیں کہ تمھارے ساتھی تمھاری سنیں گے، کیونکہ یہ سب بہرے ہیں گونگے ہیں اور اندھے "

میں :- " نہیں ایسا نہ کہو میں سمجھتا ہوں کہ نوعِ انسانی اب کچھ سیکھنے کے لئے آمادہ ہے، ایک غیر معلوم سی جستجو اس کے اندر پیدا ہو گئی ہے "

وہ :- " کس چیز کی جستجو "

میں :- " جستجو خدا کی، صداقت کی، آزادی کی اور اس سفر میں تمھارے ساتھ چلنے سے میرا مقصد یہی ہے کہ میں آسمانی تہذیب اور آسمانی قانون سیکھ کر آؤں اور دُنیا میں " انسانیت جدیدہ " کی بنیاد قایم کروں "

وہ :- " تم کبھی کامیاب نہ ہوگے، تمھاری راہ میں کانٹے بچھائے جائیں گے، تم کافر و ملحد کے نام سے یاد کئے جاؤ گے لوگ تم سے نفرت کرنے لگیں گے، تم کو قید کر دیں گے اور ہو سکتا ہے کہ سولی پر بھی چڑھا دیں "

میں :- " کچھ پرواہ نہیں، میں کوشش ضرور کروں گا "

وہ :- " اور اگر ناکام رہے "

میں :- " تو میں پھر کوشش کروں گا "

تماشا نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کچھ دیر تک ہم دونوں پر گہری خاموشی طاری رہی

میں نے اس سے پوچھا کہ :- " یہ تو بتاؤ ہم اس فضا میں پرواز کیونکر کر سکیں گے "

وہ بولا کہ :- " شہپروں سے "

میں :- " یہ شہپر کیسے پیدا ہوں گے "

تماشہ :- " دنیا کا یہ جامہ اُتار کر ہم کو اُس نقرئی جھیل میں جو وادیوں اور پہاڑوں کو تبسمِ حیات سے لبریز کئے ہوئے ہے نہانا پڑے گا "

چنانچہ ہم دونوں نے اپنا لباس رنگارنگ اُتار ڈالا اور اس بلوری جھیل میں داخل ہو گئے، کچھ دیر تک ہم دونوں اس کی سرد گہرائیوں میں کھیلتے رہے اور پھر تابناک سطح پر اُبھر آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے اندر ایک نوع کا اثیری ہلکاپن پاتا ہوں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابدیت کے چشمہ میں مجھے اصطباغ دیا گیا ہے اور میں اپنا جسم چھوڑ کر ایک خواب کی سی لطیف و روحانی کیفیت میں تبدیل ہو گیا ہوں

آخر کار جب میں جھیل سے باہر آیا تو ایک عجیب مسرت کی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ یہ جی چاہتا تھا کہ بچوں کی طرح چیخوں، چلاؤں، ناچوں اور کائنات کی شرائین میں خون کی طرح دوڑتا پھروں۔ میں نے بیتابانہ تماشا کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولا۔

"اے تماشا، ذرا مجھے چھو کر تو دیکھو، میرا جسم کہاں غائب ہو گیا، میرا وزن کہاں چلا گیا، میں تو اب اُڑنا چاہتا ہوں"

تماشا:۔ "ہاں تم اب اُڑ سکتے ہو"

میں:۔ "لیکن شہپر تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے"

تماشا:۔ "شہپر پیدا ہو گئے ہیں لیکن تم انھیں دیکھ نہیں سکتے اور اب تم اس غیر محدود نیلگوں فضا میں آسانی سے تیر سکتے ہو"

اس وقت فرطِ مسرت سے میرا عجیب حال تھا۔ میں بولا۔ "بیشک اس فضا کو میں عبور کروں گا۔ میں جوہرِ کل سے پیدا ہوا ہوں، ابدیت کے تخت پر جلوہ افروز ہوں، کائنات کا آئینہ ہوں۔ میں ضرور اُڑوں گا اور "فردوسِ جمال" کے بنے ہوئے نغمے انسانیت کو سناؤں گا، میں فضاءِ غیر محدود میں پرواز کروں گا اور وہاں سے آزادی کی نئی روح دنیا کے لئے لاؤں گا صداقت کا نیا پیغام اہلِ عالم کو پہونچاؤں گا"

تماشا نے میرا بازو پکڑا اور ہم دونوں فضا میں بلند ہو گئے

دوسرا باب

(رواقِ لانہایت)

جس وقت ہم اس غیر محدود فضا میں اُڑ رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ کائنات آثارِ حیات سے معمور ہے اور ہم قبۂ سماوی میں چاروں طرف روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ ستاروں کا رومان آفریں منظر ہمیں مسحور کئے دے رہا تھا اور روشنی کے اس سیلاب میں ہم بہے جا رہے تھے۔ اس وقت ستاروں کی زندگی اور میری دونوں ایک سی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اجرامِ کائنات کی موسیقی کے ضربات میں تحلیل ہو گیا ہوں

میں نے اپنے رفیق سے انتہائی مسرت کے عالم میں پوچھا۔ "ہم کہاں ہیں، ہمارا وطن، ہمارا کرۂ زمین کہاں ہے"

اسنے کہا:۔ "وہ دیکھو فضا کے عمق میں دور کیا چیز چمک رہی ہے"

میں:۔ "کوئی ستارہ ہے" —— تماشا:۔ "یہی تمھارا وطن ہے، یہی کرۂ زمین ہے"

میں:۔ "تو ہمارا کرہ بھی ستارہ بن گیا۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ کیسا خوبصورت معلوم ہوتا ہے"

تماشا:۔ "وہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی چمکتا ہوا ستارہ ہے لیکن انسان اسے زمین سمجھ کر اسپر قابض ہونے کے لئے ہمیشہ ایکدوسرے سے لڑتے رہتے ہیں

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور برابر اُڑتا رہا۔ روشنی کا وہ عمیق سمندر، رنگینیوں کا وہ بڑھتا ہوا سیلاب اور اس میں میری سُبک پرواز! اب کیا کہوں کہ اس وقت میری خوشی کا کیا عالم تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس بحرِ نور و رنگ میں اپنی حباب آسا ہستی پر غور کرکے کانپنے بھی لگتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے گھبرا کر تماشا سے پوچھا کہ "عطارد کہاں ہے"

تماشا:۔ "وہ یہاں کہاں، دُور، غیر محدود افق میں کسی جگہ چھپا ہوگا" ——— میں:۔ "اور زہرہ"

تماشا:۔ "اس کو کرۂ زمین کے عُشاق ہی دیکھ سکتے ہیں، یہاں سے وہ نظر نہیں آسکتا" ——— میں:۔ "اور خونخوار مریخ"

تماشا:۔ "یہ اُن جنگجو لوگوں سے پوچھو جو خون بہانے کے لئے اس کی مدد چاہتے رہتے ہیں"

میں:۔ "لیکن مشتری تو نظر آنا چاہئے"

تماشا:۔ "فضائے بسیط میں جو ایک چیز جگنو کی طرح چمک رہی ہے وہی مشتری ہے" ——— میں:۔ "اور زحل کہاں ہے"

تماشا:۔ "وہ مدہم سی مٹیالی روشنی زحل ہی کی ہے" ——— میں:۔ "اُرانوس و نیچون کہاں ہیں"

تماشا:۔ "یہ ہماری نگاہ کی رسائی سے باہر ہیں" ——— میں:۔ "تو کیا ہم نظامِ شمسی کے حدود سے باہر آگئے ہیں"

تماشا:۔ "یقیناً، اس وقت ہم کہکشاں کے اندر سے ہوکر گزر رہے ہیں اور کائنات کے اُس حصہ میں ہیں جہاں کروڑوں آفتاب اپنے جدا جدا نظام کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور جہاں اسوقت تک کوئی نہیں پہونچا"

یہ سُنکر اول اول مجھ پر کچھ خوف سا طاری ہوا، لیکن تخلیقِ اعلیٰ کے اس ڈراما کو دیکھنے، کائنات کے راز کو سمجھنے کا شوق مجھ پر اتنا غالب تھا کہ مسرت کی ایک نئی لہر پھر میرے اندر دوڑ گئی اور ہم دونوں اور زیادہ بلند ہوگئے

اب روشنی کی کرنیں ہمارے جسموں کے اندر سے گزر رہی تھیں اور ہم بے شمار، آفتابوں، شہبِ ثاقب، اور غیر مکمل ستاروں کے اندر سے ہوکر گزر رہے تھے۔ ایک روشن سحاب چاروں طرف سے ہمیں گھیرے ہوئے تھا، جو ہمارے لئے لاتعداد امکانات اپنے اندر رکھتا تھا، ہم ایسا محسوس کررہے تھے کہ ہماری تخلیق کی نوعیت و کیفیت بھی بالکل بدل گئی ہے اور ہماری جسمانی ساخت صرف موسیقی و روشنی سے ہوئی ہے جس کے اندر بجائے روح کے محض مسرت دوڑ رہی ہے۔ ہمیں زمان و مکان کا احساس بالکل باقی نہ رہا تھا گویا ہم اسوقت ایک لازوال "حال" کی دنیا سے گزر رہے تھے۔ میں نے اپنے رفیق سے پوچھا کہ "ہم کہاں ہیں" اس نے جواب دیا کہ "اسوقت ہم ماورائے زمان و مکان رواقِ لانہایت میں ہیں۔ حیزِ الوہیت کے اندر ہیں، فنا کی زنجیریں توڑکر ہم ابدیت کی مملکت میں پہونچ گئے ہیں، ہم اسوقت صرف صداقت کے پرستار ہیں اور "حسنِ بسیط" کا معبد ہماری پرستش گاہ ہے"

میں:۔ "حُسن! حُسن کیا؟"

تماشا:۔ "میں کیونکر تمھیں سمجھاؤں کہ حُسن کیا چیز ہے۔ حُسن، خدا کا غیر مجسم تمثال ہے، عالمِ تخلیق میں خالقِ اکبر کی تصویر ہے، قدرت کی علتِ اولین و غایتِ آخرین ہے، آفتابِ حقیقت کی روشنی ہے، ایک ایسی نظر نہ آسکنے والی چیز ہے

جو "مرئیات" کے ملبوس میں نظر آتی ہے، الغرض وہ سب کچھ وہی ہے جسے انسان نے اسوقت تک نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے"

میں :- "لیکن بعض انسان ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے "حسنِ بسیط" کا مشاہدہ کیا ہے"

تماشا :- "ہاں ایسے لوگ آسمانی مخلوق تھے اور زمین پر صرف ایک سیاح یا زائر کی حیثیت سے آئے تھے"

میں :- "ایسے لوگوں کا مسکن کہاں ہے" —— تماشا :- "اس کائنات کے حدود سے باہر جس سے اسوقت ہم گزر رہے ہیں"

میں :- "اسوقت ہم کہاں سے گزر رہے ہیں" —— تماشا :- "سدیم (Nebulae) سے"

میں :- "کیا اس سے گزرنے کے بعد زندگی کے آثار ہم کو نظر آئیں گے"

تماشا :- "حقیقی زندگی کے آثار تو ان تمام اجرام سماوی کے حدود سے گزرنے کے بعد بھی نظر آسکتے ہیں۔ مگر ٹھیرو ہم اب ایک غیر دریافت شدہ فضا سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک گمشدہ فردوس، ایک لازوال موسیقی، عالم تخلیق کی کائنات اعلیٰ۔ یعنی محبت کا سیارۂ درخشاں!

میں :- "تو کیا یہاں ہم کچھ دیر ٹھیریں گے" —— تماشا :- "ہاں ٹھیریں گے"

میں :- "کیا یہاں کے باشندوں سے ملکر ہم کچھ پوچھ سکیں گے؟ کیا اس نئی دنیا کی کتاب ہدایت کا حال ہمکو معلوم ہو سکے گا"

تماشا :- "ہاں، بشرطیکہ تم اپنی پرانی دنیا کی کتاب ہدایت کو فراموش کر دو اور از سر نو ایک بچہ کی طرح پیدا ہو کر صداقت کی جستجو کرو، یہ تمھاری بالکل نئی زندگی ہوگی اور ایسی مسرور و لطیف کہ تم اپنے ماضی کو بالکل بھول جاؤ گے" میں اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ روشنی کا ایک زبردست سیلاب آیا اور ہم دونوں کو اپنے ساتھ بہالے گیا۔

باب سوم

(سیارۂ محبت)

میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ رنگ و روشنی کے طلسمی منظر نے اسوقت مجھے مبہوت کر رکھا تھا، میں نے پوچھا :-

"اے تماشا ہم کہاں ہیں" اس نے جواب دیا کہ "اسوقت ہم خالق اکبر کے حیز الوہیت میں ہیں"

میں :- "کیا میں یہاں ہمیشہ رہ سکوں گا" —— تماشا :- "تم یہاں رہو گے صرف اسوقت تک کہ یہاں کے مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو جاؤ" —— میں :- "اور تعلیم کون دیگا" —— تماشا :- "معلم اکبر کی روح" —— میں :- "تو کیا اسکے رہنے کی جگہ یہ ہے"

تماشا :- "ہاں یہ اس کی جائے قیام ہے۔ وہ ہر دور میں ایک ستارہ اپنی آزاد روحانی تعلیم کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور

آجکل اس نے اسی ستارہ کو منتخب کیا ہے اور اپنی کائناتی یونیورسٹی (جامعۃ الجامعات) یہیں قایم کی ہے' ارواح سماوی کو یہیں تعلیم دیجاتی ہے اور یہیں سے ان کو اپنا سفیر و نائب بنا کر دور دراز سیاروں اور کُروں میں بھیجتا رہتا ہے''

میں نے دیکھا کہ کچھ اور ہستیاں بھی نہایت تیزی سے اسی سمت میں اُڑتی جارہی ہیں جس طرف ہم جارہے ہیں۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہیں"۔ اس نے جواب دیا کہ "یہ دوسرے سیاروں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ روحیں ہیں جو اس سیارۂ اعلیٰ کی طرف جارہی ہیں اور جامعۃ الجامعات میں داخل ہوں گی"

اب ہم اس سیارہ اعلیٰ کے جوار میں پہونچ گئے جہاں طلبہ کی بیشمار تعداد آسمانی یونیورسٹی میں داخل ہونے کی منتظر تھی دفعتاً ایک نرم و خنک سنہری روشنی سامنے سے نمودار ہوئی، یہ گویا داخلہ کا اذن تھا۔ جس وقت ہم سیارہ اعلیٰ کی اس فضا میں داخل ہوئے تو ایک عجیب قسم کا سماوی لحن ہم نے سُنا جس سے ہمارا اندرونی شعور بیدار ہوگیا اور ہم سمجھنے لگے کہ ہماری آفرینش کا مقصد کیا ہے

موسیقی آہستہ آہستہ ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہوتی جارہی تھی اور میرا دل جذبات محبت سے لبریز تھا، نفرت و عداوت، غصہ و انتقام کا جذبہ بالکل مفقود ہوگیا تھا اور کائنات کی ہر چیز پیاری معلوم ہوتی تھی

میں اسوقت ایک باغ میں تھا اور اس فردوس کے ہر ہر حصہ میں روحیں پھولوں سے نکل نکل کر ہمارا خیر مقدم کررہی تھیں۔ ان روحوں کے آگے ایک اور نورانی ہستی نظر آئی جس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ یہی معلم اکبر کی روح ہو میرا اسوقت یہ جی چاہتا تھا کہ اس کے سامنے گر کر اپنی جان دیدوں لیکن روشنی و جمال کے اس مجسمہ کے حضور میں موت کا گزر نہ تھا۔ وہاں صرف زندگی ہی زندگی تھی۔ ایک نئی زندگی، ایک عجیب قسم کی شیریں و پرسکون زندگی!

اس روح اعلیٰ نے اپنے نئے طلبہ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور ہم سب فردوس کے مرکزی حصہ کی طرف چل پڑے۔ یہاں پہونچ کر ہم سب کو ایک ایک جام میں ابدیت کا آبِ حیات پینے کو دیا گیا اور اس کو پیتے ہی ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے اندر سننے، دیکھنے اور بولنے کی بالکل نئی طاقتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اب ہم ایک نئی زبان میں باتیں کررہے ہیں۔ اس کے بعد ایک روحِ مجرد نے ہم کو اپنا پہلا درس دیا:۔

"اے غیر فانی مسرت کی فضا میں غیر فانی زندگی حاصل کرنے والے بچو۔ تمہارا تعلق عسا کرِ مستقبل سے ہے، تم حیات مطلق کی دنیا کے سپاہی ہو۔ وہ حیات جو یکسر روحانیت و سماویت ہے اور کائناتی زندگی کا مفہوم رکھتی ہے۔ اب تمہاری زندگی صرف روحانی ہوگی اور روحانیت ہی کے لئے تم زندہ رہو گے

خواہ تم مریخ کے رہنے والے ہو یا کرۂ ارض کے، مشتری کے باشندہ ہو یا عطارد کے، اب تم سب ایک ہی کائنات کی مخلوق ہو اور اجرام سماوی کی تفریق کو مٹا کر کائنات کی تمام مخلوق کو ایک ہی رشتہ سے جوڑنا تمہارا فرض ہے"

(باقی)

دفتر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۳۰ء تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائکلوپیڈیا کی ہے قیمت فی جلد تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۲

کمال طاقت
کمال
نوجوانی
کمال
جوانمردی
کمال
حوصلہ
کمال
اُمنگ
کمال

KAMAL * کمال
REGD. رجسٹرڈ

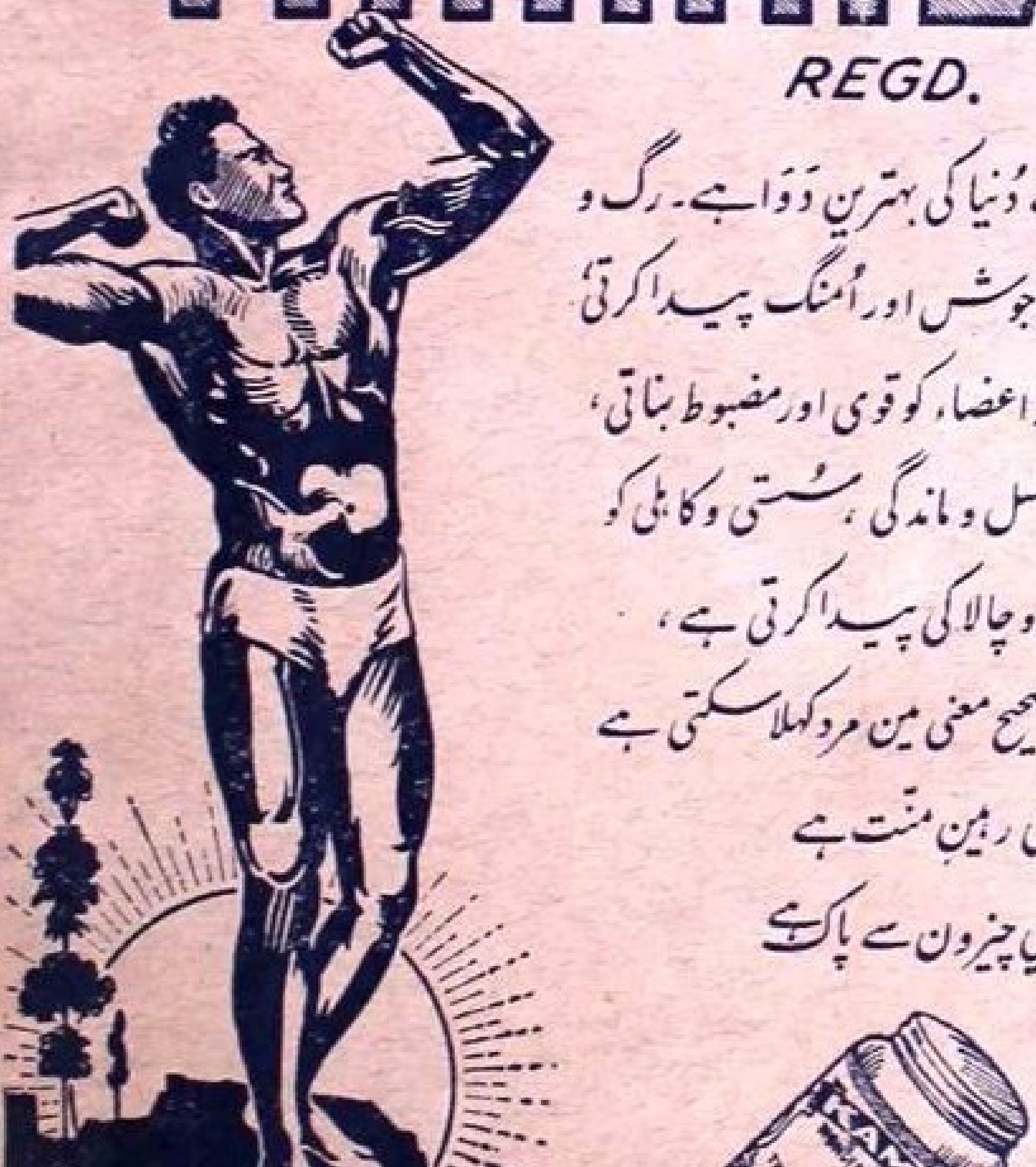

خون کی افزائش کے لئے دُنیا کی بہترین دوا ہے۔ رگ و ریشہ مین خون پہنچا کر جوش اور اُمنگ پیدا کرتی، اعصاب کو تقویت دے کر اعضاء کو قوی اور مضبوط بناتی، دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی، سُستی و کاہلی کو دفع کرکے چُستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،

غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی مین مرد کہلا سکتی ہے وہ "کمال" ہی کی رہینِ منت ہے

نشے والی اور زہریلی چیزون سے پاک ہے

قیمت فی شیشی آٹھ روپے

مزید معلومات کیلئے فہرست طلب کیجئے!

پتہ

طیبی دواخانہ یونانی

چوک بازار، اندور	۶۶، محمد علی روڈ بمبئی ۳
تار کا پتہ: "شاہی" اندور	ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

TRADE MARK
UNANI

پرنٹر لیاقت حسین ہاشمی مینیجر سرفراز پریس، پبلشر شاہد حسین دفتر نگار لکھنؤ